تاریخ ادبیاتِ اُردو

حصّہ اوّل

اُردو نثر

ڈاکٹر ابوسعید نورُالدّین

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور

تاریخ ادبیات اردو

(تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے وسط تک کوئی ساڑھے سات سو سال کے ادبیات اردو — نثر و نظم کا تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر ابو سعید نور الدین

ایم اے پی ایچ۔ ڈی

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

....

سلسلہ مطبوعات: ۱۳۸

1997ء

نام کتاب: تاریخ ادبیات اردو

مصنف: ڈاکٹر ابو سعید نور الدین

ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی
جنرل سیکرٹری

باہتمام: پروفیسر محمد اسلم
سیکرٹری
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی
۹۳۔ این، سمن آباد لاہور

مطبع: ظفر پرنٹرز
شمع پلازہ فیروز پور لاہور

تعداد اشاعت:

صفحات: ۸۰

قیمت: ۳۵۰ روپے

فہرست

تعارف

(ڈاکٹر عندلیب شادانی)

پچھلے پچاس برس کے دوران میں اردو کے نامور ادیبوں' ممتاز شاعروں اور اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والی مختلف تحریکوں کے بارے میں فرداً فرداً بہت کچھ لکھا گیا۔ مقالات بھی اور مستقل کتابیں بھی۔ ان کے علاوہ ادبیات اردو کی چند مختصر تاریخیں بھی وجود میں آئیں۔ لیکن کوئی ایسی مبسوط اور جامع تاریخ نہیں لکھی گئی جو ادب کے تمام گوشوں اور جملہ اہم ادبی تحریکوں پر حاوی ہو اور تفصیل کے جویا کو اس میں سب کچھ مل جائے۔

رام بابو سکسینہ کی کتاب "ہسٹری آف اردو لٹریچر" نسبتاً مفصل ہے' لیکن اب وہ پرانی ہو چکی' اور پچھلی نصف صدی میں ہمارے محققین کی کوششوں سے جو تازہ اطلاعات بہم پہنچی ہیں' وہ قدرتی طور پر اس میں شامل نہیں۔

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر صادق کی کتاب "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" شائع ہوئی۔ نام دیکھ کر تو یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ کتاب اردو ادب کی مکمل تاریخ ہوگی۔ لیکن مطالعے کے بعد پتا چلتا ہے کہ مصنف نے اپنے مختلف مضامین کو جن میں تاریخ ادبیات اردو کے کسی نہ کسی پہلو سے بحث کی گئی ہے' یکجا کرکے' تازہ ترتیب کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ یہ مضامین نہایت کوشش اور کاوش سے لکھے گئے ہیں' اور ان کا مطالعہ تاریخ ادبیات اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یقیناً بہت مفید ثابت ہوگا۔ لیکن ان کے مجموعے کو ادبیات اردو کی جامع تاریخ نہیں کہا جاسکتا۔ الغرض ایک مبسوط اور مکمل "تاریخ ادبیات اردو" کی کمی اور ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ لیکن گوناگوں دشواریوں کی بنا پر اب تک کسی نے اس کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر نور الدین نے' جنہیں اردو سے عشق ہے' مدتوں کی

محنت شاقہ کے بعد ادبیات اردو کی ایک مفصل اور مکمل تاریخ لکھ ڈالی' جو بارہ سو (۱۲۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ "یہ کوتاہیوں اور خامیوں سے یکسر پاک ہے"' انسانی فطرت کو جھٹلانا ہوگا۔ لیکن اگر اس کی خوبیوں کو مد نظر رکھا جائے تو اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ڈاکٹر نور الدین نے "تمتع زہر گوشہ یافتم" کا اصول مد نظر رکھا ہے' اور جہاں جہاں کوئی چیز مفید مطلب نظر آئی اسے وہاں سے اخذ کرلیا۔ کوشش یہ کی ہے کہ اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے "تاریخ ادبیات اردو" کے متعلق جملہ قدیم و جدید اطلاعات کو یکجا کر دیا جائے۔ یہ کتاب بیک وقت تالیف بھی ہے اور تصنیف بھی۔ تالیف بایں معنی کہ جہاں تک تحقیق کا تعلق ہے' انہوں نے دوسرے قابل اعتماد محققین کی تحقیق پر اعتکو کیا ہے' اور ان کی تحقیق کے نتائج کو پورے طور پر سمیٹ لیا ہے۔ اور تصنیف بدیں لحاظ کہ مضامین کی ترتیب' تنظیم اور تنقید ان کی اپنی ہے۔

یہ کتاب تیرھویں صدی عیسوی میں اردو ادب کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے وسط یعنی عصر رواں تک اردو ادب کے جملہ ارتقائی مراحل پر حاوی ہے' اور مبسوط ہونے کے ساتھ ساتھ جامع بھی ہے' اور چونکہ اردو میں لکھی گئی ہے' اس لیے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔ ادبیات اردو کی دوسری تاریخوں سے اس کی ترتیب بھی مختلف ہے' اور میرا خیال ہے کہ اس نئی ترتیب کی بنا پر اردو ادب کے آغاز و ارتقا کی صحیح کیفیت' زیادہ واضح طور پر' قاری کے ذہن نشین ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر نورالدین نے ابواب کی ترتیب میں عہد اور زمانے کے بجائے دبستان اور مرکز کا لحاظ رکھا ہے۔ ادب کے دبستان اور مرکز یکے بعد دیگرے وجود میں آئے اور مٹتے رہے۔ اسی ترتیب سے ان کا ذکر فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس ترتیب سے ادب کے ارتقائی منازل کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

اس کتاب میں ایک اور جدت بھی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ عام روایت کے خلاف' اس میں نثر کی تاریخ کو شعر کی تاریخ پر مقدم رکھا ہے۔ ڈاکٹر نور الدین نے دیباچہ میں اس کی وجہ بھی بتا دی ہے' جو کہ معقول اور قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ یوں بھی اس تقدیم و تاخیر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی کو ان کی رائے سے اتفاق نہ ہو تو وہ نظم کی تاریخ پہلے پڑھ لے۔ کیونکہ نظم اور نثر دونوں کی تاریخ کتاب کے دو جداگانہ اور مستقل حصوں میں لکھی گئی ہے۔

امیر مینائی کو بالعموم دبستان لکھنؤ کا نمائندہ مانا جاتا ہے' لیکن ڈاکٹر نور الدین نے عام روایت کے خلاف انہیں بیک وقت لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں کے پیروں میں شمار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر مینائی لکھنوی ہوتے ہوئے بھی دبستان دہلی سے منسوب کیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ رام پور میں گزارا۔ اس زمانے میں رام پور خود ایک ادبی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا' اور لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں کا سنگم تھا۔ ڈاکٹر نور الدین کے سوا امیر مینائی کو واضح طور پر دبستان دہلی سے منسوب تو کسی نے نہیں کیا' لیکن رام پور کے دوران قیام میں ان کا دہلوی رنگ سے متاثر ہونا دوسروں نے بھی مانا ہے۔ بہرحال' ڈاکٹر نور الدین کو اس پر اصرار نہیں کہ امیر مینائی کو لازمی طور پر دبستان دہلی کا نمائندہ مانا جائے' تاہم اس باب میں ان کی رائے سے اختلاف آسان نہیں۔

ڈاکٹر نور الدین کے متعلق یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ خالص بنگالی ہیں۔ ضلع میمن سنگھ ان کا آبائی وطن اور بنگلہ ان کی مادری زبان ہے۔ ڈھاکا یونی ورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے اقبال اکادمی' کراچی میں کئی سال اقبال پر تحقیق کی اور بالاخر اپنی تحقیق کے نتائج ایک قابل قدر کتاب "اسلامی تصوف اور اقبال" کی شکل میں پیش کیے۔ دانشوروں نے اس کتاب کو جی کھول کر سراہا' اور مجلس ترقی ادب' لاہور نے اسے ۱۹۰۹ء میں شائع ہونے والی اردو کی چند بہترین کتابوں میں شمار کیا' اور مصنف کو نقد انعام سے نوازا' اور کراچی یونی ورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ (پی ایچ۔ ڈی) کی سند عطا کی۔

یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر نور الدین کسی علمی یا تعلیمی ادارے سے وابستہ نہیں' بلکہ ای۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی (مشرقی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن) میں ایک معزز عہدے پر مامور ہیں' جسے علم و ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن ملازمت کی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود وہ اپنے محبوب ادبی مشاغل کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت نکال ہی لیتے ہیں' اور ان کے مضامین و مقالات مختلف موضوعات پر ملک کے ممتاز رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں اردو سے دلچسپی نہیں' عشق ہے' اور اس کا ثبوت ان کی یہ دوسری قیمتی تصنیف "تاریخ ادبیات اردو" ہے۔

ڈاکٹر نور الدین کا اسلوب تحریر نہایت شگفتہ' دلکش اور خوش آئندہ ہے۔ پڑھنے والا ان کی تحریر سے کبھی اکتاتا نہیں۔ ان کی زبان نہایت صاف ستھری' سہل و سادہ' فصیح اور بامحاورہ ہے' اور انہیں نہ جاننے والا کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ تحریر ایک بنگالی کے قلم

سے نکلی ہے۔

ڈاکٹر نور الدین نے تنقید کا ناخوش گوار فرض پوری دیانت داری اور نہایت سلیقہ مندی سے ادا کیا ہے، ان کے مطالعے کا انداز ہمدردانہ ہے، معاندانہ نہیں۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ ہر شخص کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے۔ ان کی تنقید میں نرمی، توازن اور اعتدال نمایاں ہے۔ تلخی کہیں نہیں۔ ان کی بعض رایوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن ان کے حسن نیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا، اگر اسے پس منظر کے طور پر سامنے رکھا جائے، تو مجھے یقین ہے کہ قارئین اس کتاب کی تحسین پر اپنے آپ کو مجبور پائیں گے، اور مجھے بجا طور پر اس بات کا فخر ہوگا کہ ڈاکٹر ابوسعید نور الدین میرے نہایت عزیز شاگرد ہیں۔

عندلیب شادانی

ڈھاکا

۵ مارچ، ۱۹۶۹ء

دیباچہ

پیش نظر کتاب ایک تحریک کے ماتحت بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ لیکن اس کی اشاعت میں بڑی تصویق پیش آئی' جو خلاف توقع تاخیر کا باعث ہوئی۔

تاریخ ادبیات اردو کا برصغیر کی سیاسی تاریخ اور معاشرتی انقلابات سے ہمیشہ گہرا تعلق رہا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں اس کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے وسط تک کوئی ساڑھے سات سو سال کے عرصہ میں اس سرزمین میں چھوٹے بڑے بے شمار سیاسی اور معاشرتی انقلابات آئے' اور لازمی نتائج کے طور پر آبادیوں کی بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی عمل میں آئی۔ ساتھ ساتھ ادبیات اردو کے مراکز بھی بدلتے گئے یا ان کی اہمیتیں بڑھتی رہیں' کیونکہ ان کے ساتھ سرپرستی کا مسئلہ ہمیشہ درپیش رہا ہے۔ انقلابات کی وجہ سے سرپرست اٹھ گئے' تو اجڑے دربار سے پریشان و خستہ حال ادیب اور شاعر بھی مربیوں کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہے۔ اس نقل مکانی سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ برصغیر کے کونے کونے تک اردو کا نفوذ ہوگیا۔ ادبیات اردو سے شغف رکھنے والے اور شعر و شاعری کا چرچا کرنے والے آج کم و بیش ہرجا موجود ہیں۔ اس لیے ادبیات اردو کسی خاص خطہ یا مرکز تک محدود نہیں' بلکہ یہ پورے برصغیر کا مشترکہ اثاثہ ہیں۔

برصغیر میں اب سیاسی طور پر ہندوستان' پاکستان اور بنگلہ دیش کے نام سے تین الگ الگ مملکتیں ہیں' مگر اردو تہذیب کے نام سے ایک ہمہ گیر تہذیب ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ گویا' سیاسی طور پر تین مملکتیں ہیں' جن کی اپنی اپنی جغرافیائی حدود ہیں' لیکن اقلیم اردو ایک ہے' جس کی کوئی حد بندی نہیں ہوسکتی' اور نہ ہی اس پر کسی قسم کی بندش ہے۔ اب تو بیرونی ممالک میں بھی اردو کے اثرات بڑی تیزی سے مرتب ہو رہے ہیں۔ بنابریں' اردو کا ادبی سرمایہ پورے برصغیر' بلکہ انگلستان تک مطبوعات و مخطوطات کی شکل میں پھیلا ہوا ہے۔

لہٰذا' اس موضوع پر قلم اٹھاتے وقت پورے برصغیر کے تناظر میں سیاسی تاریخ اور

تاریخ ادبیات اردو کی ساڑھے سات سو سال کی لمبی مدت کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ لکھنے والے پر اس لحاظ سے بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے' جس سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان کام نہیں' تاہم' دوسروں کی طرح میں نے بھی ہمت کی اور مجوزہ منصوبہ کو پایہ تکمیل کو پہنچایا۔

دراصل اتنے وسیع اور اہم موضوع پر کام کرنے کے لیے ایک باقاعدہ ادارہ چاہیے' مگر اداروں کی جانب سے اس سلسلے میں اب تک جو کوششیں ہوئی' وہ بہت حد تک ناکام رہیں۔ کیونکہ اس نوع کے کام میں جس قریبی ربط کی ضرورت ہوتی ہے' وہ ہمیشہ حسب منشا میسر نہیں ہوتا۔ اس لیے بیشتر اوقات یہ ہوتا ہے کہ کام میں بہت حد تک شترگربگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس کوئی شخص واحد' خواہ کسی ادارہ سے وابستہ ہو کر یا نجی طور پر یہ کام کرے' تو وہ نسبتاً زیادہ مربوط ہو سکتا ہے' لیکن یہ حقیقت ہے' ایسا کام کماحقہ انجام دینے کے لیے اس کے لیے کئی عمریں چاہیں' جو بعید از امکان ہے۔ اس لیے دوسروں کے تحقیقی کاموں سے استفادہ کیے بغیر چارہ نہیں' خواہ وہ کام کسی خاص ادیب یا شاعر پر ہو یا کسی خاص عہد' اسکول' دبستان یا صنف ادب پر ہو۔ اس قسم کے کام اب تک بہت ہوئے ہیں' اور برصغیر کی تمام یونی ورسٹیوں میں مسلسل کام جاری ہے۔ بیشتر اعلیٰ ڈگری کے حصول کی خاطر اور بعض صحیح معنی میں تحقیقی اغراض سے۔

تاریخ ادبیات اردو پر اب تک مختلف ارباب قلم نے اچھی خاصی ضخیم کتابیں لکھی ہیں' جو اپنے اپنے معیار اور نوعیت کے لحاظ سے خوب ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہر ایک کا انداز جدا ہے۔ میں نے بھی اپنے انداز پر یہ کتاب ترتیب دی۔ کام کی وسعت اور اہمیت کے پیش نظر' جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے' تاریخ' تحقیق اور تنقید سب معاملے میں' میں نے قابل اعتماد تحقیقات اور تنقیدی رویوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ البتہ حسب ضرورت جگہ جگہ اپنے خیالات اور رویوں کا اظہار کیا ہے' بالخصوص تبصروں کی شکل میں جو کچھ لکھا ہے' وہ سب ہی اپنے خیالات ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تنقید میں اپنا مسلک میانہ روی اور ہمدردانہ ہے۔ محاسن و معائب دونوں کی طرف نشان دہی کرنے میں اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔

جیسا کہ شروع میں بتا چکا ہوں' کتاب بہت پہلے لکھی جا چکی تھی۔ اس عرصہ میں اردو علم و ادب کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوا۔ بعض بڑے ادیب اور شاعر جن کو اپنا حرف آخر لکھنا باقی تھا' وہ لکھ کر راہی ملک بقا ہوگئے۔ کچھ لکھنے والے لکھتے لکھتے اب پختہ کار ہوئے' اور انھوں نے اپنے اپنے دائرہ عمل میں رہ کر ادبی دنیا میں اپنا اپنا مقام پیدا کیا۔ بعض پرانے

لوگوں کے بارے میں جدید تحقیقات کی رو سے نئے گوشے سامنے آئے۔ کچھ نئے رجحانات بھی پیدا ہوئے، یہ سب عین فطرت کے مطابق ہیں۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے، ہر چیز میں تبدیلی آتی ہے۔ اردو علم و ادب بھی اس تبدیلی سے مستثنیٰ نہیں، لہٰذا ان سب باتوں کا احاطہ کرکے کتاب میں شامل کرنا ضروری تھا۔ مسودہ پر نظرثانی کے وقت میں نے حتی الامکان تصحیح و توضیح کر دی ہے۔

اس کے باوجود، انسان کا کوئی کام خامیوں اور کوتاہیوں سے یکسر پاک نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں بھی خامیاں اور کوتاہیاں رہ سکتی ہیں۔ کتاب اشاعت پذیر ہو تو قارئین کرام اور اصحاب نظر سے قیمتی رایوں اور تعمیری مشوروں کی توقع رکھتا ہوں، تاکہ ان کی روشنی میں اگلے ایڈیشن میں ضروری ترمیمات کرسکوں۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ کچھ لکھنے کی باتیں ہمیشہ باقی رہ جائیں گی، بالخصوص جبکہ موضوع اس قدر وسیع اور اہم ہو۔

تاریخ ادبیات اردو کے لکھنے میں عام دستور یہ رہا ہے کہ نظم کا حصہ پہلے آتا ہے، اور نثر کا بعد میں۔ اس لیے کہ تاریخی طور پر نظم کا آغاز نثر سے پہلے ہوا ہے۔ اس کے علاوہ نثر کو نظم کے مقابلے میں اہمیت بھی ذرا کم دی جاتی ہے۔ اس کتاب میں اس عام دستور کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ نثر کا حصہ پہلے لکھا گیا ہے، اور نظم کا بعد میں۔ میرے نزدیک اس کا جواز صرف یہ ہے کہ بچہ جب ذرا بڑا ہو کر بات کرنے لگتا ہے، تو یکایک شعر کہنے نہیں لگ جاتا، بلکہ وہ جو کچھ بولتا ہے، نثر میں بولتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان جب بات کرتا ہے، نثر میں ہی کرتا ہے۔ الفاظ کا سرمایہ نثر کی شکل میں اس کے پاس موجود ہوتا ہے۔ اگر اس نے موزوں طبیعت پائی ہے، تو ان ہی الفاظ کو وہ شعر کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ اس لیے فطری طور پر نثر کو نظم پر تقدم حاصل ہے۔

اور ایک بات یہ ہے کہ دکن میں، جہاں اردو ادب کی ابتدائی نشوونما ہوئی، وہاں نثر کا آغاز نظم سے پہلے ہوا۔ نظم کو نثر پر جو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، وہ بھی آج کی سائنسی دنیا میں برقرار رہتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ موجودہ زمانہ میں انسان حیات کے جن ٹھوس مسائل سے دوچار ہے، ان کا اظہار صرف نثر ہی میں ہوسکتا ہے، نہ کہ نظم میں۔ اس لیے نثر کی اہمیت نظم کے مقابلے میں زیادہ ہونی چاہیے۔

کتاب میں ابواب کی ترتیب میں امان کی بہ نسبت مکان کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ نثر کے حصے میں باب اول دکن سے متعلق ہے، جس میں اردو نثر کی ابتدائی نشوونما کا ذکر کیا گیا ہے۔ باب دوم میں، شمالی ہند میں اردو نثر کی ابتدا اور ترقی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ کلکتہ میں

انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر میں جو بیش بہا خدمات انجام دیں' ان کے لیے ایک الگ باب قائم کیا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں کے زمانہ میں مغرب کے اثر سے اردو نثر میں نئے رجحانات پیدا ہوئے' اور اس کو زیادہ سائنٹفک اور موافق فطرت بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس دور کو عرف عام میں دور جدید کہا جاتا ہے۔ اس دور کو "اردو نثر میں اصلاحی اقدامات" کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔

اردو میں داستان گوئی کا آغاز اگرچہ زمانہ کے لحاظ سے پہلے ہوا ہے' لیکن اس کتاب میں اسے ناول' ڈراما اور افسانہ کے ساتھ ملا کر ایک مستقل باب میں لکھا گیا ہے۔ اس میں نہ زمان کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے' نہ مکان کا' بلکہ صنف کا خیال کیا گیا ہے۔ یہ چاروں اصناف ادب اگرچہ ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں' لیکن میرے خیال میں ان سب کو ایک زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا' ان سب کا مطالعہ ایک ہی جگہ ہو جائے' تو بہتر رہے گا۔

نظم کے حصہ میں بھی کچھ یہی انداز ہے۔ اس میں سب سے پہلے شمالی ہند میں اردو نظم کا آغاز دکھایا گیا ہے۔ پھر دکن میں اس کی ابتدائی نشوونما کا حال ولی کے زمانے تک دکھایا گیا ہے۔ اس کے بعد ولی کے اثر سے شمالی ہند میں' بالخصوص دہلی میں اردو نظم نے جو ترقی کی' اسے "اردو نظم دلی میں" کے عنوان سے دکھایا گیا ہے' اور دور جدید سے پہلے تک کے شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں' دہلی اسکول کے ماتحت جتنے ممتاز شعرا آسکتے ہیں' شامل کیے گئے ہیں۔ پھر لکھنؤ اسکول کے لیے "اردو نظم لکھنؤ میں" کے عنوان سے ایک مستقل باب رکھا گیا ہے' تاکہ لکھنوی رنگ کے تمام شعرا کا ذکر ایک ہی جگہ آجائے۔

مولانا آزاد' حالی اور اقبال کے زمانہ سے اردو نظم میں نئے نئے کامیاب تجربے کیے جانے لگے' اور پرانی روایات سے ایک قسم کی بغاوت شروع ہوگئی۔ اس کے لیے ایک مستقل باب رکھا گیا ہے۔ اس دور میں آکر اردو کی مرکزی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس میں مختلف علاقوں کے شعرا شامل ہیں۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر میں جو عظیم سیاسی انقلاب آیا' اس کی وجہ سے اردو نظم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اس نئے دور کا عرصہ ابھی تک بہت کم گزرا' اور اس کے خد و خال پورے طور پر نمایاں نہیں ہوئے' لیکن آئندہ چل کر یقیناً یہ ایک نئے موڑ کی شکل اختیار کرلے گا۔ اس لیے تقسیم کے بعد کا دور مختصر طور پر الگ لکھا گیا ہے۔

اس کتاب میں اردو زبان کے مسئلہ پر مطلق بحث نہیں کی گئی۔ یہ موضوع بالکل ایک

جداگانہ حیثیت رکھتا ہے' اور میرے موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے میں نے کتاب کا آغاز اس وقت سے کیا' جب سے ادبیات اردو کے ابتدائی نقوش تحریری شکل میں وجود میں آئے۔

میں نے کتاب میں بالخصوص ان ہی نثر نگاروں اور شعرا کو شامل کیا ہے' جن کا ادبیات اردو کے آغاز و ارتقا میں نمایاں حصہ رہا ہو' اور جن کی وجہ سے مختلف رجحانات وجود میں آئے ہوں' تاہم' اس انتخاب میں کمی بیشی کی گنجائش ہے۔

نثر نگار اور شعرا پر لکھنے کے لیے میں نے اپنے ذہن میں ایک پیمانہ بنا لیا' اور جس پر بھی قلم اٹھایا' بالعموم ان باتوں کا لحاظ رکھا' پہلے سنہ پیدائش سے لے کر سنہ وفات تک مختصر طور پر متعلقہ نثر نگار یا شاعر کے ذاتی حالات ہوں' پھر ادبی زندگی یا شاعری کا ذکر ہو۔ ساتھ ساتھ تصنیفات و تالیفات کیا ہیں' وہ معلوم ہوں۔ اخیر میں ہلکی تنقید اور تبصرہ ہو۔ بڑے ادیب پر ذرا زیادہ لکھا' اور چھوٹے پر کم۔ اس اصول کو میں نے تقریباً تمام جگہ قائم رکھا۔ صرف ایک مقام پر اس کی پابندی نہ ہو سکی۔ وہ مقام حصہ نثر کا باب پنجم ہے۔ اس لیے کہ اس باب میں پہلے داستان پر بحث کی گئی ہے۔ اتفاق سے داستان ایک ایسی صنف ادب ہے' جس کی اہمیت نفس داستان ہی سے ہے۔ اردو داستانوں کی شہرت داستان گویوں سے کہیں زیادہ ہے۔ بہت سی داستانیں ایسی ہیں' جو مشہور تو بہت ہیں' لیکن ان کے مصنفوں کو کوئی جانتا تک نہیں۔ اس لیے میں نے بھی داستان کو زیادہ اہمیت دی' اور داستان گو کا ذکر محض ضمنی طور پر کیا۔

داستان کے علاوہ ناول' ڈراما اور افسانہ بھی ہلکے پھلکے ادب میں شامل ہیں۔ اس لیے ان اصناف پر بحث کرتے وقت مصنفین کے ذاتی حالات کم لکھے گئے۔ اس کے علاوہ آزادی کے بعد کے دور سے تعلق رکھنے والے دیگر نثر نگار اور شعرا کے معاملے میں بھی ذاتی حالات کم لکھے گئے۔

اردو ادب کے ہر مرکز' اسکول اور دبستان کے ادیبوں کی ترتیب بالعموم سنہ وفات کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ اس لیے بعض جگہ بڑی عمر کے ادیب کا ذکر چھوٹی عمر کے ادیب کے بعد ہوا ہے۔ لیکن میں اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ ہر کام کے لیے کوئی نہ کوئی اصول ہونا چاہیے۔ آزادی کے بعد کے دور کے ادیبوں کے بارے میں البتہ بعض موقعوں پر اس اصول کی پابندی نہ ہو سکی۔ کیونکہ کتاب کی ترتیب کے وقت وہ بقید حیات تھے۔ بعض کی وفات بعد میں ہوئی۔ اس لیے ان کی ترتیب جہاں تک ممکن ہو سکا' سنہ پیدائش کی بنا پر

رکھی گئی۔

ایک ہی جلد میں کتاب کے حجم کو معقول حد تک رکھنے کے لیے نمونہ کے طور پر نثر و نظم کے اقتباسات میں نے واجبی ہی پیش کیے ہیں۔ پھر بھی اس امر کا خیال رکھا کہ زیر بحث ادیب کا انداز یا طرز بہ خوبی معلوم ہو سکے۔ طرز نو کا ایک تقاضا ہے، اور بعض مبصرین کا بھی اس پر اصرار ہے کہ کتاب کے اخیر میں انڈکس یا اشاریہ ضرور شامل کیا جائے۔ لیکن میں نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ بڑا سبب تو اس کا یہی ہے کہ کتاب کی ضخامت کہیں معقول حد سے تجاوز نہ کر جائے۔ دیگر یہ کہ خود مجھے اس کی افادیت پر کوئی زیادہ اعتقاد نہیں، کیونکہ کچھ منتخب موضوعات کے علاوہ انڈکس سے عام طور پر لوگ زیادہ رجوع نہیں کرتے۔ بہرحال، انڈکس کے بدلے میں نے مندرجات کی فہرست قدرے تفصیل سے دی۔ امید ہے، قارئین کرام اس کی مدد سے مطلوبہ باتیں بہ آسانی نکال لیں گے۔

میں کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں اپنے استاد بزرگوار ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب کا، جن کا بعد میں انتقال ہو گیا، نہایت شکرگزار ہوں کہ انہوں نے باوجود اپنی عدیم الفرصتی کے ہر وقت میری مدد اور راہنمائی فرمائی۔ صبح ہو یا شام، دن ہو یا رات، میں ان کی خدمت میں کوئی بات دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوتا، تو ہمیشہ خندہ پیشانی سے میری مشکل حل کر دیتے۔ انہوں نے اپنی ذاتی لائبریری سے ضروری کتابیں عنایت فرمائیں۔ بعض کتابیں ڈھاکا یونیورسٹی لائبریری سے اپنے اور رفقائے کار کے ناموں پر جاری کروا کر دیں۔ میں اپنے دفتر سے یونی ورسٹی جا کر نہیں لا سکتا تھا، تو وہ بسااوقات کتابیں گھر لے جاتے، اور میں شام کے وقت جا کر ان سے وہ کتابیں لے آتا۔ شاگرد ہونے کی بنا پر مجھ سے ان کی بے انتہا شفقت اور محبت کے علاوہ یہ ان کی علم دوستی اور ادب نوازی کا ثبوت ہے۔ انہوں نے عمر بھر علم و ادب کی بے لوث خدمت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ "تاریخ ادبیات اردو" پر یہ اہم کام پورا ہو جائے، چنانچہ میں جب بھی شام کو یا چھٹی کے دن دس گیارہ بجے ان سے ملنے جاتا، اور ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر باتیں کر لیتا، تو وہ مشفقانہ لہجے میں کہتے "اب نورالدین، تم بھاگ جاؤ" یا یوں کہتے: "اب تم کو جانا چاہیے" تاکہ میں اپنے قیام گاہ پر جا کر لکھنے کا کام کر سکوں۔

اس کے علاوہ انہوں نے "تعارف" کے عنوان سے ۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو ایک عمدہ مضمون بھی سپرد قلم کیا، جو کتاب کے شروع میں بہ طور تبرک، شامل ہے۔ میرے علم کے مطابق یہی ان کی زندگی کی آخری تحریر ہے۔ اس کے بعد زندگی نے وفا نہ کی۔ کوئی تین ماہ کی علالت کے بعد ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو ڈھاکا میڈیکل کالج ہسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ "سچی کہانیاں کے مصنف اور شاعر کی حیثیت سے میں نے کتاب کے حصہ نثر اور حصہ نظم میں ان پر جو کچھ لکھا' وہ ان کی نظر سے گزرا' اور میرے استفسار پر یہ کہہ کر اپنی تشفی کا اظہار کیا کہ "قلم تمہارے ہاتھ میں ہے' جو چاہو' لکھو!" پھر کہا "مسودہ میری نظر سے گزرا۔ کتاب چھپے گی تو دیکھو گے' اچھے تبصرے آئیں گے۔" مجھے اطمینان ہے کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے اعلیٰ پایہ کے محقق اور سخت گیر نقاد نے کتاب پر اس قسم کی قیمتی رائے کا اظہار کیا۔

برصغیر کے بہت ہی قابلِ احترام اور مشہور محقق و دانشور اور بہت سی مایہ ناز کتابوں کے مصنف جناب ڈاکٹر وحید قریشی کا میں بے حد ممنوں ہوں کہ انہوں نے از غایت عنایت مغربی پاکستان اردو اکیڈمی' لاہور کی جانب سے کتاب کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ ان ہی کی خصوصی توجہ سے میری ناچیز کوششیں منظر عام پر آسکیں۔

اس سلسلے میں جناب ڈاکٹر پروفیسر محمد کلیم سہرامی' شعبہ السنہ راج شاہی یونی ورسٹی' اور مشہور افسانہ نویس جناب شام بارک پوری کا بھی میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس امر کا مسلسل تقاضا جاری رکھا کہ میں کتاب پر نظرثانی کرکے اسے چھپوانے کا انتظام کروں۔ ان ہی کے اصرار پر میں نے یہ کام پورا کیا۔ جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے اگرچہ میری پہلے سے شناسائی تھی' مگر خاص طور پر اس معاملے میں ان سے از سر نو رابطہ ان ہی کی معرفت قائم ہوا۔

ڈھاکا

۱۵۔ ستمبر ۱۹۸۹ء

ابوسعید نور الدین

مقدمہ

اردو نثر کا آغاز شاہان گول کنڈہ اور بیجا پور کی سرپرستی میں سرزمین دکن میں چودھویں صدی عیسوی سے ہوا۔ تاریخی لحاظ سے وہاں کے اولین نثرنگار مشہور بزرگ شیخ عین الدین گنج العلمؒ (م ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء) ہیں۔ انہوں نے قدیم اردو میں چند مختصر رسالے مرتب کئے تھے۔ ان کے بعد خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (م۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء) کا نام آتا ہے۔ ان کو "معراج العاشقین" کا مصنف مانا جاتا ہے۔ دکنی دور میں اور بھی کئی ایک نامور بزرگ گزرے ہیں، جن کے ہاتھوں اردو نثر کی ابتدائی نشوونما ہوئی۔ ان میں شاہ برہان الدین جانمؒ (۱۵۸۲ء) کے بعد، شاہ امین الدین اعلیٰ (م ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء) سید میراں حسینیؒ (م ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳ء) اور ملا وجہی مصنف "سب رس" (سن تصنیف ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان بزرگوں کی نثرنگاری کے نمونے سوائے "سب رس" کے، ادبی تبرک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

شمالی ہند میں پہلے پہل اردو نثر کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ شیخ شرف الدین یحیٰ منیری (م۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء) کو وہاں کا اولین نثرنگار مانا جاتا ہے۔ انہوں نے اردو نثر میں کئی رسالے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کے بعد خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ (م ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء)، فضل علی فضلی مصنف "دہ مجلس" (سن تصنیف ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء)، سودا (م ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) وغیرہ، وہاں کے ابتدائی نثرنگار قرار دیئے جاتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں میر محمد حسین عطا خان تحسین نے بڑی محنت اور جانفشانی سے "نو طرز مرصع" کے نام سے اردو نثر میں ایک کتاب لکھی۔ لیکن اس کی عبارت اس قدر ثقیل، مرصع، پر تکلف اور پیچیدہ ہے کہ اسے قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ انشا نے ۱۸۰۳ء میں "رانی کیتکی کی کہانی" لکھی۔ شمالی ہند میں اردو نثر کی ابتدائی ترقی میں اس کتاب کو نمایاں درجہ حاصل ہے۔ شمالی ہند کے دوسرے نثرنگاروں میں مرزا رجب علی بیگ سرور (م ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء)، مصنف "فسانہ عجائب" امانت لکھنوی (م ۱۸۵۸ء) اور مرزا غالب (م ۱۲۵۸ھ/۱۸۶۹ء) بہت ممتاز ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے رنگ میں اردو نثر میں

اعلیٰ پائے کے نمونے پیش کئے ہیں۔

اردو نثر کی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی خدمات سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی سرکردگی میں اس کالج کے لائق منشیوں نے اردو نثر میں جو کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں' وہ ادبی نکتہ نگاہ سے بہت زیادہ قابل وقعت نہ سہی' لیکن اس سے انکار کی قطعاً گنجائش نہیں کہ جدید اردو نثر کا آغاز یہیں سے ہوا۔ خصوصاً میرامن کی "باغ و بہار" کو تو جدید اردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ میرامن کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں سید حیدر بخش حیدری' میر شیر علی افسوس' میر بہادر علی حسینی' مرزا علی لطف' مولوی امانت اللہ' مظہر علی خان ولا' مرزا کاظم علی جوان' مولوی اکرام علی' نہال چند لاہوری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کی متحدہ کوششوں سے ایک آسان' سہل اور قابل فہم لٹریچر وجود میں آ گیا۔ کلکتہ میں یہ کام ۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۸۲۰ء تک بیس سال جاری رہا۔ اس عرصہ میں کوئی اٹھارہ منشیوں نے چھوٹی بڑی ملا کر تقریباً پچاس ساٹھ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں' جو مختلف موضوعات مثلاً فسانہ' تذکرہ' تاریخ' اخلاق' فقہ اسلام' ترجمہ قرآن مجید اور صرف و نحو پر مشتمل ہیں۔ ان کتابوں نے لوگوں کے مذاق کو ہموار کرنے اور ان کی پرانی ذہنیت کو بدلنے میں بڑا کام کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے برصغیر میں زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب رونما ہونے لگا۔ اردو نثر پر بھی انقلابی اثرات مرتب ہونے لگے۔ اس سے پہلے مرزا غالب کے خطوط اور فورٹ ولیم کالج کی خدمات کی بدولت اردو نثر کی زمین بہت ہموار ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید اور ان کے رفقائے کار نے شعوری طور پر اردو نثر کی اصلاح اور ترقی کے لئے اقدامات کئے۔ سرسید کا دور اردو نثر کی تاریخ میں عہد زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دور کوئی سو سال تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سرسید کے علاوہ مولانا آزاد' مولوی نذیر احمد' مولانا حالی اور مولانا شبلی نے اردو نثر کی ترقی میں اس قدر مستعدی اور اولوالعزمی کے ساتھ حصہ لیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کو دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ادب کے ہمسر کر دیا۔ یہ لوگ اردو ادب کے بہت بڑے محسن ہیں۔ ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی بدولت اردو ادب میں وسعت' ہمہ گیری اور لچک پیدا ہوئی اور تمام موضوعات پر لکھنے کے لئے اس میں صلاحیت پیدا ہوئی۔

سرسید' آزاد' نذیر احمد' حالی اور شبلی سب الگ الگ طرز کے مالک ہیں۔ ان میں سے سرسید اور حالی کے طرز' ذرا سے فرق کے ساتھ مماثل ہیں۔ دونوں کے طرز تحریر کی بنیادی خصوصیت سادگی' سلاست اور روانی ہے۔ ان کی نثر میں ان کے دوسرے ساتھیوں کی نثر کے مقابلے میں شگفتگی ذرا کم پائی جاتی ہے۔ تاہم بدمزگی کہیں پیدا نہیں ہونے پائی۔ سرسید قومی راہنما

تھے۔ ان کے پاس وقت بہت کم تھا اور کام بہت زیادہ۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے' بقول بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق' انہیں اسے دوبارہ دیکھنے کی کبھی فرصت نہ ہوتی تھی۔ جو کچھ بھی لکھنا ہوتا تھا' قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ اس لئے وہ قدرتی طور پر سادہ' سلیس اور رواں عبارت لکھنے پر ایک لحاظ سے مجبور تھے' لیکن مولانا حالی کی سادگی اور سلاست میں ان کی طبیعت کی افتاد اور شرافت کو بڑا دخل تھا۔ انہوں نے قدرت سے سادگی پسند طبیعت پائی تھی۔ اس لئے نثر ہو یا نظم ہر موقع پر انہوں نے سادگی پر بہت زور دیا۔ انہوں نے اسے "نیچرل" سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے خیال میں عبارت میں تصنع اور تکلف "ان نیچرل" ہے۔

مولانا آزاد کے نزدیک ادب کا نظریہ مختلف ہے۔ وہ عبارت کو رنگینی اور دلفریبی سے ہمکنار رکھنے کے قائل ہیں۔ وہ افسانوی رنگ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ٹھوس مسائل پر قلم اٹھائیں' تو بھی اپنی طبیعت کی رنگینی سے کام لے کر ان میں بہار دکھلانے میں وہ مصروف کار نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں حقیقت اور افسانے میں کوئی بین فرق نہیں ہے۔ وہ کسی قیمت پر بھی عبارت میں دلکشی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اردو نثر کی تاریخ میں ان کی اہمیت اصل میں اسی طرز کی وجہ سے ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد بنیادی طور پر ایک ناول نگار ہیں۔ ان کا طرز "عوامی" ہے۔ لیکن وہ اپنے اس طرز خاص پر اس قدر نازاں ہیں کہ دوسرے سنجیدہ مضامین کے لئے بھی وہ اسے روا رکھتے ہیں' جس کا نتیجہ بہت برا ہوا۔ ان کی کتاب "امہات الامہ" کو لوگوں نے ان کی آنکھوں کے سامنے ہی نذر آتش کیا۔

مولانا شبلی بہت بڑے عالم دین تھے۔ ان کے طرز تحریر میں سادگی اور سلاست کے ساتھ ہر جگہ عالمانہ شان نمایاں ہے۔ لیکن ان کی عبارت کبھی روکھی پھیکی نہ ہونے پاتی۔ ان کی عبارت میں دلکشی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ سرسید' آزاد' نذیر احمد اور حالی سب سے جداگانہ طرز کے مالک ہیں۔ وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے۔ اپنی دنیا کے آپ مالک ہیں۔ وہ ابتدا میں سرسید کے چشمہ فیض سے سیراب ضرور ہوئے ہیں' لیکن ذرا آگے چل کر انہوں نے اپنا جادہ الگ نکالا۔ حالی کی طرح وہ سرسید کی شخصیت میں مدغم ہو کر نہیں رہ گئے۔ ان کی یہی انفرادیت ہے' جس نے ان کو دنیائے ادب میں زیادہ چمکایا۔

دور حاضر میں مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا ابوالکلام آزاد' ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور مولانا عبدالماجد دریا بادی وغیرہ بلند پایہ نثر نگار ہیں۔ ان میں سے مولانا سید سلیمان ندوی مولانا شبلی کے شاگرد ہیں اور اپنی تحریر میں اپنے استاد کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض باتوں میں وہ اپنے

استاد سے سبقت لے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ استاد کا نام پہلے پیش کرتے ہیں اور اپنا نام بعد میں، اس طرح اپنی زلہ خواری کا اعتراف کر کے اپنی سعادت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔ تاہم دنیا جانتی ہے کہ شاگرد کا مرتبہ استاد سے بڑھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہر لحاظ سے سرسید اور حالی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سرسید اور حالی سے عقیدت کس کو نہیں ہے، لیکن جو عقیدت مولوی عبدالحق کو تھی، وہ کسی کو نہیں ہے۔ ان کی یہ والہانہ عقیدت ان کے طرز تحریر میں بھی نمایاں ہے۔ ان کا طرز تحریر سرسید اور حالی سے بہت مشابہ ہے۔ مولانا حالی کی سادگی کا معیار یہ تھا کہ عبارت لفظاً" و معناً" "نیچرل" ہو۔ مولوی عبدالحق کی سادگی کا معیار یہ تھا کہ "زبان ایسی ہو کہ گھر کا بامن بھی اسے آسانی سے سمجھ سکے۔" ہر موضوع کے لیے ایسا طرز تحریر اختیار کرنا کہ "گھر کے بامن" کی سمجھ میں بھی آ جائے، ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ان ہی جیسے عالی مرتبت اور عالی ظرف اہل قلم کا کام ہے۔ آسان لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بابائے اردو کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جس موضوع پر بھی لکھا ہے، اس کو پانی کی طرح بہا دیا۔ سرسید اور حالی بھی اسی قسم کا طرز تحریر پسند کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت سب سے جداگانہ ہے۔ وہ اپنی عربی دانی اور تبحر علمی کی بدولت اردو نثر کی تاریخ میں اس مقام پر پہنچے ہوئے ہیں، جہاں فرشتہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ انسان کا کیا گزر ہو گا۔ ان کو عربی پر اس قدر قدرت حاصل تھی کہ الفاظ ان کے ہاتھ میں موم کی طرح پگھلتے تھے اور جس طرح وہ چاہتے تھے اسی طرح صورت پذیر ہو جاتے تھے۔ لیکن اردو میں آ کر بے جوڑ کہیں نہیں معلوم ہوتے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے فلسفیانہ مضامین اور اپنے مخصوص طرز کی وجہ سے اردو میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

اردو کے نثری ادب کا ایک بہت بڑا سرمایہ داستانوں، ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کی شکل میں موجود ہے۔ یہ چاروں اصناف ادب اپنی اپنی خصوصیات کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ لیکن ان کے درمیاں آپس میں ایک رشتہ ڈھونڈ لینا کوئی مشکل نہیں۔ داستان ہو یا ناول، ڈراما ہو یا افسانہ سب میں ایک بات مشترک یہ ہے کہ ان کا افادی پہلو تفریح طبع ہے۔

ان اصناف ادب میں داستان سب سے قدیم صنف ہے، جو انیسویں صدی عیسوی میں وجود میں آئی۔ ناول کا آغاز مولوی نذیر احمد سے ہوا۔ ان کے بعد دوسرے ناول نویسوں نے اس کو خاطر خواہ ترقی دی۔ اردو میں ڈراما کی صنف زیادہ ترقی نہ پا سکی۔ پھر بھی اب تک اس صنف کا

جو کچھ سرمایہ فراہم ہو گیا' وہ توجہ کے قابل ہے- افسانہ بہت بعد کی پیداوار ہے- اردو میں یہ صنف بہت زیادہ مقبول ہوئی- اس پر لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے- دور حاضر میں یہ بہت عروج پر ہے-

تاریخ ادب اردو میں اردو نظم کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے- شعر کہنا بہت قابل فخربات ہے- صاحب ذوق کہلانے کے لئے شعرگوئی نہ سہی' شعر فہمی اشد ضروری ہے- اس اہمیت کے پیش نظر نثر کی بہ نسبت نظم پر زیادہ زور دیا گیا- شعراء کی تعداد نثرنگاروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے- اردو نظم کا آغاز تاریخی لحاظ سے شمالی ہند سے ہوا اور جدید تحقیقات کی رو سے اردو کے اولین شاعر مشہور صوفی بزرگ شیخ فرید الدین شکر گنجؒ (۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء) ہیں- آپ کی بعض اردو نظمیں دستیاب ہوئی ہیں- آپ کے بعد شمالی ہند میں دوسرے اردو شاعر امیر خسروؒ (م ۷۲۵ھ /۱۳۲۵ء) ہیں- آپ اصل میں فارسی کے شاعر تھے- لیکن بعض اردو کلام بھی آپ سے منسوب ہے-

لیکن شمالی ہند میں اردو نظم کا یہ آغاز صرف آغاز ہی تھا- وہاں اسے خاطر خواہ سرپرستی نہ مل سکی- اس لئے اس کی ابتدائی نشوونما جنوبی ہند میں ہوئی- خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (م ۸۲۵ھ /۱۴۲۲ء) وہاں کے اولین شاعر ہیں' جن کے اردو کلام کا نمونہ ملتا ہے- آپ کے بعد شاہان گول گنڈہ اور بیجاپور کی سرپرستی میں ولی دکنی (م ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) کے زمانے تک دکن میں اردو کے بکثرت شاعر پیدا ہوئے' جن میں صوفی اور غیر صوفی دونوں قسم کے لوگ ہیں- وہاں کے کئی بادشاہ بھی بلند پایہ شاعر گزرے ہیں' جن میں محمد قلی قطب شاہ سب سے زیادہ مشہور ہیں- ان کا کلیات بارہ سو صفحوں پر مشتمل ہے- اس میں اردو اشعار کی تعداد پچاس ہزار ہے- دکن کے شعراء نے اردو نظم کی ابتدائی نشوونما میں بڑا اہم کردار ادا کیا- ان شعراء میں ولی دکنی کا مقام سب سے اونچا ہے- اردو نظم نے کئی مراحل طے کرنے کے بعد ان کے ہاں آکر ترقی یافتہ شکل اختیار کی- شمالی ہند خصوصاً دہلی میں دوبارہ اردو نظم کا رواج ان ہی کی بدولت ہوا- ان کی کلیات تاریخ ادب اردو میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے-

شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں ولی کے اثرات سے پہلے کچھ فارسی کے شاعر ایسے تھے' جو محض تفنن طبع کی خاطر کبھی کبھی اردو میں دوچار شعر کہہ لیا کرتے تھے- ان میں سعدی کاکوروی (۱۰۰۲ھ/۱۰۹۳ء)' افضل جھنجانوی (م ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء)' برہمن (۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۲ء)' ولی رام (م ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء)' قزلباش خان امیر (۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء) اور انجام (م ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں- اس دور کے بعض شعراء تو اس وقت بھی زندہ تھے' جب ولی کے

اثرات شمالی ہند پر مرتب ہو رہے تھے' لیکن ان لوگوں نے بظاہر ان سے کوئی خط نہیں اٹھایا۔ شمالی ہند میں اردو نظم کا یہ پہلا دور ہے۔ دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے' جب وہاں ولی کے اثرات بڑھنے لگتے ہیں۔ ولی نے ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں دہلی کا سفر کیا۔ اس کے بعد ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں ان کا مکمل دیوان وہاں پہنچا۔ اس سے وہاں جو لوگ اب تک فارسی میں شعر کہتے تھے' وہ بہت متاثر ہوئے۔ ان کو پتہ چلا کہ اردو میں بھی ایسی صلاحیت موجود ہے کہ اس میں اعلیٰ خیالات ادا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اردو شعر گوئی کی طرف توجہ کی۔ لیکن ان میں ایک چیز جو شاعری کی ترقی میں ایک قسم کی رکاوٹ ثابت ہوئی' رواج پا گئی۔ وہ ہے ایہام گوئی۔ ان شعراء کو بعض وجوہ کی بنا پر غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ شاعری میں کمال کا معیار صنعت ایہام کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہے۔ اس دور کے شعراء میں فائز (م ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء)' مضمون (م ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء) آبرو (م ۱۱۶۱ھ/۱۷۳۸ء) آرزو (۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء) حاتم (م ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء) اور یک رنگ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ شمالی ہند میں اردو نظم کے اس دور کو دور ولی کہنا چاہئے۔

اس دور کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے' وہ اردو ادب کی تاریخ میں "عہد زریں" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مرزا مظہر (م ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء) جیسے مصلح زبان' سودا (م ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) جیسے قصیدہ گو' درد (م ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء) جیسے صوفی شاعر' میر حسن (م ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء) جیسے مثنوی نگار) اور میر (م ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) جیسے غزل گو پیدا ہوئے۔ یہ وہ بزرگان ادب ہیں' جنہوں نے اردو نظم کی اصلاح' ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ یہ لوگ آسمان ادب پر درخشندہ تارے بن کر چمکے اور دنیائے علم و ادب کو منور کرتے رہے۔ ان کی بدولت اردو نظم میں ایک خاص رنگ پیدا ہوا۔ جسے عرف عام میں "دہلویت" کہتے ہیں۔ سنجیدگی' شرافت' لطافت' پاکیزگی' اعلیٰ تخیل' معنویت' اختصار' جذبات اور واردات قلبی کی عکاسی وغیرہ دہلوی شاعری کی خاص خصوصیات ہیں۔

دور سوم کے بعد شاعری کا مرکز دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو جاتا ہے۔ دہلی میں کچھ دن خاموشی رہتی ہے۔ وہاں اردو شاعری کا چرچا دوبارہ اس وقت زور و شور سے ہونے لگتا ہے جب شاہ نصیر (م ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء)' مومن (م ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء)' ذوق (م ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء)' نسیم (م ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء)' غالب (م ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء) اور شیفتہ (۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء) وغیرہ میدان میں آئے۔ ان میں سے ہر ایک نے' اپنا الگ الگ رنگ جمایا۔ دہلویت میں جن خصوصیات کا نام ہے' شاہ نصیر نے ان سے اعراض کیا اور لکھنویت کو اپنایا۔ اس لئے ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ "شاہ نصیر تو دلی کے شیخ ناسخ ہیں۔" ذوق بھی اپنے وقت کے استاد تھے۔ انہوں نے غزل اور قصیدے دونوں

میں کمال حاصل کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ سودا کے بعد قصیدہ گوئی میں ذوق ہی کا نمبر ہے۔ نسیم پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے لیکن طبیعت میں لاابالی پن رہنے کی وجہ سے کلام محفوظ نہ رکھ سکے۔ مرزا غالب کو بھی ان کا کلام پسند تھا۔

اردو شعراء میں سے اگر معدودے چند سربر آوردہ اور عالمگیر شہرت حاصل کرنے والوں کا انتخاب کیا جائے تو غالب کا نام اس میں سرفہرست شامل ہو گا۔ وہ اپنے انداز' لب و لہجہ اور طرز تکلم کی وجہ سے اس قدر معروف ہیں کہ ان کی آواز کو پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ اردو میں بہت سے شاعر ایسے ہیں' جو انفرادیت کے مالک ہیں لیکن غالب کی انفرادیت کی طرح نمایاں انفرادیت بہت کم لوگوں کو حاصل ہوئی ہے۔ غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر کی بدولت اردو ادب کا مقام بہت بلند ہوا ہے۔

شیفتہ کے اشعار اگرچہ بہت اعلیٰ درجے کے نہیں ہیں' لیکن ان میں اخلاق و تصوف کے مضامین اور پاکیزہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ ان کی زبان صاف' سادہ اور دلکش ہے۔ اس دور کے شروع میں نظیر اکبر آبادی ایک انوکھی شخصیت کے شاعر گزرے ہیں۔ یہ اپنے مخصوص رنگ کی وجہ سے دبستان دہلی کے کسی دور میں شامل نہیں کئے جا سکتے۔ ان کو ایک لحاظ سے مولانا آزاد اور حالی کے پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ دور جدید میں اردو نظم میں قدرتی مناظر اور نیچرل انداز پر جو زور دیا گیا ہے' اس کا ابتدائی نمونہ نظیر اکبر آبادی کے ہاں پایا جاتا ہے۔

دبستان دہلی کا آخری دور وہ ہے' جبکہ شاعری کی مرکزیت ختم ہو گئی تھی۔ اس دور کے بڑے شعراء میں امیر مینائی (م ۱۹۰۰ء) اور داغ دہلوی (م ۱۹۰۵ء) ہیں۔ ان میں امیر مینائی اصل میں لکھنوی شاعر تھے لیکن بعد میں دربار رام پور سے وابستہ ہو گئے تھے' جہاں دوسرے دہلوی شعراء جمع تھے۔ دہلوی شعراء کے اثر سے ان کے کلام میں بھی بہت حد تک دہلویت پیدا ہو گئی اور اسی بنا پر انہیں دہلوی شعراء کے ساتھ شامل کیا گیا ہے ورنہ بعض لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ ان کو دبستان لکھنؤ کے شعراء میں شامل کرنا چاہیے۔

دلی اجڑ گئی' تو داغ بھی رام پور پہنچے اور دربار سے وابستہ ہوئے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی زبان و بیان میں ایک خاص قسم کی شوخی و بانکپن ہے۔ انہوں نے جرات کی معاملہ بندی کو آتش کی صفائی اور زبان و بیان کی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ سمو دیا۔ اس سے ان کے کلام میں وہ بات پیدا ہو گئی جو "داغ کا طرز خاص" کہلاتا ہے۔ وہ دہلوی شاعر ہیں لیکن جو داخلیت اور معنویت دہلویت کا خاصہ ہے' وہ ان کے ہاں برائے نام ہے۔

دہلی اسکول کے مقابلے میں لکھنؤ اسکول وجود میں آیا جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر ادبی

دنیا میں بہت بدنام بھی ہے اور بعض باتوں کی وجہ سے نیک نام بھی۔ بدنام اس لئے کہ لکھنوی شعراء نے خارجیت پر اس قدر زور دیا کہ شعر کی معنوی خوبیاں بالکل او جھل ہو کر رہ گئیں۔ حسن و عشق کے بیان میں معشوق کے خارجی اوصاف و لوازم مثلاً زلف و کاکل، خد و خال، انگیا کرتی، کنگھی چوٹی، مسی آرسی، محرم، دوپٹہ نقاب وغیرہ کا ذکر لکھنوی شاعری میں اس کثرت کے ساتھ آیا ہے کہ تغزل کا لطف بالکل جاتا رہا۔ زنانہ پن، رعایت لفظی، ابتذال، قافیہ پیمائی، عربی فارسی کی بے جوڑ تراکیب کا استعمال، مسلسل گوئی کی کوشش، مرصع و رنگین بندشوں کا التزام، استعارات اور تشبیہات کی نزاکت اور پیچیدگی پیدا کرنے کی خواہش، وغیرہ لکھنوی شاعری کی عام خصوصیات ہیں۔ نیک نام اس لحاظ سے کہ لکھنوی شعراء نے زبان کی صفائی، درستی اور ترقی میں بہت زیادہ حصہ لیا ہے۔ مرثیہ جیسی صنف سخن کو اس اسکول کے ماتحت بڑا فروغ حاصل ہوا۔ نعت گوئی بھی وہیں درجہ کمال کو پہنچی۔

لکھنؤ میں شعر و سخن کا چرچا اصل میں ان مہاجر شعرا سے ہوا تھا، جو گردش روزگار سے دہلی سے وہاں جا کر پناہ گزین ہوئے تھے۔ آرزو، سودا، میر حسن، میر سوز، میر تقی میر اور نسیم دہلوی وغیرہ لکھنؤ گئے اور شعر و شاعری کا چراغ روشن کیا۔ لکھنؤ کی فضا بالکل مختلف تھی۔ وہاں عیش و عشرت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ ہنسنے ہنسانے کے اسباب ہر جگہ موجود تھے۔ رونے بسورنے کا سامان مفقود تھا۔ لیکن یہ دہلوی شعراء بڑے کٹر قسم کے تھے۔ انہیں اپنی دہلویت اس قدر عزیز تھی کہ اسے وہ مرتے دم تک نہ چھوڑ سکے۔ مگر بعض دہلوی شعراء ایسے بھی تھے جو فطرتاً رنگین مزاج تھے۔ ان میں زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بدل ڈالنے کی صلاحیت موجود تھی۔ وہ لکھنؤ کی نئی فضا سے متاثر ہوئے اور دہلی کی دکھ درد کی زندگی کو فراموش کر کے طرب و نشاط کی دنیا میں کھو گئے۔ ان شعراء میں حسرت (م ۱۷۹۵ء)، جرات (م ۱۸۱۰ء)، انشا (م ۱۸۱۷ء)، رنگین (م ۱۸۳۵ء) اور مصحفی (م ۱۸۴۸ء) زیادہ مشہور ہیں۔ حسرت کا رنگ دہلویت سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔ لکھنویت کے ابتدائی نقوش ہمیں ان ہی کے ہاں ملتے ہیں، جو آگے چل کر ان کے شاگرد رشید جرات کے ہاں زیادہ آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوئے۔ جرات کی معاملہ بندی اس رنگ کی معراج ہے۔ انشا اور مصحفی کے معرکے کس کو معلوم نہیں۔ یہ دونوں قادر الکلام شاعر ایک دوسرے کی ذاتیات میں اس قدر الجھ گئے اور دونوں نے وہ کیچڑ اچھالا کہ ہماری تہذیب و شائستگی کے ماتھے پر یہ واقعہ ایک بدنما داغ بن کر رہ گیا۔ وہ اگر یہ معرکہ آرائی نہ کرتے تو بہتر تھا۔ تاریخ ادب اردو میں رنگین کو ریختی کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک لحاظ سے وہی اس صنف کے موجد بھی ہیں، جس کو بعد میں یار علی جان نے درجہ کمال تک پہنچایا۔

دبستان لکھنؤ کے تین دور ہیں- حسرت' جرات' انشا اور مصحفی کے زمانے کو دور اول سمجھنا چاہئے- اصل میں لکھنؤیت کو معراج کمال دور دوم میں حاصل ہوئی- یہ ناسخ اور آتش کا دور ہے- ناسخ اور آتش کے بھی دو الگ الگ اسکول ہیں- ناسخ کا رنگ ہی حقیقی معنوں میں "لکھنؤیت" ہے- آتش کے ہاں یہ رنگ قدرے ہلکا ہے- اس لئے مورخین اور نقادان ادب ناسخ کی بہ نسبت آتش کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ان پر ذرا ہمدردی کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں-

دبستان لکھنؤ کا تیسرا دور زمانے کے لحاظ سے نہیں' بلکہ صنف کے لحاظ سے مرثیہ نگاری اور نعت گوئی کا ہے- مرثیہ نگاری میں میر انیس (م ۱۸۷۴ء) اور مرزا دبیر (م ۱۸۷۵ء) نے وہ کمال حاصل کیا کہ گویا یہ صنف سخن مدتوں سے ان ہی دو صاحبان کمال کی منتظر تھی- مرثیہ سے ملتی جلتی اور ایک صنف نعت ہے' جس کی طرف محسن کاکوروی (م ۱۹۰۵ء) سے پہلے کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں کی- محسن نے نعت گوئی کو اپنی زندگی کا شعار بنایا اور اس میں ادبی شان پیدا کی- اس صنف کو درجہ کمال تک پہنچانا ان ہی کا کام تھا- قصر ادب کے بڑے بڑے معماروں میں سے وہ بھی ایک عظیم المرتبت معمار ہیں-

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر میں جو انقلاب برپا ہوا اور اس انقلاب کے لازمی نتیجے کے طور پر' زندگی میں جو انتشار پیدا ہوا اس سے اردو نظم کی مرکزیت ختم ہو گئی- سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ دبستان دہلی کا شیرازہ پاش پاش ہوا تو اودھ کے الحاق سے لکھنؤ اسکول کی محفلیں بھی برخاست ہو گئیں- زندگی میں ایک اضمحلال پیدا ہو گیا اور اس پر افسردگی چھا گئی- شعر و سخن کے دلدادگان کو دل جمعی حاصل کرنے کے لئے ذرا وقت لگا- آخر ۱۸۷۴ء میں مولانا آزاد اور مولانا حالی نے لاہور میں شعر و شاعری کا چراغ پھر سے روشن کیا لیکن اس کا رنگ بدلا ہوا تھا- اس میں دیسی رنگ کے علاوہ بدیسی رنگ کی بھی آمیزش تھی-

اردو نظم کی تاریخ میں دور جدید کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے- اس دور میں مولانا آزاد (م ۱۹۱۰ء) اور مولانا حالی (م ۱۹۱۴ء) کے علاوہ اسماعیل میرٹھی (م ۱۹۱۷ء)' اکبر الہ آبادی (م ۱۹۲۱ء)' چکبست (م ۱۹۲۶ء)' شاد عظیم آبادی (م ۱۹۲۷ء)' نظم طباطبائی (م ۱۹۳۳ء)' ریاض خیر آبادی (م ۱۹۳۴ء)' اصغر گونڈوی (م ۱۹۳۶ء)' اقبال (م ۱۹۳۸ء) اور فانی (م ۱۹۴۱ء) بہت زیادہ مشہور ہیں- ان کا رنگ و آہنگ جدید ہے' نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق انہوں نے اپنے کلام میں کچھ نئی باتیں شامل کیں- ان میں سے اکبر الہ آبادی کا' پھر اقبال کا مقام بہت اونچا ہے- پرانی قدروں سے محبت اور نئی قدروں سے بیزاری اکبر کے کلام کی واحد خصوصیت ہے- اسی بنا پر انہوں نے طنز و ظرافت کا پیرایہ اختیار کیا- طنز و ظرافت ہی اکبر کو حیات دوام عطا کرنے کی

ضامن ہوئی۔ اقبال نے مقصدی ادب پیدا کر کے اپنے لئے تاریخ ادب اردو میں ایک ایسی جگہ متعین کر لی جو اور کوئی حاصل نہ کر سکا۔ ان کے کلام میں گل و بلبل کی پرانی کہانیاں اور حسن و عشق کی پامال داستانیں نہیں ہیں بلکہ حیات کے وہ راز ہائے سربستہ اور عشق حقیقی کے وہ رموز لانیحل بیان ہوئے ہیں' جو اب تک فارسی شاعری میں رومی' حافظ اور سعدی وغیرہ تک محدود تھے اور جن سے اردو شاعری بہت حد تک نا آشنا تھی۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر کی تقسیم وجود میں آئی اور پاکستان اور ہندوستان کے نام سے دو الگ الگ مملکتیں قائم ہوئیں تو اردو نظم میں بعض نئے رجحانات پیدا ہونے کے آثار نظر آنے لگے۔ اس دور کے شعراء میں اختر شیرانی (م ۱۹۴۸ء)' آرزو لکھنوی (م ۱۹۵۱ء)' حسرت موہانی (م ۱۹۵۱ء)' سیماب اکبر آبادی (م ۱۹۵۱ء)' یاس یگانہ (م ۱۹۵۶ء)' مجاز (م ۱۹۵۵ء)' وحشت (م ۱۹۵۶ء)' جگر (م ۱۹۶۰ء)' امجد حیدر آبادی (م ۱۹۶۱ء)' عندلیب شادانی (م ۱۹۶۹ء)' جوش ملیح آبادی (م ۱۹۸۲ء)' فراق (پیدائش ۱۸۹۶ء)' حفیظ جالندھری (پیدائش ۱۹۰۰ء) اور فیض احمد فیض (م ۱۹۸۴ء) زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے تقریباً سب ہی چوٹی کے شاعر ہیں اور اپنے اپنے طرز میں انفرادیت کے مالک ہیں۔ بعض کا تعلق ہندوستان سے ہے اور بعض کا پاکستان کے شہروں لاہور اور کراچی سے اور بعض کا بنگلہ دیش کے شہر ڈھاکہ سے ہے۔

تاریخ ادبیات اردو

حصہ اول

اردو نثر

باب اول

اردو نثر کا آغاز اور اس کی ابتدائی نشوونما

تمہید

یہ امر مسلم ہے کہ اردو زبان شمالی ہند میں دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول اور اختلاط و ارتباط سے وقتی ضروریات کے تحت رفتہ رفتہ وجود میں آئی۔ فطرت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اردو جہاں پیدا ہوئی۔ وہیں اس کی نشوونما بھی ہوتی اور وہیں سے اس کے ادبی سرمائے کا آغاز ہوتا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا بلکہ اردو ادب کا اولین گہوارہ شمالی ہند کی بجائے جنوبی ہند قرار پایا۔ اردو نثری ادب کے اولین نمونے ہمیں وہیں دستیاب ہوتے ہیں۔

جنوبی ہند میں کئی ایک خاندان سلاطین یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے، جن میں بہمنی خاندان، عادل شاہی خاندان، قطب شاہی خاندان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اردو ادب کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ ان تمام خاندانوں نے اس کی سرپرستی کی، جس کی بدولت سرزمین دکن ہی کو اردو ادب کا اولین گہوارہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اگلے صفحات میں ہم اس چیز کا مطالعہ کریں گے کہ اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء کیسے ہوا۔

(الف) بہمنی دور (گلبرگہ اور بیدر) (۱۳۵۰ء تا ۱۵۲۵ء)

شیخ عین الدین گنج العلمؒ

جنوبی ہند میں اردو نثر کی ابتدائی نگارشات ہمیں بہمنی عہد سے ملتی ہیں۔ یہ خاندان ہمیشہ علم و ادب کا بڑا سرپرست رہا۔ اب تک جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دکن میں اردو کے اولین نثرنگار شیخ عین الدین گنج العلمؒ ہیں۔ شیخ گنج العلمؒ علاؤالدین خلجی (م ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء) کے زمانے میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ سن پیدائش ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء ہے۔ لیکن محمد

تغلق کے عہد (۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء--۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) میں دولت آباد تشریف لے گئے اور تمام عمر دکن میں بسر کی- ان کا انتقال ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں بیجاپور میں ہوا-

بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے تبلیغی مقاصد کے پیش نظر مسائل شرعیہ سے متعلق دکنی یا قدیم اردو میں چند مختصر رسالے مرتب کئے تھے- یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان رسالوں کا ایک مجموعہ قلعہ سینٹ جارج' مدراس کے کتب خانے میں محفوظ ہے- لیکن شیخ عین الدین گنج العلمؒ پر اردو نثر نگاری کی اولیت کا یہ سہرا محض روایت پر مبنی ہے- اس لئے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی- جب تک کہ ان کا کوئی رسالہ منظر عام پر نہ آئے اور اسے تحقیق کی کسوٹی پر نہ پرکھا جائے' اس وقت تک محض روایت کی بنیاد پر اتنی بڑی بات کہہ دینا حقیقت سے بعید ہے-

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ

شیخ عین الدین گنج العلمؒ کے بعد تاریخی لحاظ سے خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کا نام آتا ہے- خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ آئے اور وہیں ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں ان کا انتقال ہوا- "معراج العاشقین" "ہدایت نامہ" اور "سہ بارہ" کے نام سے قدیم اردو کے تین رسالے ان سے منسوب کئے جاتے ہیں- "معراج العاشقین" پہلے انجمن ترقی اردو سے چھپ کر شائع ہوئی- پھر تاج کمپنی نے اس کا ایک دیدہ زیب ایڈیشن شائع کیا ہے- دکن دارالاشاعت' کراچی نے بھی اس کا ایک ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں شائع کیا- بعض لوگوں نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب اصل میں خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی اور شخص کی لکھی ہوئی ہے- کسی نہ معلوم وجہ سے یہ ان سے منسوب ہو گئی لیکن ہمارے خیال میں اس قسم کی قیاس آرائی صحیح نہیں ہے- جب تک کہ تحقیق سے معتبر دلائل اور شواہد کے ساتھ یہ ثابت نہ ہو سکے کہ یہ کسی اور کی تصنیف ہے اس وقت تک یہ تسلیم کر لینا کہ خواجہ صاحب سے اس کی نسبت غلط ہے' درست نہیں ہے- اس کے علاوہ خواجہ صاحب کے ایک مرید شاہ عبداللہ ابن عبدالرحمان چشتیؒ نے اپنی ایک فارسی تصنیف "وجود العاشقین" میں اس کا حوالہ دیا ہے' جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب ہی کی تصنیف ہے- "معراج العاشقین" میں جو اصطلاحات از قبیل "واجب الوجود" "ممکن الوجود" "ممتنع الوجود" اور "عارف الوجود" وغیرہ ملتی ہیں' وہ بھی خواجہ صاحب ہی کی خاص تعلیمات میں سے ہیں- ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "معراج العاشقین" کے مقدمے میں اس بحث کو اٹھایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر یہ کتاب خواجہ صاحب کی تصنیف نہیں ہے تو ان کے کسی ہم عصر یا

اس سے قریب زمانے کی تصنیف ضرور ہے۔

بہرحال جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، موجودہ تحقیقات کی رو سے اسے خواجہ صاحب کی تصنیف مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اردو نثر کا اولین نمونہ، جو اب تک شائع ہوا ہے، یہی "معراج العاشقین" ہے، جس کا سن تصنیف مولانا احسن مارہروی کی تحقیق کے مطابق ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء ہے۔ شیخ عین الدین گنج العلمؒ پر اردو نثر نگاری کی اولیت کا سہرا اگر فرضی ثابت ہوا، تو خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ ہی اردو کے اولین نثرنگار قرار پاتے ہیں۔

"معراج العاشقین" ایک مذہبی رسالہ ہے، جو کہ عام لوگوں کی تعلیم و تلقین کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس لئے اس کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہے۔ اس کی حیثیت اور اہمیت جو کچھ ہے وہ صرف تاریخی ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :

"قال نبی علیہ السلام کے، انسان کے پوجنے کوں پانچ تن۔ ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔

پیلا تن واجب الوجود۔ مقام اس کا شیطانی، نفس اس کا امارہ، یعنی واجب کے آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سننا سو۔ حسد نک سوں بدبوئی نہ لینا سو۔ بغض کے زباں سوں بدگوئی نہ لینا سو۔ کینا کے شہوت کوں غیر جاگا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا۔ نبض پچھان کو دوا دینا۔"(۱)

"ہدایت نامہ" کا حال معلوم نہیں۔ "سہ بارہ" کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ نواب عنایت جنگ کے کتب خانے میں ہے۔(۲) ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "میرے پاس آپ کے متعدد اور رسالے اس زبان میں ہیں۔ "تلاوت الوجود" "در الاسرار" "شکار نامہ" "تمثیل نامہ" اور "ہشت مسائل" وغیرہ۔(۳) لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انہیں کی تصنیف ہے۔ بہرحال اردو کے یہ ابتدائی نقوش اگر کسی صورت سے زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہو جاتے تو بہت اچھا ہوتا۔

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کا تعلق، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے بہمنی دور سے رہا۔ اس دور میں ہمیں کئی ایک بزرگ اور ملتے ہیں، جنہوں نے اردو نثر میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں مثلاً :

سید شاہ اکبر حسینیؒ

سید شاہ اکبر حسینیؒ خواہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے صاحبزادہ تھے۔ ۸۱۲ھ/۱۴۰۹ء میں انتقال ہوا۔ انہوں نے ۸۰۲/۱۳۹۹ء میں خواجہ صاحب کے ملفوظات کو "جوامع الکلم" کے نام سے

ترتیب دیا۔

سید عبداللہ حسینیؒ

آپ ۹۰۱ھ/۱۴۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ بھی بڑے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ آپ نے شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے رسالے "نشاط العشق" کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کی ایک شرح بھی لکھی۔ ترجمہ کا نمونہ حسب ذیل ہے :

"کہا مجکو اے غوث الاعظم سو میرے نزدیک مت سو۔ عام کتے سوئے سری کانکو دیکھ تو مجکوں۔ کہا میں اے پروردگار کیوں سوں نزدیک تیرے' کہا مجکو چھوڑ تیرے تن کی لذت ہور چھور یعنی گزر نفس کی شہوت سے' ہور گذر دل کے خطریاں سے' ہور گزر روح کی حرص سے' ہور فنا ہونا ذات تیری ذات میں میری۔"

(ب) عادل شاہی دور (بیجاپور) (۱۴۹۰ء تا ۱۶۸۶ء)

اس دور میں مندرجہ ذیل بزرگوں نے اردو نثر میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں :

شاہ میراں جی شمس العشاقؒ

شاہ میراں جی شمس العشاقؒ مکہ معظمہ میں ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء میں پیدا ہوئے۔(۴) بائیس سال کی عمر میں طلب الٰہی کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ مدینہ منورہ جا کر کوئی بارہ سال رہے۔ وہاں سے روحانی فیوض و برکات حاصل کر کے ہندوستان تشریف لائے اور دہلی میں ٹھہرے۔ کمال الدین بیابانیؒ سے بیعت کی۔ پھر مرشد کے حکم سے عادل شاہ اول کے عہد (۱۵۵۸ء-۱۵۸۰ء) میں دکن کا سفر کیا اور بیجاپور میں جا کر مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ وہاں کی زبان' جسے آج قدیم اردو کہتے ہیں' سیکھ کر لوگوں کو رشد و ہدایت کی طرف دعوت دیتے رہے۔ ان کا انتقال بیجاپور میں ہوا۔ سن وفات معلوم نہیں۔

شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کے کئی چھوٹے چھوٹے رسالے اب تک دستیاب ہیں۔ ان میں سے ایک "شرح مرغوب القلوب" ہے' جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں توبہ' طریقت' حقیقت' شریعت' وضو' دنیا' ترک دنیا' تجرید و تفرید' عشق و معشوق' فنا و بقا اور [illegible] پر بحث کی گئی ہے۔ ہر باب آیت قرآنی یا حدیث نبوی سے شروع ہوتا ہے۔ مگر وہ زیادہ احادیث نبوی کی نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد ترجمہ اور مختصر تشریح کرتے ہیں۔ دو تین نمونے حسب

ذیل ہیں :

"کل امر ذی بال لم یبد بہ بسم اللہ فھو ابتر۔"

"پیغمبر کہے جسے کچ کام کرے گا کوئی خدا کا ناوں نہ لے کر تو او کام پامال ہوے گا۔"

"الحمد للہ رب العلمین۔"

"سرانا نوازنا خدا کوں بہوت کہ او پالنہارا ہے عالم کا۔"

"العاقبہ للمتقین۔"

"ہور اس عالم میں خوبیاں دیوے گا' کہیا ہے اپس کوں پچھانے لوگاں کو ہور پرہیزگاراں کوں۔ پیغمبر علیہ الصلوۃ کہے خدا کی آشنائی جسے کوئی پوجتا ہے انو کیا توں رہ کر انوتھے بوج' نوتھی توں سن ہور چپ نکواچہ۔ اس چار باتاں کا پند ہے۔ یوں شریعت میں پہلے پاؤں رکھ کر طریقت شریعت منج ہے۔"

خدا کہیا "تحقیق مال اور پنگڑے تمہارے دشمن ہیں۔ چھوڑ دیو دشمناں کوں۔ اے کیسا غفلت ہے جو تجھے اندھا کیا موت کی یاد تھی تجھے بسرا کر۔"

ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں: "کہ اگر حضرت گیسو درازؒ کے رسالہ "معراج العاشقین" سے قطع نظر کی جائے اور اسے منسوب خیال کیا جائے' تو پہلے صوفی بزرگ' جن کا نثری سرمایہ مستقل طور پر ملتا ہے' وہ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوریؒ ہیں۔(۵)

شاہ برہان الدین جانمؒ

عادل شاہی دور میں شاہ برہان الدین جانمؒ کے نام سے بھی ایک بڑے صوفی اور عارف گزرے ہیں۔ ان کا سن پیدائش معلوم نہیں۔ سن وفات کے بارے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "ان کی ایک نظم جو مجھے دستیاب ہوئی ہے' اس کا سن تصنیف انہوں نے خود ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء بتایا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ ان کا انتقال اس سن کے بعد ہوا ہے۔"(۶)

شاہ برہان الدین جانمؒ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ انہوں نے عادل شاہ اول اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کا زمانہ پایا۔ انہوں نے "کلمہ الحقائق" کے نام سے اردو نثر میں ایک کتاب یادگار چھوڑی ہے۔ بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے "یہ بڑا اچھا رسالہ ہے اور اس میں تصوف کے مسائل سوال و جواب کے طرز پر بیان کئے گئے ہیں۔"(۷) شروع اس طرح کرتے ہیں :

"اللہ کرے سو ہوئے کہ قادر توانا سوئے کہ قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرنہار سچ سچ سو تیرا نھارو سچ ہوا بھی توج تھی بار۔ جدھاں کچھ نہیں بھی تھا تمیں' دو چار

شریک کوئی نہیں- ایسا حال سمجھنا خدا تھی خدا کوں جس پر کرم خدا کا ہوے-"

اس کے بعد سوال و جواب شروع ہوتا ہے- ایک سوال و جواب بھی یہاں نقل کیا جاتا ہے:

سوال : یہ تن الادھا دسکا، و لیکن جینا بکار ٹوٹنے نہیں بلکہ ستتر بکار روپ دستا ہے، تک تل قرار نہیں، جیون مرکٹ روپ-

جواب : اے عارف ظاہر تن کے فعل سوں گزر یاد باطن کر تب دستے- اس کا ناؤں سوں ممکن الوجود- دوسرا تن سو بھی کہ اس کا ایندین کا بکار و چیشٹا کرنہارا سو وہی تن، نہیں یو خاک و سوکھ دوکھ بھوگن حارا- جیتا بکار روپ وہی دوسرا تن، تو توں نظر کر دیکھ، یہ تن فہم سوں گزر یا تو گن اس کا کیوں رہے-

"کلمتہ الحقائق" کے علاوہ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں شاہ برہان الدین جانمؒ کے اردو نثر میں دو اور رسالوں کا ذکر کیا ہے- ایک کا نام "معرفت القلوب" بتایا ہے اور دوسرے کا "ہشت مسائل" اور لکھا ہے "یہ دونوں رسالے تصوف پر ہیں اور ان کے مخطوطات آغا حیدر حسن صاحب کے پاس موجود ہیں-(۸) اس کے بعد نمونہ یوں پیش کیا ہے، جو "معرفت القلوب" سے لیا گیا ہے:

"جان اے سالک پہچانت کرنا شریعت کا ہور حقیقت کا ہور طریقت کا ہور معرفت کا اس میں بیان تمام ہے کہ نفع پانے کے بدل عالماں کوں ہور عاشقاں کوں ہور واصلاں کو اب تو سب کوں تسلی دکھلاتا ہے، ہور دل کوں ان پر کر راحت پاتے ہیں-"

شیخ محمود خوش دہانؒ

محمد سخاوت مرزا نے اپنے مضمون "قدیم اردو نثر میں" شیخ محمود خوش دہان کے ایک رسالہ نثر دکنی کا ذکر کیا ہے- جس کا عنوان ہے "کلام شیخ محمود خوش دہان" مگر اصل نام "تنبیہہ الخلائق" ہے- آپ صوفی منش انسان تھے اور علی عادل شاہ اول اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کے معاصر تھے- آپ کے صحیح سن وفات کا تو پتا نہیں چلتا، البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۲ء تک بقید حیات رہے- محمد سخاوت مرزا نے اس رسالہ سے آپ کی نثر کا جو نمونہ دیا ہے وہ یہ ہے:

سوال : نفس کا، دل، روح کا فعل سو کیا و صفت سو کیا، ذات سو کیا-

جواب : نفس کا فعل سو برے عملاں، صفت سو خدا کوں نا سمجھ کرے- اوس کا ذات سوں خدا سوں موں پھیرانا و دل کا عمل سو خوب عملاں کرنا، وصفت سوں خدا کوں

سمجھنا' و ذات سو خدا طرف رخ و توجہ کرنا و روح کا فعل سو خدا کوں دیکھنا۔ صفت سو ذوق شوق دھرنا و ذات سو خدا دیکھنا۔

یہ پتا نہیں چلتا کہ شیخ محمود خوش دہانؒ کا وہ رسالہ نثر دکنی کہاں کس شکل میں موجود ہے بھی یا نہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور نصیر الدین ہاشمی یا محی الدین قادری زور نے جن کا دکنی ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہے' اس رسالے کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس لئے جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ صرف محمد سخاوت مرزا کی تحقیق کی بنا پر ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰ[۲۸]

شاہ امین الدین اعلیٰ شاہ برہان الدین جانمؒ کے فرزند اور جانشین تھے۔ آپ بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح صوفی منش انسان تھے۔ ۱۵۹۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۷۵ء میں انتقال کیا۔ اردو نثر میں چند رسالے مثلاً "گنج مخفی" "گفتار شاہ امین" وغیرہ آپ سے منسوب ہیں۔ عبارت کا نمونہ جو دستیاب ہوتا ہے' وہ حسب ذیل ہے:

> "اللہ تعالیٰ نے گنج مخفی کو عیاں کرنا چاہا تو اول' اس میں سون ایک نظر نکلی' سو اس سے امین دیکھ ہوا۔ امین شاہد کہتے ہیں یودودون ذات کے دو طور ہیں۔ ذات نے اپس کو دیکھا' اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا' اسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"

ابتدائی جملہ "اللہ تعالیٰ نے گنج مخفی کو عیاں کرنا چاہا" سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس رسالہ "گنج مخفی" سے ہے۔ ورنہ اور کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ یہ اقتباس کہاں سے لیا گیا ہے۔

"گفتار شاہ امین" کے بارے میں محمد سخاوت مرزا نے لکھا ہے کہ اس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

> "من کان فی حذہ اعمی فھو فی آلاخرۃ اعمی۔ یو مخفی ہے گفتار۔ یان جن آندھی وان کیا دیکھیں یو آپین نھار من عرف کون کرسوں پوچھیں نہیں تو اندرے یار ظاہر باطن علم کھدونی کہر مکہ لیو بچار فنا سو جینا بقاسون کھونا نقاتون اپنان جان دلیل خدا کا نبی بولے کل من علیھا فان کفر اندھارا منج من میرا کیوں منجہ سمجھے راہ تون جس نور ہے آپ دیکھا وے۔ یھدی من یشاء پیو پیارا منجہ میرا پیو کا جیو مرید! شناد کہ نیری شاہد میری الیہ من حبل الورید بتو سون جوری کھیل نہو بری سابت راہ کر یقین دلیل خدا کا نبی بولے مکروا و مکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔"

نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں اردو نثر کے دو رسالوں کا ذکر کیا ہے۔ جو غالباً اسی زمانے میں لکھے گئے ہیں، لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کے مصنف کون ہیں۔ ایک رسالے کا نام "ارشاد نامہ" ہے۔ دوسرے کا نام معلوم نہیں۔ "ارشاد نامہ" کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"بسم اللہ نام اللہ کا.....

اللہ محمد کے راز رموز کے باتاں کسی نامحرم کے آگے نا بولنا، بولیں گے تو کافر ہویں گے۔ سو دیوانے ہو ینگی تو انو کوں بول کر دیوانے نا کرنا۔ ہور اپی سنا کر کافر نہ ہونا۔ یو شرط اس زبان سوں ذکر کرنا اللہ اللہ۔"

خاتمہ عبارت:

"اے بار خدایا، ارادت کو مجھ پر آستی تا کہ تیری احد ذات میں فنا ہوئی الف کالا نفی الاثبات ذات تعلق صفات تجلی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔"

نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ یہ رسالہ ان کے پھوپھا مولوی عبداللہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ دوسرے بغیر نام والے رسالے کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"اے عارف، خدائے تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے، کل شی محیط و فی انفسکم افلا تبصرون.... اس واسطے ضرور ہوا کہ کچھ معرفت حق کا بولنا جوں آپکوں سچا یا، جتن قال علیہ السلام تکلم الناس علی قدر عقولہم، یعنی آدمی بات کرتا ہے اپنی عقل موافق.... جو کوئی پیر کامل سوں یہ دیکھے عن اوس کا متاع ہے۔ نہیں ہے۔ اے عارف، ہر ایک انسان کوں پانچ وجود ہیں۔ ہر ایک وجود باری تعالیٰ کا ہے۔ ہر ایک وجود کی شرطاں اور لوازمات ہیں۔"

محمد شریف

محمد شریف کے ذاتی حالات معلوم نہیں۔ غالباً گلبرگہ کے رہنے والے تھے۔ "گنج مخفی" کے نام سے اردو نثر میں ان کی ایک کتاب کا پتا چلتا ہے، جو انہوں نے ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں تالیف کی تھی۔ اس کا مخطوطہ کتبخانہ آصفیہ، حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"مزید سوال کئے، دم کیوں ہے، ہور دم کیا ہوتا ہے، دم کوں کیوں پچھاننا۔ پیر فرمائے کہ پیغمبر صلعم کیا فرماتے ہیں کہ جو کوئی پچھانا دم کوں، پس تحقیق پچھانیا اول اللہ کوں۔ جو کوئی دیکھیا دم کوں، پس تحقیق دیکھیا حق کوں جو کچھ ہے سو دم ہے، دم

صاحب ہے' دم مولا ہے' دم فاعل ہے' پس جو کوئی دیکھیا دم اور ہوا بے غم' جو کوئی پچھانیا دم اور ہوا بے غم' جو کوئی نہیں دیکھیا دم او ہوا پر غم' جو کچھ ہے' سو دم ہے۔ دم زندہ ہے' دم جیو ہے' دم دل ہے' دم نفس ہے' دم روح ہے' دم کو نور ہے۔ دم تو اگلی نور صفت دھرتا ہے۔ دم نو رنہ نام دھرتا ہے۔ بلکہ دم ہزار صفت دھرتا ہے۔ دم ہزار ناوں دھرتا ہے۔"

محمد مخدوم عبدالحق ساویؒ

آپ بھی صوفی منش انسان تھے۔ ۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء کے لگ بھگ بیجا پور میں پیدا ہوئے' اور ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء میں حیدر آباد دکن میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار شریف مدراس میں ہے۔ آپ نے تصوف کے موضوع پر اردو نثر میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ ایک کا نام "غایت التمثیل" ہے' جو قدیم اردو میں ہے۔ دوسرا ایک رسالہ "مفتح الکل" یا "پنج گنج" کے نام سے ہے' جس کے بارے میں محمد سخاوت مرزا نے لکھا ہے کہ اس کا انداز تحریر نیا ہے۔ سنہ تالیف ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء ہے۔ شروع میں حمد و نعت و منقبت وغیرہ نظم میں ہیں۔ اس کے بعد نثر شروع ہوتی ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے

"تمہید نام کتاب:

اے عزیز وافر تمیز اس پچھانت کے پانچ گنجان کی تفصیل ہور ابواب کا ناوں کتاب "مفتح الکل" رکھیا ہوں۔ ہور ہر یک گنج میں پانچ باب ہیں۔ ہور ہر یک باب میں پانچ فصل ہیں' و لیکن اس کتاب کوں سمجھنا ہور اس کی حقیقت جیون ہے تیوں پانا بہوت مشکل ہے۔"

اس رسالے میں جدت یہ پائی جاتی ہے کہ شریعت' طریقت' حقیقت' معرفت اور مراتب علم ناسوت' ملکوت' جبروت' ناہوت کو بلحاظ مراتب جمادات و حیوانات و نباتات کی اسفل و اعلیٰ چیزوں سے تمثیل پیش کی ہے۔ زبان اور املا وہی دکنی ہے۔ عربی فارسی کا امتزاج بھی ہے۔ ہندی الفاظ کم ہیں۔ فارسی کا اثر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد' دکن میں موجود ہے۔(۹)

رسالہ "غایت التمثیل" کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا' نہ اس کی عبارت کا نمونہ ہی

(ج) قطب شاہی دور (گولکنڈہ اور حیدر آباد) (۱۵۰۸ھ تا ۱۶۸۷ء)

قطب شاہی دور میں جو نثر نگار گزرے ہیں' ان کا حال حسب ذیل ہے :

سید میراں حسینی شاہ

آپ شاہ امین الدین اعلیٰ" کے مرید تھے- حیدر آباد دکن کے رہنے والے' اور سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۶ھ-۱۶۷۲ء) کے معاصر تھے- کسی سلسلے میں بیجاپور گئے' تو شاہ امین الدین اعلیٰ سے بیعت کر لی' اور باقی عمر راہ حق میں گزار دی- آپ کا انتقال (۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳ء) میں ہوا-(۱۰)

سید میراں حسینی شاہ" کئی اردو رسالوں کے مصنف' جن میں سب سے زیادہ مشہور اور ضخیم "شرح تمہید ہمدانی" ہے' جو دراصل "تمہیدات عین القضات" کا ترجمہ ہے- ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اس کے ایک نسخے میں سنہ کتابت ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء لکھا ہوا ہے- اس کے بعد لکھتے ہیں :

"اس لحاظ سے یہ کتاب اردو کی قدیم نثر کی کتابوں میں خاص درجہ رکھتی ہے- کیونکہ علاوہ چند مختصر رسالوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے' اس سے قبل نثر میں صرف وجہی کی "سب رس" پائی جاتی ہے-(۱۱)

عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :

"اے عزیزاں! اے بات نہیں سنیان- بادشاہاں گھوڑا مستعد کیجئے- باج نہیں سوار ہوتے' ہور گھوڑے میں کچ گھوڑ اچھے تو بھی نہیں قبول کرتے- یعنی پیر کے عشق میں بجتا ہوئے باج خدا کے عشق میں نا آسک سی ہور دیکہ نا سکی- اگر عشق نداری بارے عشق تلوتے مہیا کن- اس کا معنا' خدا کی پچھانت کا بل نہیں تو اول اپنی پچھانت کر- اے بات یوں ہے کہ آفتاب کا ذات نواز نہارا ہے اور اس کا اجالا جالنہارا ہے' یعنی دوست سو نواز نہارا ہور خوبیاں د ـ‌نہارا- ولے اس کا محبت اسے دگدانا ہے- یعنی معشوق کا محبت عاشق کو گالنا ہے اس کے فراق میں-"

نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں آپ کا نام میراں جی حسن خدا نما لکھا ہے- حالات اور تصنیف سے ثابت ہوتا ہے' میراں جی حسن خدا نما کوئی الگ شخص نہیں' بلکہ سید میراں حسینی شاہ ہیں- لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کیوں آپ کا نام سید میراں حسینی شاہ لکھا ہے' اور نصیر الدین ہاشمی نے میراں جی حسن خدا نما-

مولانا عبداللہ

مولانا عبداللہ قطب شاہی دور کے ایک اردو نثر نگار ہیں۔ لیکن ان کے ذاتی حالات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ "احکام الصلوٰۃ کے نام سے انہوں نے اردو نثر میں ایک کتاب لکھی ہے۔ سنہ تصنیف ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"اول کلمہ طیب۔ پہلا کلمہ بولتا ہوں میں پاکی کا کائیکی پاکی ایمان کی کفرتی۔ شرکتی لا الہ الا اللہ۔ نہیں کوئی معبود بر حق الا اللہ۔ مگر اللہ تعالٰی معبود بر حق ہے۔ محمد رسول اللہ، محمد رسول خدا کے بر حق ہیں۔ دوم کلمہ شہادت۔ دوسرا کلمہ بولتا ہوں میں شہادت کا یعنی گواہی دیتا ہوں اس خدائے تعالٰی کی ایک پنی پہ۔ اشہد اور گواہی دیتا ہوں میں ان لا الٰہ کہ نہیں کوئی معبود بر حق۔"

"بات کرنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں آدمیاں کی مثال دعا منگنے نماز جاتا ہے۔ ہی واہ کنے سوں نماز جاتا ہے۔ درد سوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔ رونے سوں یا دنیا کی سبب سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں کسی موت کی خبر سن کر قالو انااللہ و انا الیہ راجعون بولتی سون نماز جاتا ہے۔ خبر سن کر نماز جاتا ہے۔ نماز میں سبحان اللہ بولتی سون نماز جاتا ہے۔ مصحف دیکھ کر پرنیوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں قہقہہ ہنسے سوں نماز جاتا ہے۔"

اس دور کی ایک اور کتاب کا ذکر آتا ہے، جس کے مصنف کے نام یا سنہ تالیف کا پتا نہیں چلتا۔ نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ اسی دور کی لکھی ہوئی ہے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"ایمان کی حکماں کا معرفت ہور نماز احکام ہور ارکان پچھانا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب کوں اس کی پچھان نی بھتکارا ہے۔ ہور آخرت میں خدا کے عذابوں میں گرفتار ہونا ہوگا۔ اگر تجھے پوچھیں کہ ایمان کیا ہے، بول تو ایمان اقرار کرنا ہے زبان کے تئیں، ہور استوار کرنا ہے دل میں خدائے تعالٰی یک ہے۔ مقراس یک خدا خارج دوسرا نہیں ہے۔ ہور جو کچھ کی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالٰی کے نزدیک تھیں لے کر آئے ہیں سو حق ہے۔ راست ہے ہور فرشتے ہور آدمیاں پریاں یو سب خدا تعالٰی نے پیدا کیا۔ اگر تجھے پوچھیں ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے۔ بعضی بولتے ہیں کہ ایمان غیر مخلوق ہے، اور بعضی بولتے ہیں، مخلوق ہے۔ دو روش پہ ہے۔ اول ایمان اقرار کرنا، ہور استوار رکھنا یو فعل بندے کا ہے۔"

اس میں نہ تو یائے معروف و یائے مجہول کا لحاظ کیا گیا ہے، اور نہ تذکیر و تانیث کا۔

ملا وجہی

ملا وجہی قطب شاہی دور کے سب سے بڑے نثر نگار ہیں۔ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ء—۱۶۷۲ء) کے درباری شاعر تھے' جن کی فرمائش پر انہوں نے "سب رس" کے نام سے اردو نثر میں ایک معرکتہ الارا کتاب لکھی۔

ملا وجہی کے ذاتی حالات پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ اس لئے اس بات کا تعین مشکل ہے۔ کہ وہ کب پیدا ہوئے اور کب فوت ہوئے۔ البتہ اتنا پتا چلتا ہے کہ انہوں نے "سب رس" ۱۰۴۵ھ/۱۵۳۵ء میں تصنیف کی ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اس کتاب کو نہایت محنت سے مرتب کر کے انجمن ترقی اردو سے شائع کیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا۔

قدیم اردو نثر میں یہ کتاب ایک خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا قصہ عجیب و غریب ہے۔ طرز بیان بھی بڑا انوکھا اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں حسن و عشق کی کشمکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصے کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق یہ قصہ فتاحی نیشا پوری (م ۱۴۴۸ء) کی مثنوی "دستور عشاق" سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ وجہی نے کہیں اس بات کا اعتراف نہیں کیا ہے' بلکہ ہر جگہ یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ ان کی طبع زاد تصنیف ہے۔(۱۲)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "باوجود اس کے ہم وجہی کو استاد مانتے ہیں' اور جو کام انہوں نے کیا ہے' اس کا احساں نہ ماننا حقیقت میں نا انصافی ہے۔ اس زمانے میں اردو نثر کا نام نہ تھا' اور نثر لکھنا کوئی کمال کی بات سمجھی جاتی تھی۔ ایک دو رسالے' جو اس کے قبل کے پائے جاتے ہیں' سو وہ اس قابل نہیں کہ محفل ادب میں جگہ پائیں۔ "سب رس" اردو نثر کی پہلی کتاب ہے' جو ادبی اعتبار سے بہت بڑا درجہ رکھتی ہے' اور اس کی فضیلت اور تقدیم کو ماننا پڑتا ہے۔"(۱۳)

عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

آغاز داستان زبان ہندوستان

عقل' ایک شہر تھا'اس شہر کا ناؤں سیستان' اس سیستان کے بادشاہ کی ناؤں عقل' دین و دنیا کا تمام کام اس تے چلتا۔ اس کے حکم باج ذرا کیں نہیں ہلتا۔ اس کے فرمائے پر جنو چلے' ہر دو جہاں میں ہوئے بھلے۔ دنیا میں خوب کہوائے' بہار لوگاں میں عزت پائے' جان رت کھڑے' وہاں

قبول پڑے- نہ آفت دیکھی نہ زلزلا- اپے بھلے تو عالم بھلا- کسی کو برا بولنا یو وسواس ہے' بھائی برائی سب اپنے پاس ہے- اپے چل نہیں جانتے' دسریاں پر برا مانتے- اول اپنی خبر میں اپے رہنا' پچھے دسریاں کون برا کہنا- جنے اپس کون پچھانیا' انے سب جانیا- جد ہر ڈھلنا ہے' ادھر عقل کے اجالے میں چلنا ہے- آدمی نے عقل چھوڑ دیا' دیوانہ ہوا اپنا سر اپے پھوڑ یا- عقل میں جو کالکوت ملتی' تو حرمت میں نقصان ہوتا- مدعا دوڑ پڑتا دل تی- اگر منگتا ہے جو دل کون تازا رکھے مدعا پاوے' تو بھلا ہے جو عقل میں کالکوت کوں ہلاوے- سکت ہے تو عقل میں ہمت کوں کر شریک' یو پند ہے اگر تجھ میں کچھ بجھ ہے تو سیک- جکوئی یو چلنت چلتا ہے' "دو کامل ہوتا ہے- روشن طبیعت زندہ دل ہوتا ہے' عقل میں کالکوت' جوں ریشم میں سوت' جوں دود میں چھاچ' جوں پاچ میں کاچ' جوں شیرے میں میرا' جون اجلے زیرے میں کالا زیرا- جنے دل کو جلایا' انے کچھ پایا' قدم انگے دھریا' انے کچھ کریا- مردی و نامردی یک قدم ہے- مرد کوں یہاں بڑی فکر نامرد کوں کیا غم ہے- انجتا بچارا بھلا' جانتے پر پڑے بھلا- کالکوت تی جو دل مرے گا' تو بچھین بچارا کیا کام کرے گا- دل اس کا جیتا ہے جس میں عشق ہور ہمت ہے' جیونا بی اپیچ کا ہے- اس پر رحمت ہے- جیوں حافظ بولیا ہے- دل کے گھر کے دروازے کھولیا ہے-"

قدیم اردو نثر میں ملا وجہی کی اور ایک کتاب "تاج الحقائق" کے نام سے ہے- ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس کتاب کو مرتب کر کے سلسلہ یوسفیہ سے چھپوا دیا ہے-(۱۴)

میراں یعقوب

قطب شاہی دور کے ایک اور نثر نگار میران یعقوب ہیں- انہوں نے "شمائل الاتقیا" کے نام سے ایک کتاب ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء میں مرتب کی- یہ اصل میں برہان الدین اولیاء اورنگ آبادی کی فارسی کتاب "شمائل الاتقیا" "کا اردو ترجمہ ہے- موضوع تصوف ہے' اور کافی ضخیم ہے- نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ یکم ربیع الثانی ۱۱۶۲ھ/۱۵۷۰ء کا لکھا ہوا نسخہ ان کی نظر سے گزرا ہے- نمونہ حسب ذیل ہے:

"اپنی حیات کے وقت منجے اشارات کئے تھی جوں شمائل الاتقیا" کتاب کون ہندی زبان میں لیاوی تاہر کسی کون سمجھا جاوی- اس وقت منجے بیا نہیں تا کہ یک ہزار ستر پر انھوں سال کوں رحلت کئے پران ان کے بھانجے عارف حق رسیدی عارفوریکی نور دیدی مصطفٰی کی کلیجی ہور مرتضی کے نین شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے زماں میں کتاب لکھنے کا شروع کیا' جی کچھ مشکل آتا تھا- سو پیر کی مدد سون آسان لکھا جاتا تھا- جب خدا کی توفیق سوں کتاب تمام ہوا ہور حضرت شاہ کی

حضور ہور محقق کامل موحد واصل شریعت کے موافق بابا ابراہیم خلیل کے اس کی لے کر مطالع فرما کر خوش کئے۔"

شاہ عابد

قطب شاہی عہد میں شاہ عابد کے نام سے بھی ایک بزرگ گزرے ہیں' جو نثر نگار تھے۔ انہوں نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی فارسی کتاب "محالجات بندہ نواز" کا اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"اول ثنا صفت کرنا اللہ تعالٰی کا کہ قادر ہے تمام چیزوں پر قدرت رکھتا ہے اور ہر شے میں حاضر و ناظر ہے' جیسا کہ شکر مٹھائی اور پھول میں باس۔ اسی طرح سب میں صنعت گری رکھتا ہے۔ آپ کی دوسری اہم تصنیف "کنز المومنین" ہے۔

سلطان

یہ اصل میں شاعر ہیں' لیکن "درالاسرار" کے نام سے اردو نثر میں بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ موضوع تصوف ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"کنت کنزا" مخفیا" فاجبت ان اعرف فخلقت الخلق۔ یعنی اور سلطان اپنی ذات کے دریا میں راز گنج رکھیا تھا۔ بقا کے موتیاں سون بھر کر ہو کر اوس حال میں پاک ہک اوس گنج ظرف نظر کیا۔ ھور اس موتیاں کا او جانا دیک کر عاشق ہوا ہو مصلحت تجویز میں آیا جو راز کے موتی چھپا کر رکھنا خواب نہیں' بلکہ عشق کے بازار میں ظاہر کرنا بھلا ہے۔"

ذکا حسن بیگ

یہ اصل میں شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ لیکن بعد میں گولکنڈے میں جا کر بس گئے تھے۔ سنہ وفات یا دیگر حالات معلوم نہیں۔ البتہ یہ یقینی ہے' گیارھویں صدی ہجری اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں زندہ تھے۔ انہوں نے فضلی کی "کربلا کتھا"(۱۵) سے تیس سال قبل یعنی ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء میں اسی نام سے قدیم اردو نثر میں ایک کتاب لکھی۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"اما حر بن یزید ریاحی کوفہ کے لشکر سون اگلے کھڑا تھا۔ جب یو حال دیکھیا' عمر سعد کوں بولا کہ اے عمر تو امام حسین سوں لڑے گا' عمر نے کہیا لڑوں گا۔ ہور اس لڑائی

میں بھوت تن بے سر ہویں گے۔ جیسے کہ مرزا علیہ الرحمتہ اس کے قصہ میں بولیا ہے کہ بعد ازاں عمر بن سعد کوں پوچھا ہے' یعنی کاے عمر اب اس لڑائی پر مجھے نیت ہے کیوں۔ تب کہا حر کوں عمر آج یو لڑائی سخت ہے۔ کے سراں ہووے تاسوں دور' یو دو وقت ہے۔ حر کھیا ظلم ان شہاں سون تون کرے گا اس ذرا تو خدا کے خدمت محشر کون پاوے گا سزا۔"

تبصرہ

جنوبی ہند میں قدیم اردو نثر کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں' ان کے علاوہ بھی وہاں نثری کارنامے ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں' جن کا سنہ تصنیف یا تالیف متعین نہیں کیا جا سکا ہے' اور بعض ایسے ہیں' جن کے بارے میں یہ پتا لگانا دشوار ہے کہ ان کے اصلی مصنف کون ہیں۔ بہر کیف اس باب میں اہل تحقیق کی کوششیں جاری ہیں' ممکن ہے' آگے چل کر مزید معلومات فراہم ہوں' اور نثری سرمایہ میں کافی اضافہ ہو۔

اب تک قدیم اردو نثر کا جو ذخیرہ میسر آ سکا' وہ بہت قابل قدر ہے اور جنوبی ہند کو بجا طور پر یہ فخر حاصل ہے کہ اردو نے اپنے بچپن میں جب اس سرزمین کا سفر کیا' یا یوں کہئے کہ اپنی جائے پیدائش شمالی ہند سے سرپرستی نہ ملنے کی وجہ سے وہاں جا کر پناہ لی' تو اس نے اسے اپنی آغوش میں جگہ دی' اور بڑے پیار محبت سے اس کی پرورش کی۔ شاہان گولکنڈہ و بیجا پور نے اپنے اپنے عہد میں اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کی وہ خاطر تواضع اور سرپرستی کی کہ برصغیر کا وہ دور افتادہ خطہ اردو ادب کا اولین گہوارہ قرار پایا' اور اس کی تاریخ میں کئی سو سال کا اضافہ ہو گیا۔

پچھلے صفحات میں جن مصنفین کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے اکثر و بیشتر صوفیائے کرام اور بزرگان دین تھے' چنانچہ اسی لئے اُن کے نثری کارنامے بالعموم تصوف کی تعلیمات دین کی تبلیغ و تلقین اور پند و موعظت پر مشتمل ہیں۔ اردو ادب کی براہ راست خدمت کرنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ سماجی ضروریات کے ماتحت کیا۔ اس زمانہ میں رائج الوقت اردو زبان میں کچھ لکھنا اہل ثقہ باعث عار سمجھتے تھے اور اپنی ہتک محسوس کرتے تھے۔ اس لئے کوئی اپنی خوشی سے اسے منہ لگانا نہ چاہتا تھا۔ لیکن چوں کہ اہل اللہ اور صوفیائے کرام اس قسم کے ظاہری ننگ و عار سے مبرا ہوتے ہیں اور ان کی نگاہیں ہمیشہ حقائق کی طرف رہتی ہیں اس لیے انہوں نے کبھی ان باتوں کی پروا نہ کی' بلکہ انہوں نے وقت کے تقاضے کو ملحوظ رکھا۔ وہ لوگ عام رواج کے مطابق فارسی میں لکھتے تھے' لیکن افادیت کا خیال کر کے اردو میں بھی لکھتے تھے۔ تاکہ عوام الناس جو کہ فارسی سے عموماً نابلد ہوتے ہیں' زیادہ سے زیادہ ان کی تعلیمات سے فائدہ حاصل کر

سکیں، اور دین الٰہی کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس طرح وہ گویا غیر شعوری طور پر اردو کی ابتدائی نشو و نما میں مدد دے رہے تھے۔ قدیم اردو کی تاریخ آج سے کوئی ساڑھے سات سو سال پہلے سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانہ کی زبان اور آج کی زبان میں زمین و آسماں کا فرق ہے۔ اس لئے اس عہد قدیم کی زبان ہماری سمجھ میں بڑی مشکل سے آتی ہے۔ لیکن تاریخی حیثیت سے اس کی بڑی وقعت ہے۔ صوفیائے کرام کا اردو علم و ادب پر بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے اس ٹوٹی پھوٹی زبان ہی سے اپنا کام شروع کیا، اور وقت کی روایت سے بغاوت کر کے قصر ادب کی پہلی اینٹ رکھی۔ یہ لوگ کوئی بڑے ادیب نہیں تھے اور نہ اپنے آپ کو ادیب کہلانا ان کا مقصد تھا۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے وہ جو کچھ لکھ رہے تھے، اس سے بالواسطہ اردو ادب کی بھی خدمت ہو رہی تھی۔

اردو علم و ادب کے ان ابتدائی نقوش میں ادبی خوبیاں اور محاسن خال خال ہی نظر آئیں گے۔ ان پر مذہبی رنگ غالب ہے۔ سوائے وجہی کی "سب رس" کے۔ اس کتاب میں مذہبی رنگ بہت ہلکا ہے، جو ہے، وہ بھی مجاز و استعارہ کے پیرایہ میں ہے۔ ایک کارنامہ یا ایک اچھا ادب کہلانے کے لئے جن ظاہری اور معنوی محاسن کا ہونا ضروری ہے۔ اس کتاب میں وہ تقریباً سب موجود ہیں۔ زمانے کو ملحوظ رکھا جائے، تو اس سے زیادہ تقاضا کرنا، وجہی پر ظلم ہوگا۔ ہمارے عہد کے بہترین لکھنے والے اگر اس زمانہ میں ہوتے، تو ہرگز اس سے بہتر نہ لکھ سکتے تھے۔ اس لئے وجہی کی "سب رس" کو اس زمانہ کا شاہکار کہا جائے، تو بیجا نہ ہوگا۔

حواشی

۱۔ معراج العاشقین، دکن دارالاشاعت کراچی، صفحہ ۱۷۔

۲۔ دکن میں اردو، ص ۲۷۔

۳۔ اردو کی ابتدائی نشونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۲۳۔۲۴۔

۴۔ اس سنہ کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ کوئی اسے سنہ پیدائش لکھتا ہے، اور کوئی سنہ وفات۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بھی اسے سنہ وفات قرار دیا ہے۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنہ پیدائش ہے۔ اس لیے کہ ایک جگہ ملتا ہے کہ وہ عادل شاہ اول کے عہد (۱۵۵۸ء۔۱۵۸۰ء) میں بیجا پور گئے۔ اگر ۱۴۹۶ء کو ان کا سنہ وفات فرض کر لیا جائے، تو وہ عادل شاہ اول کے عہد میں بیجا پور کیسے جا سکتے ہیں۔

۵۔ اردو کی ابتدائی نشونما میں صوفیائے کرام کا کام، صفحہ ۴۵۔

۶۔ اردو کی ابتدائی نشونما میں صوفیائے کرام کا کام، صفحہ ۵۶۔

حواشی

۱۔ معراج العاشقین، دکن دارالاشاعت کراچی، صفحہ ۱۷۔
۲۔ دکن میں اردو، ص ۲۷۔
۳۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۲۳۔۲۴۔
۴۔ اس سنہ کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ کوئی اسے سنہ پیدائش لکھتا ہے، اور کوئی سنہ وفات۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بھی اسے سنہ وفات قرار دیا ہے۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنہ پیدائش ہے۔ اس لیے کہ ایک جگہ ملتا ہے کہ وہ عادل شاہ اول کے عہد (۱۵۵۸ء-۱۵۸۰ء) میں بیجا پور گئے۔ اگر ۱۴۹۶ء کو ان کا سنہ وفات فرض کر لیا جائے، تو وہ عادل شاہ اول کے عہد میں بیجا پور کیسے جاسکتے ہیں۔
۵۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، صفحہ ۴۵۔
۶۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، صفحہ ۵۶۔
۷۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۶۰۔
۸۔ دکن میں اردو، ص ۲۱۴۔
۹۔ تاریخ ادب اردو، پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹڈ، ص ۵۴۶۔ ۵۴۷۔
۱۰۔ اس لحاظ سے آپ کا انتقال شاہ امین الدین اعلیٰ سے پہلے ہوا۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کا انتقال ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء میں ہوا تھا۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے آپ کا ذکر پہلے آنا چاہیے تھا لیکن آپ شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے، اس لئے میں کیا گیا ہے۔
۱۱۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۶۴۔
۱۲۔ مقدمہ سب رس، ص ۶۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۳۷۔
۱۴۔ دکنی ادب کی تاریخ، ۷۰۔
۱۵۔ اس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔

باب دوم

اردو نثر شمالی ہند میں

تمہید

جس زمانے میں جنوبی ہند میں شاہان بیجا پور و گولکنڈہ کی سرپرستی اور صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی تبلیغی سرگرمیوں کی بدولت اردو ادب کی ابتدائی نشو و نما ہو رہی تھی- اس زمانے میں شمالی ہند میں بھی کہیں کہیں جستہ جستہ کام ہو رہا تھا- اگرچہ وہ کام جنوبی ہند کے مقابلے میں بہت کم تھا' اور اس کا ذکر محض تاریخی اعتبار سے کیا جا سکتا ہے- جنوبی ہند میں اس زمانے میں جو کام ہو رہا تھا' ذرائع آمد و رفت نہ ہونے کے سبب' اس کے نمونے شمالی ہند میں منتقل نہ ہو سکتے تھے- اس کے باوجود شمالی ہند میں جو تھوڑا بہت کام ہوا- ذیل میں اس کا حال مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے-

شیخ شرف الدین یحییٰ احمد منیریؒ

شمالی ہند میں قدیم اردو نثر کا اولین نمونہ ہمیں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی نگارشات میں ملتا ہے- آپ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' صوبہ بہار کے قصبہ منیر کے رہنے والے تھے- سنہ ولادت ۶۶۲ھ/۱۲۶۳ء ہے' اور سنہ وفات ۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء ہے-(۱)

آپ کی ابتدائی تعلیم حسب دستور گھر پر ہوئی- اس کے بعد وہ مولانا شرف الدین ابو توامہ جو بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر دہلی سے سلطان غیاث الدین بلبن (عہد حکومت ۱۲۲۸ء تا ۱۲۸۱ء) کے حکم پر براہ منیر شریف' بہار' سنار گاؤں' متصل نرائن گنج' ڈھاکا' (بنگلہ دیش) جو اس زمانہ میں حکمرانان بنگال کا صدر مقام تھا' جانے لگے تو آپ بھی ان کے ہمراہ مزید تعلیم کے لئے وہاں پہنچے- انہوں نے وہاں کئی سال قیام کر کے دینی تعلیم کی تکمیل کی- اسی زمانہ میں اپنے استاد مولانا شرف الدین ابو توامہ کی صاحبزادی بھو بادام سے شادی کی-(۱۵)

اردو کی ابتدائی نشو و نما میں برصغیر کے دیگر صوفیائے کرام کی طرح آپ کا بھی حصہ ہے- چنانچہ اس سلسلے میں آپ کے مندرجہ ذیل گنج مندرہ کا ذکر آتا ہے' جو مختلف بیماریوں کے لئے مفید بتایا جاتا ہے:

"بس نوگرہ دس راون- اگیارہ رود بارہ راس' تیرہ تمپول' چودہ بھون' پندرہ قسم' سولہ ک لا' چار کہان' چار بان' پانچ بھوت آت مان نوے ناتہ' چوراسی سدو' چوستہ جوگنی' اشت کوڑی ناک تی تیس کوڑی دیوتا چوراسی- جن سر جیو جنت اکاس پاتال مسرت منتل رات دن کہری ژژبی ژژ پلا پیلا جوک مہورت میں تمہیں ساکھی دھرت ہوں-"

خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ

آپ برصغیر کے ایک نامور بزرگ گزرے ہیں- آپ اپنے عہد شباب میں ہندوستان تشریف لائے تھے' اور حضرت علا الدین قطب بنگال کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے- روایت ہے کہ آپ نے کوئی تیس سال تک مختلف اسلامی ممالک کی سیر کی- ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں انتقال کیا- مزار شریف کچھوچھا' علاقہ اودھ میں واقع ہے-

خواجہ اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اردو نثر میں اخلاق و تصوف پر ایک رسالہ تالیف کیا' جو اصل میں ان کے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہ الدین کے ارشادات و تعلیمات پر مشتمل ہے- یہ اردو نثر کی اولین تصنیف قرار دی گئی ہے- اس سلسلے میں میر نذر علی درد کاکوروی نے رسالہ "نگار" لکھنؤ بابت دسمبر' ۱۹۲۵ء میں لکھا ہے کہ "میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے- یہ قلمی کتاب دو سو سات صفحے کی ہے- اس کے صفحہ ۱۱۸ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے-

"اے طالب آسمان و زمین سب خدا نہیں ہے- ہوا سب میں خدا ہے' جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے' تو صفات کے باہر حیتہ سب ذات ہی ذات-"

فضل علی فضلی

محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد حکومت (۱۷۱۹ء-۱۷۴۸ء) میں بہت بڑے عالم گزرے ہیں- ان کے ذاتی حالات کا پتا نہیں چلتا- مولانا احسن مارہروی اور مولانا حامد حسن قادری کی رائے ہے کہ ان کا تعلق اصل میں دکن سے تھا' مگر وہاں رہے نہیں- شمالی ہند میں آ کر بس گئے تھے-

فضلی نے "کربل کتھا" یا "دہ مجلس" کے نام سے اردو نثر میں ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے' جو کچھ عرصہ تک اردو نثر کی اولین کتاب سمجھی جاتی رہی- لیکن اب وہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے- جدید تحقیقات سے یہ پتا چلا ہے کہ فضلی سے بہت پہلے دکن میں اردو نثر کافی ترقی کر چکی تھی-

"کربل کتھا" یا "دہ مجلس" ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب "روضتہ الشہدا" کا ترجمہ ہے- سنہ تالیف ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء ہے- فضلی نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ کتاب تالیف کرنے سے پہلے انہیں بہت پس و پیش ہوا کہ یہ کام ان سے بہ خوبی انجام پا بھی سکے گا یا نہیں-

ایک دن خواب میں سید الشہدا حضرت امام حسینؓ کی طرف سے اس کے لئے ہدایت ملی- مولانا احسن مارہروی لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر فیلن یا مولوی کریم الدین نے لکھا ہے کہ "اس کتاب کو تمام میں نے دیکھا- وہ میرے پاس موجود تھی- "مشفق خواجہ نے ایک مضمون میں لکھا ہے:
یہ کتاب دلی یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو گئی ہے- بہرحال' عبارت کا نمونہ یہ ہے' جو کتاب کے دیباچہ سے ماخوذ ہے:

"اس کا سبب تالیف کا یہ تھا کہ قبلہ حقیقی اور کعبہ تحقیقی میرے نواب مستطاب معلی القاب' اعنی نواب بابا ام اشرف علی خاں سلمہ اللہ الملک المنان ہر سال تعزیہ ابو عبداللہ الحسین علیہ الصلوۃ والسلام کا بخلوص نیت اندرون محل بوجہ احسن بجا لاتا تھا' اور بندۂ حقیر پر تقصیر حسب الارشاد اس قبلہ گاہ کے روضتہ الشہدا کا خلاصہ کہ سب نکتہ سبحان مناقب شاہ لافتی نے اور سب دقیقہ فہمان مصائب سید الشہدا نے واقعہ شہادت کربلا کا اس میں لکھا ہے' سناتا تھا- لیکن معنی اس کے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے" اور فقرات پر سوز و گداز اس کتاب مذکورہ کے بہ سبب لغات فارسی ان کو نہ رلاتے تھے- اکثر اوقات بعد کتاب خوانی' سب یہ مذکور کرتیں کہ صد حیف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے' اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے ہیں- ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من و عن ہمیں سمجھاوے اور ہم سی بے سمجھوں کو سمجھا کر رلاوے- مجھ احقر الفقرا کی خاطر میں گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینی عبارات اور حسن استعارات ھندی قریب الفہم عامہ مومنین و مومنات کیجئے تو بموجب اس کلام بانظام کے من بکی علی الحسین او تباکا وجبت لہ الجنۃ (یعنی جو شخص رویا اوپر حسین کے یا جس نے رونے کی شکل بنائی' اس کے واسطے جنت واجب ہو گئی) بڑا ثواب لیجئے- کیوں کہ اس فائدہ سبحانی اور اس مائدہ ربانی سے زن و مرد پیروجوان' خوانده و ناخوانده' اور خردوکلان کو بہرہ فاضل اور نصیبہ کامل ہوے' اور ہر ایک بے خبر اس درد پر سوز اور اس خبر غم اندوز کو سن کر اور سمجھ کر روئے-

اس کتاب کے بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ "وہ مجلس" جس میں اصل میں بارہ مجلس ہیں' اردو نثر کی ایک کامل کتاب تو نہیں کہی جا سکتی' البتہ اس زمانے کی اردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے- عبارت میں خامی ہے' جیسا کہ ابتدائی کام میں ہوا کرتی ہے- جملے پیچیدہ' پر تصنع اور مقفی ہیں-(۱)

تاریخ ادب اردو' رام بابو سیکسینہ' اردو ترجمہ' حصہ نثر' صفحہ ۳-

مرزا سودا

شمالی ہند میں قدیم اردو نثر کے سلسلے میں فضلی کے بعد مرزا سودا کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے۔ سودا کا انتقال ۱۷۸۱ء میں ہوا۔ وہ اصل میں شاعر تھے۔ لیکن انہوں نے اردو نثر میں اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ لکھا ہے۔ سنہ تصنیف ۱۱۸۰ھ/۶۷-۱۷۶۶ء ہے۔ اب یہ سودا کے مطبوعہ کلیات میں دیوان مراثی کے ساتھ ہے۔ یہ دیباچہ مختصر سہی' لیکن اسے اس زمانے کی اردو نثر کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے' اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں اردو نثر کا طرز کیا تھا۔ اس میں آج کل کی اردو نثر کی طرح صرف و نحو کی پابندی مطلق نہیں کی گئی۔ عبارت مقفیٰ و مسجع ہے۔ تشبیہات و استعارات بہ کثرت استعمال کئے گئے ہیں۔

عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے' جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامہ دو زبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر تحریر پائے' لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کروں' تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفرین رہوں۔ مطلع:

قیمت و قدر شناسا ہی سے پہنچے ہے بہم
ورنہ دریا میں خزف بھی نہیں گوہر سے کم

یہ طرز اگرچہ آج کل کے زمانہ میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے' لیکن خود سودا کے زمانے میں اسی کو کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ مضمون سینے میں پیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے۔ جس وقت زبان پر آیا' فریاد بلبل ہے واسطے گوش داد رس کے۔ غرض جس اہل سخن کا در منصفی زینت لب ہے' سر رشتہ حسن معانی کا اس کلام کے اس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہیے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے' ورنہ گزند زہر آلود سے بے اجل

کا ہے کو مرے۔"

مولانا شاہ رفیع الدینؒ

سودا کے دیباچہ کے بعد اردو نثر نگاروں میں مولانا شاہ رَفیع الدین کا ذکر آتا ہے۔ آپ شاہ ولی اللہ' محدث دہلویؒ کے فرزند رشید تھے۔ سنہ وفات معلوم نہیں۔ آپ نے ۱۲۰۳ھ/۱۷۷۹ء میں قرآن مجید کا اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ لیکن وہ ترجمہ اس قدر تحت اللفظ اور بے محاورہ ہے کہ پڑھنے میں بڑی الجھن ہوتی ہے اور آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"اے جماعت جنوں اور آدمیوں کی' کیا نہ آئے پاس تمہارے پیغمبر تمہیں میں سے' بیان کرتے تھے اوپر تمہارے نشانیاں میری' اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اس دن تمہاری کی سے۔ یہ کہا کہ انہوں نے گواہی دی ہم نے اوپر جانوں اپنی کے' اور فریب دیا تھا زندگانی دنیا کی نے' اور گواہی دی انہوں نے اور جانوں اپنی کے' یہ کہ تھے وہ کافر۔ یہ اس واسطے نہیں ہے کہ پروردگار تیرا ہلاک کرنے والا' بستیوں کا ساتھ ظلم کے۔ اور لوگ اس کے غافل ہوں' اور واسطے ہر ایک کے درجے ہیں اس چیز سے کہ کیا ہے انہوں نے' اور نہیں پروردگار تیرا غافل اس چیز سے کہ کرتے ہیں' اور پروردگار تیرا بے پروا ہے' مہربانی والا' اگر چاہے لے جاوے تم کو' اور جگہ پر بٹھاوے پیچھے تمہارے جس کو چاہے' جیسا کہ پیدا کیا تم کو قوم اور (دوسری) سے۔

اس زمانہ میں فارسی اور عربی کے ترجمہ میں یہی طریقہ رائج تھا۔ مندرجہ بالا ترجمہ کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے غالباً مولانا نے اس میں اور زیادہ احتیاط سے کام لیا' تاکہ کسی لفظ کے معنی ادھر ادھر ہونے نہ پائیں' اور گناہ کا باعث نہ بنیں۔

شاہ عبدالقادرؒ

شاہ عبدالقادرؒ بھی شاہ ولی اللہ کے صاجزادے تھے۔ آپ نے بھی ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں قرآن مجید کا اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی تحت اللفظ ہے' اور وہی انداز ہے' جو شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمہ کا ہے' لیکن اس میں ذرا محاورہ کا خیال رکھا گیا ہے اور لفظی پابندی سے ادائے مفہوم پر قدرے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ پڑھنے میں الجھن بھی ذرا کم ہوتی ہے۔ اس میں شاہ عبدالقادرؒ نے ایک چیز کا اضافہ کیا ہے کہ ترجمہ پر تفسیری حاشیئے بھی لکھے ہیں' اور اس کا نام موضع القرآن رکھا ہے۔

ترجمے کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"اے جماعت جنوں اور انسانوں کی کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول تمہارے اندر کے۔ سناتے تم کو میرے حکم اور ڈراتے اس دن کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے مانے اپنے گناہ' اور ان کو بہکایا زندگی نے' اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر۔ یہ اس واسطے کہ تیرا رب ہلاک کرنے والا نہیں بستیوں کو ظلم سے' اور وہاں کے لوگ بے خبر ہوں' اور ہر کسی کو درجے ہیں اپنے عمل کے اور تیرا رب بے خبر نہیں' ان کے کام سے اور تیرا رب بے پروا رحم والا' اگر چاہے تم کو لے جاوے۔ اور پیچھے تمہارے قائم کرے جس کو چاہے۔ جیسا کہ تم کو کھڑا کیا اوروں کی اولاد سے' جو تم کو وعدہ دیا' سو آنے والا ہے۔ اور تم تھکا نہ سکو گے۔ تو کہہ لوگو کام کرتے رہو اپنی جگہ۔ میں بھی کام کرتا ہوں اب آگے جان لو گے کس کو ہے آخر گھر' مقرر بھلا نہ ہوگا بے انصافوں کا' اور ٹھہراتے ہیں اللہ کا اس کی پیدا کی کھیتی اور مواشی میں ایک حصہ۔ پھر کہتے ہیں یہ حصہ اللہ کا ہے اپنے خیال پر۔ اور یہ ہمارے شریکوں کا۔ سو جو ان کے شریکوں کا ہے' سو نہ پہنچے گا اللہ کی طرف اور جو اللہ کا ہے' سو پہنچے گا ان کی شریکوں کی طرف' کیا برا انصاف کرتے ہیں۔"

شاہ عبدالقادرؒ کا یہ ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمہ کی بہ نسبت زیادہ مقبول ہوا۔

میر محمد حسین عطا خان تحسین(۱)

شمالی ہند میں اس زمانہ میں میر محمد حسین عطا خان تحسین کے نام سے ایک اور نثر نگار گزرے ہیں۔ وہ اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ وہ خوش نویس بھی تھے۔ اس لئے "مرصع رقم" کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ کلکتہ میں انگریز جنرل ایل۔ ایف۔ اسمتھ کے ساتھ کئی سال تک منشی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن جنرل اسمتھ کے انگلستان چلے جانے کے بعد وہ پٹنہ چلے گئے' اور دیوانی عدالتوں میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر اپنے والد کے انتقال کے بعد فیض آباد جا کر نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۶ء۔ ۱۷۷۵ء) کے ہاں ملازم ہو گئے۔ نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے اور جانشین نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵۔ ۱۷۹۷ء) کے متوسل رہے۔

تحسین نے اپنے فیض آباد کے قیام کے دوران میں مشہور فارسی قصہ "چہار درویش" کا "نوطرز مرصع" کے نام سے اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ سنہ تالیف صحیح طور پر معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ انہوں نے اس کی تالیف کلکتہ کی ملازمت کے دوران ہی میں شروع کر دی تھی' اور نواب آصف الدولہ کے دربار میں سنہ ۱۷۹۷ء سے قبل ختم کی۔

تحسین نے "نو طرز مرصع" بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھی ہے- لیکن اس کی زبان و بیان ثقیل، مرصع، پر تکلف اور پیچیدہ ہونے کے سبب زیادہ مقبول نہیں ہوئی- اس کے علاوہ تحسین نے اس ترجمہ میں عربی، فارسی الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات بھی اس قدر کثرت سے استعمال کئے کہ بعض جگہ عبارت دشوار فہم اور ذوق سلیم پر بار گزرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے- یہی وجہ ہے کہ اس کے صرف دو تین ایڈیشن ہی شائع ہو سکے، اور اب وہ بالکل نایاب ہے- برٹش میوزیم میں البتہ اس کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں- نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

"بدر ایک لمحہ کے وہ ماہ شب چہار دھم رونق افزا حدیقہ فردوس نما کے ہو کر اوپر مسند زر بفت فقروی کے جلوہ آرا ہوئی- واہ جی واہ، جس وقت وہ قمر طلعت داخل ہوئی باغیچہ نمونہ جنت کی ہوئی عطر گلاب رخسارہ زلیخائے شب مہتاب کا تقویت بخش دماغ تماشائیوں کا ہو کے زینت آرا بزم کامرانی کا ہوا، یوسف عکس بیاض نگینہ ہائے الماس انجم اوپر خاتم مینا رنگ سبزہ زمیں خلد آمین کے زیب افزا دیدہ نورانی کا ہوا-"

محمد حسین کلیم دہلوی

محمد حسین کلیم دہلوی میر حسن متوفی ۱۷۸۶ء کے ہم عصر تھے- میر حسن نے اپنے "تذکرۃ الشعرا" میں لکھا ہے کہ کلیم نے شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی مشہور کتاب "فصوص الحکم" کا اردو نثر میں ترجمہ کیا ہے- "در ہندی نثر کتاب ایجاد کردہ-" وہ ترجمہ غالباً کبھی شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آیا- اس کا صرف ایک فقرہ تبرک کی شکل میں ہمیں ملتا ہے- وہ فقرہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے کے متعلق ہے: "کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر، آج کے بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر ایسی دولت سے زین ہار، فا عتبروا یا اولی الابصار-" کلیم کا سنہ وفات معلوم نہیں-

۱- ڈاکٹر گیان چند کی تحقیق کے مطابق تحسین کا نام میر محمد عطا حسین خان نہیں بلکہ میر محمد حسین عطا خان ہے ملاحظہ ہو "اردو کی نثری داستانیں، صفحہ ۱۴۵-

انشا

سید انشاء اللہ خان بنیادی طور پر ایک شاعر تھے' اس لئے ان کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ حصہ نظم میں کیا گیا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد پہلے ایران سے کشمیر آئے' پھر دہلی میں آ کر بس گئے۔ حکومت مغلیہ کا زوال شروع ہوا' تو ان کے والد' جو شاہی طبیب تھے' مرشد آباد چلے گئے۔ انشاء اللہ خان کی ولادت وہیں ہوئی۔ سنہ ولادت غالباً ۱۷۵۶ء ہے۔ جوان ہوئے تو فارغ التحصیل ہو کر دہلی چلے گئے' اور شاہ عالم کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد لکھنؤ گئے' اور نواب سعادت علی خاں کے مصاحب ہوئے۔

انشا نے اردو نثر میں ۱۸۰۳ء میں رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی کے نام سے ایک کہانی لکھی' جس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہ آنے پائے۔ اس کا ذکر غالباً سب سے پہلے مولانا آزاد نے اپنی کتاب "آب حیات" میں کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی اس پر بحث کی ہے۔ وہ کتاب اب نایاب ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اس کی مکمل نقل حاصل کر کے پہلے مجلہ "اردو" بابت اپریل' ۱۹۲۶ء میں' پھر ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے کتابی شکل میں بھی چھپوا کر شائع کر دی ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں:

> "سید انشاء اللہ خاں کی وہ داستان' جس میں ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہیں آنے دیا' مشہور تو بہت ہے' مگر ملتی کہیں نہ تھی۔ آخر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی پرانی جلدوں میں اس کا پتا لگا۔ مسٹر کلنٹ' پرنسپل لا مارٹین کالج' لکھنؤ کو اس کا ایک نسخہ موتی محل لائبریری سے دستیاب ہوا تھا' جسے انہوں نے سوسائٹی کے رسالے میں طبع کرا دیا۔ ۱۸۵۲ء میں ایک حصہ طبع ہوا' اور دوسرا حصہ ۱۸۵۵ء میں۔"

انشا نے اس کا سبب تالیف بیان کیا ہے:

> "ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہیے' جس

میں ہندوی (اردو) چھٹ اور کسی بولی کی پوٹ (آمیزش) نہ ملے' تب جا کے میرا جی
پھول کی کلی کے روپ سے کھلے' باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو۔
اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے دھرانے بوڑھے گھاگ یہ
کھڑاک لائے' سرہلا کر منہ تھتھا کر ناک بھوں چڑھا کر گلا پھلا کر لال لال آنکھیں
پھرا کر لگے کہنے' یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن
بھی نہ ٹھس جائے' جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں'
جوں کا توں وہی ڈول رہے' اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے
ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجلا کر کہا' میں کچھ ایسا انوکھا بڑ بولا
نہیں' جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سری
بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی باتیں کیے جاؤں' مجھ سے نہ ہو سکتا' تو بھلا منہ سے کیوں
نکالتا' جس ڈھب سے ہوتا' اس بکھیڑے کو ٹالتا۔ اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں
آپ کو جتاتا ہے' اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے ہیں (انشاء اللہ) کہہ سناتا ہے۔
دھنا ہاتھ منہ پر پھیر کر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں' اور آپ کو جتاتا ہوں' جو میرے داتا
نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں' جو دیکھتے ہی
آپ کے دھیان کا گھوڑا' جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہرنوں کے روپ
میں ہے' اپنی چوکڑی بھول جائے۔"

کتاب کی ضخامت کل پچاس صفحہ کی ہے' لیکن مصنف کا یہ بڑا کمال ہے کہ جہاں عربی فارسی
الفاظ اردو زباں کے "جزو لاینفک" ہیں' وہاں ایک لفظ بھی دیسی زبان کے علاوہ نہیں آنے پایا۔
فارسی میں فردوسی نے غالباً سب سے پہلے اس قسم کا تجربہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنی شہر آفاق مثنوی
"شاہ نامہ" میں یہ التزام کیا ہے کہ ایک لفظ بھی عربی کا نہ آنے پائے۔ فارسی زبان تو خیر اردو
کے مقابلہ میں بہت پرانی اور ترقی یافتہ ہے' اس لئے ممکن ہے' فردوسی کو اس قدر مشکلات کا
سامنا نہ کرنا پڑا ہو' جس قدر کہ انشاء اللہ خان کو کرنا پڑا ہوگا۔ انشاء اللہ کے سامنے جو مسئلہ تھا'
وہ صرف عربی کے الفاظ سے احتراز کرنا نہ تھا' بلکہ فارسی الفاظ سے بھی پرہیز کرنا تھا۔ بہرحال
انشاء اللہ خاں کی یہ کوشش قابل قدر ہے' اور کمال فن کا مظاہرہ ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب
ذیل ہے:

"ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے بھلاوے میں ڈال کر یہ پوچھا' گروجی
گسائیں مہندر گر نے جو بھبوت باپ کو دیا تھا' وہ کہاں رکھا ہے' اور اس سے کیا

ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے کہا، میں توری واری، تو کیوں پوچھتی ہے۔ رانی کیتکی کہنے لگی، آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں۔ جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھ کو پکڑ نہ سکے رانی کام لتا نے کہا، وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے، ایسے لٹکے کسی برے دن کے سمہال لینے کو ڈال رکھتے ہیں۔ کیا جانے کوئی گھڑی کیسی ہے، کیسی نہیں۔ رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا منہ تھتھا کے اٹھ گئی، اور دن بھر بن کھائے پڑی رہی۔ مہاراج تے جو بلایا تو کہا، مجھے رچ (بھوک) نہیں ہے۔ تب رانی کام لتا بول اٹھیں، اجی کچھ تم نے سنا بھی، بٹی تمہاری آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے وہ بھبوت گروجی کا دیا ہوا مانگتی تھی۔ میں نے نہ دیا اور کہا، بٹی یہ لڑکپن کی باتیں اچھی نہیں، کسی برے دن کے لئے گروجی دے گئے ہیں، اسی پر مجھ سے روٹھی ہے۔ بہتیرا بہلاتی پھسلاتی ہوں، مانتی نہیں۔ مہاراج نے کہا، بھبوت تو کیا، مجھے تو اپنا جی بھی اس سے پیارا نہیں، اس کے ایک گھڑی بھر کے بھل جانے پر ایک جی تو کیا، لاکھ جی ہوں تو دے ڈالئے، رانی کیتکی کو ڈبیا میں سے تھوڑا سا بھبوت دیا، کئی دن تک آنکھ مچولی اپنے ماں باپ کے سامنے سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی، سب کو ہنساتی رہتی جو سو سو تھال موتیوں کے نچھاور ہوا کئے، کیا کہوں، ایک چہل تھی جو کہئے تو کروڑوں پوتھیوں میں جیوں کی تیوں نہ آ سکے۔"

یہ اٹھارویں صدی عیسوی کے ربع اول کی اردو نثر کا نمونہ ہے۔ اس میں قدامت کی بو تو ضرور ہے، مگر روبہ ترقی معلوم ہوتی ہے۔ یہ نثر اس سے پہلے کے زمانہ کی نثر کے مقابلہ میں بہت زیادہ صاف ہے۔ طرز تو عہد کا تقاضا ہے، اس سے بہتر اس وقت نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ زبان میں جو گنجلک ہے، وہ شاید انشاء اللہ خاں کے اس التزام کی وجہ سے ہے کہ عربی فارسی الفاظ سے احتراز کیا جائے۔ آج اس ترقی کے دور میں بھی اگر بالفرض کوئی مصنف اس قسم کا تجربہ کرنا چاہے تو زبان لا محالہ عیسر الفہم ہو جائے گی۔ خواہ مخواہ اس میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ہندی اور سنسکرت کے نامانوس الفاظ ٹھونسنا پڑے گا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اسلامی تہذیب، تمدن اور روایات کی بنا پر اردو میں عربی فارسی الفاظ اس طرح رس بس گئے ہیں کہ ان کو اب کسی طرح خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اس کی کوشش کرے، تو سوائے ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

انشا کی ایک اور کتاب "دریائے لطافت" کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے۔ کتاب اگرچہ فارسی میں ہے۔ لیکن اس کا موضوع اردو ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ اردو کی قواعد و محاورہ کے متعلق ہے، اور انشا کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا حصہ منطق و معانی و عروض پر ہے، جو محمد حسن

قتیل کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں مرتب ہوئی اور پہلی مرتبہ ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اسے دوبارہ ایڈیٹ کر کے اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اردو سے دوبارہ شائع کیا۔ کتاب کے پہلے حصہ میں اردو نثر کے بھی نمونے موجود ہیں۔ اس حصے کے تیسرے باب میں نواب عماد الملک' بھاڑا مل' مرزا صدر الدین صفاہانی اور ملا عبدالفرقان کی اردو نثر میں دلچسپ تقریریں ہیں خصوصاً بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں بہت پرلطف ہیں۔ بی نورن اور غفر غینی کی تقریروں کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"کلام بی نورن کسبی باشندۂ کوچہ بلاقی بیگم با میر غفر غینی دہائی۔

"اجی آؤ میر صاحب' تم تو عید کے چاند ہو گئے' دلی میں آتے تھے' دوپہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے' لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کہ کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو' کہیں آٹھوں(!) میں بھی نہ چلو' تمہیں علی کی قسم' آٹھوں میں مقرر چلیو۔

جواب از میر غفر غینی دہائی:

"اجی بھولی نورن' یہ کیا بات فرماتی ہو' تم تو اپنے جیوڑے کی چین ہو' پر کیا کہیں۔ جب سے دلی چھوڑی ہے۔ کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے' اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے سنئے' ریختے میں استاد میاں ولی ہوئے' ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی' پھر میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم۔ پھر سب سے بہتر مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر صاحب' پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب برد اللہ مرقدہ جو میرے بھی استاد تھے' وہ لوگ تو سب مر گئے' اور ان کی قدردانی کرنے والے بھی جان بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں' ویسے ہی شاعر ہیں اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں ایسی پاک صاف اور شستہ ہیں کہ آج کل کی بول چال اس سے زیادہ فصیح نہیں ہو سکتی...... باوجود اس قدر زمانہ گزرنے کے اور زبان کے منجھے اور ترقی پانے کے جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں' اس میں کہیں حرف گیری کا موقع نہیں' بلکہ ویسی فصیح اور پاک صاف اردو اب بھی ہر شخص نہیں لکھ سکتا۔

مرزا قتیل

مرزا قتیل (م ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) نے انشا کے ساتھ مل کر "دریائے لطافت" لکھی تھی۔ اس

کتاب کے دوسرے حصہ میں انہوں نے اردو نثر میں کہیں کہیں مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو' جس میں حرف نون کہیں نہیں آنے دیا :

"جس کا جی چاہے ہمارے پاس آئے' گھر ہے اس کا' اور جو کوئی آتا آتا یکبارگی رہ جائے تو ہم کو کیا غرض' اگر یہ چاہے کہ ہم سا بے لیاقت بھی کبھی کبھی آیا کرے تو یہ بات مشکل ہے' اس واسطے کہ عاصی پر از معاصی ایسا عہد کر بیٹھا ہے کہ اس گوشہ ہی کے بیچ اسی طرح جما رہے کہ اگر ہزار بار دورۂ کامل فلک ہشتم کا کہ جس کو خلق خدا کی کرسی کہتی ہے سر پر گزر جائے تو بھی اس جگہ سے اٹھ کر جو بہت جائے تو اس دوسرے حجرے تک جاوے سو بھی دیکھنا چاہیے۔ یہ بھی اس وقت کا ایک زٹل قافیہ ہے۔"

انشا کی تقلید میں مرزا قتیل نے بھی ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ انشا نے "رانی کیتکی" کی کہانی میں اس بات کی پابندی کی تھی کہ کوئی عربی فارسی لفظ نہ آنے پائے۔ مرزا قتیل نے یہ تجربہ کیا کہ نون کے بغیر لکھا جائے۔ "دریائے لطافت" کے علاوہ مرزا قتیل کے مکتوبات میں اردو نثر کا نمونہ ملتا ہے۔ ایک اقتباس دیکھئے :

"بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ جناب ہے کہ اس کو خدائے برتر نے اپنا پیغبر کیا' اور تمام فاضلوں اور عالموں اور آدمیوں کو اس کی امت کہا' سبحان اللہ اس بزرگ درگاہ کا دیکھنے والا ہوں کہ میری ہدایت کی راہ کا دکھلانے والا ہے' اور سعادت کی منزل کا حضر ہے۔"

شاہ اسمٰعیل شہید

شاہ اسمٰعیل شہید (پیدائش ۱۱۹۳ھ ر ۱۷۷۹ء) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت شاہ عبدالعزیز' شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے سید احمد رائے بریلوی کے ساتھ تحریک جہاد میں حصہ لیا۔ شاہ صاحب نے اصلاح معاشرہ کے بارے میں اردو نثر میں کئی کتابیں لکھیں جن میں سے تقویۃ الایمان بہت مشہور ہے۔ یہ کتاب بہت صاف اور سلیس زبان میں ہے صرف کہیں کہیں الفاظ کی بندش اور انداز میں پرانا رنگ پایا جاتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"ہر خاص و عام کو چاہیے کہ اللہ رسول ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اسی کو سمجھیں اور اسی پر چلیں' اور اسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں۔ سو سنا چاہیے کہ ایمان کے دو جز ہیں۔ خدا کو جاننا اور رسول کو رسول سمجھنا' اور خدا کو خدا سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا شریک کسی کو نہ سمجھے' اور رسول کا رسول

سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی راہ نہ پکڑے۔ اس پہلی بات کو توحید کہتے ہیں' اور اس کے خلاف کو شرک' اور دوسری بات کو اتباع سنت کہتے ہیں' اور اس کے خلاف کو بدعت۔ سو ہر کسی کو چاہیے کہ توحید اور اتباع سنت کو خوب پکڑے اور شرک و بدعت سے بہت بچے' کہ یہ دونوں چیزیں اصل ایمان میں خلل ڈالتی ہیں' اور گناہ ان سے پیچھے ہیں کہ وہ اعمال میں خلل ڈالتے ہیں۔"

سید اعظم علی اکبر آبادی

سید اعظم علی اکبر آبادی' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' آگرہ کے رہنے والے تھے۔ سنہ وفات معلوم نہیں۔ انہوں نے ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۸ء میں "سکندر نامہ" کا اردو ترجمہ کیا۔ سنہ ۱۲۴۰ھ/۲۸۲۴ء میں اردو نثر میں' "فسانہ سرور افزا" تصنیف کیا' جس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"احسان ایسے بادشاہ عادل اور شہنشاہ بازل کا کہ جس نے واسطے عبادت و معرفت اپنی ذات کے انسان ضعیف بنیان کے تئیں تہ خانہ ظلمات عدم سے نکال کر خلعت جواہر نگار حیات ابدی کا عنایت فرمایا' مقدور کس بشر کا ہے کہ زبان بیاں سے ادا کر سکے' اور شکر ایسے ہادی برحق و کریم کے مطلق کا کہ ایسے مشت خاک سراسر ناپاک کے تئیں تمامی مخلوقات و موجودات سے ممتاز و سرفراز کر کے نور عقل و شمع ایمان سے منور کیا' طاقت کس کی ہے جو ایک حرف اس دفتر بے پایاں سے بیان کرے۔ ایسا خداوند حقیقی ہے کہ ہر ذی حیات کو بے رعایت سلسلہ طاعت و عبادت کے' شام و صباح وظیفہ خوار نعمتوں بے قیاس کا رکھتا ہے' اور عجب رزاق مطلق ہے کہ مور سے مار تلک کسی جاندار کو اپنے مائدہ فضل و نوال سے محروم و مایوس نہیں کرتا ہے۔"

اوپر کا اقتباس پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو نثر آگے کی طرف ترقی کرنے کی بجائے ترقی معکوس کر رہی ہے۔ ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ اردو نثر میں بھی بتدریج اپنی قدامت کو چھوڑ کر نئی روش پر چلنے لگی تھی۔ زبان صاف و سلیس اور انداز بیاں سادہ ہونے لگا تھا۔ لیکن سید اعظم علی اکبر آبادی کے ہاں یکایک اردو نثر پھر قدیم روش پر چلنے لگ گئی۔ "فسانہ سرور افزا" ان کی طبع زاد تصنیف ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربی یا فارسی سے ترجمہ کیا ہوا ہے۔ یہ شاید اس لیے' جیسا کہ مولانا حامد حسن قادری نے لکھا ہے:

"اس زمانے میں فارسی پڑھنے لکھنے کے سبب ادبیات فارسی کا جو طرز بیان ذہن نشیں ہوتا تھا' وہی انداز اپنی آزادانہ نگارش میں بھی پیدا ہو جاتا ہے" اس کو بدلنا اور سلاست و روانی پیدا کرنا اپنی اپنی افتاد طبع اور اقتضائے حال مطابق ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس عہد کا غالباً یہی ایک

نمونہ ایسا ہے، اس لئے ہم اسے مستثنیٰ قرار دے سکتے ہیں۔(۲)

حواشی

۱۔ آٹھوں کا میلا لکھنؤ کا مشہور تہوار ہے۔ (داستان تاریخ اردو۔ صفحہ ۱۷۳۔)
۲۔ داستان تاریخ اردو۔ صفحہ ۱۸۳۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ سرور (م ۱۲۸۴ھ ر ۱۸۶۷ء) اپنے عہد کے بہت بڑے نثر نگار گزرے ہیں۔ وہ شاعری بھی کرتے تھے' لیکن اردو ادب میں ان کی شہرت ایک نثر نگار کی حیثیت سے ہے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ نواب غازی الدین حیدر شاہ اودھ (زمانہ ۱۸۱۴ء۔ ۱۸۳۷ء) کا عتاب نازل ہوا تو ۱۸۲۴ء میں انہوں نے کانپور کا سفر اختیار کیا۔ اس کے بعد ۱۸۴۷ء میں جب واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے' تو پھر لکھنؤ واپس آئے اور درباری شاعر مقرر ہوئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب ہر طرف تباہی پھیلی' تو دوسرے اہل علم کی طرح وہ بھی پریشان رہے۔ ۱۸۵۹ء میں مہاراجہ بنارس نے از راہ قدردانی انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ اس کے بعد مہاراجہ الور اور مہاراجہ پٹیالہ نے انہیں کچھ دن مہمان رکھا' اور بیش بہا عطیے سے نوازا۔ ۱۸۶۳ء میں انہوں نے آنکھوں کے علاج کے سلسلے میں کلکتہ کا بھی سفر کیا۔ اس زمانے میں واجد علی شاہ مٹیا برج میں نظر بند تھے۔ ان سے جا کر ملے۔ کلکتہ سے پھر بنارس چلے گئے' جہاں ۱۸۶۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

فسانہ عجائب: اردو میں سرور نے سب سے پہلے اپنی مشہور کتاب "فسانہ عجائب" لکھی۔ اس کتاب کے سنہ تصنیف کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ رام بابو سکسینہ' مولانا حامد حسن قادری نیز ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتابوں میں اس پر طویل بحث کی ہے۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ زمانہ تصنیف ۱۲۴۰ھ ر ۱۸۲۴ء کے لگ بھگ ہے۔

فسانہ عجائب "سرور کا مایہ ناز کارنامہ ہے۔ دنیائے اردو میں اسی سے ان کا نام درخشندہ و تابندہ ہے۔ اس میں انہوں نے ایسا طرز تحریر اختیار کیا ہے جو اردو ادب میں ان ہی کا طرز ہو کر رہ گیا ہے۔ ممکن ہے وہ طرز دیکھ کر بعض لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہوں' لیکن وہ وقت کا آئینہ دار ہے۔ سرور کا زمانہ وہ تھا جب معاشرہ میں تصنع۔ اور تکلف عیب نہیں بلکہ ہنر سمجھا جاتا تھا۔ اردو نثر عموماً مقفیٰ و مسجع ہی ہوتی تھی۔ لوگ عربی فارسی سے واقفیت رکھتے تھے۔ اس لئے

عبارت میں عربی فارسی الفاظ کے استعمال میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ مصنف کی اعلیٰ صلاحیت اور قابلیت کی داد دی جاتی تھی' اور پڑھنے والا قائل ہو جاتا تھا کہ ہاں لکھنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ سرور بھی زمانے کی روش سے ہٹ کر اور کچھ نہیں لکھ سکتے تھے۔ اور نہ وہ انداز ان کے کمال فن کی دلیل بن سکتا تھا۔ سرور نے بے شک تصنع سے کام لیا اور مقفی و مسجع عبات لکھی۔ ہمارے خیال میں سرور سرور نہ ہوتے اگر وہ اپنی کتاب میں کوئی اور انداز تحریر اختیار کرتے۔ سرور نے اپنی عبارت میں عربی فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں۔ کیوں کہ اس کے بغیر ان کا مقصد پورا نہ ہو سکتا تھا۔ ان کا مقصد عبارت کو بھاری بھرکم اور پرشکوہ بنانا تھا۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :

"گرہ کشایان سلسلہ سخن و تازہ کنندگان فسانہ کہن' یعنی محرران رنگین تحریر و مورخاں جادو تقریر نے اشب جہندہ قلم کو میدان وسیع بیان میں یا کرشمہ سحر ساز و لطیفہ ہائے حیرت پرواز گرم عنان و جولان یوں کیا ہے کہ سر زمین ختن میں ایک شہر تھا مینو سواد' بہشت نژاد پسند خاطر محبوبان جہاں' قابل بود و باس غرباں زماں' شمیم صفت اس کی معطر کن دماغ جان' مسکن التہاب قلب' دافع خفتان' زمیں اس کی رشک چرخ بریں' رفعت و شان چشمک بلندی' فلک ہفتمیں' گلی کوچہ خجلت دہ گلشن آبادی' گلزار بسان تختہ چمن' بازار ہر ایک بے آزار مصفا ہموار' دکاں نفیس مکان نازک پائدار' خلق خدا با خاطر شاد اسے فسحت آباد کہتی تھی۔ سب طرح کی خلقت رغبت سے اس میں رہتی تھی۔ والی ملک وہاں کا شاہ گردون و قارہ پر تمکین' با افتخار' سکندر سے ہزار خادم' دارا سے لاکھ فرمان بردار' قباد شوکت' کاوس حشم' مالک تاج و تخت والا مرتبت' عالی مقام' شاہنشاہ فیروز بخت کے نام' موج بخشش سے اس بحر جود و عطا کے سائلان لب تشنہ سیراب' اور نائرہ غضب کے شعلے سے دشمن بد باطن جگر سوختہ بیتاب' دبدبہ وار وہی غلغلہ عدالت سے دشمن دوست جانی' چور مسافر کے مال کا نگہبان' ڈکیتوں کو عہدہ پاسبانی' ملک وافر' سپاہ افزوں از قیاس' خزانہ لا انتہا' وزیر و امیر جان فشاں' تاج بخش و باج ستان' محتاج اور فقیر کا شہر میں نام نہیں' داد و فریاد' آہ و نالے سے کسی کو کام نہیں' رعیت راضی' سپاہ جان نثار شاداں' دشمن خائف' شمع کا چور سر محفل لرزاں۔ اس نام سے یہ ننگ تھا کہ امیروں کا چور محل نہ ہونے پاتا تھا' دزد حنا کا رنگ نہ جمتا تھا۔ سر دست ہاتھ باندھا جاتا تھا آنکھ چرانے سے ہم چشم چشمک کرتے تھے۔ کار خیر سے اگر کوئی جی چراتا تو نامردی کی تہمت اس پر

دھرتے تھے۔ لیکن باین حکومت و ثروت کا شانہ امید کا چراغ گل' اولاد بالکل نہ تھی۔ خواہش فرزند در دل' نہ ہونے کی خواہش متصل۔"

اگرچہ "فسانہ عجائب" سرور کی طبع زاد تصنیف ہے۔ لیکن اس کے اجزائے ترکیبی دوسرے رائج الوقت قصوں کہانیوں سے ماخوذ ہیں۔ "بادشاہ کے پیری میں اولاد ہونا' نجومیوں کا زائچہ میں حوادث کی پیشن گوئی' طوطے سے ایک حسین شہزادی کا ذکر سن کر غائبانہ عشق' طوطے کی راہنمائی میں اس کی تلاش' ہرن کے تعاقب میں راہ گم کرنا' جادو گرنی کے دام پھنسنا ایک اور شہزادی سے ملاقات' محبوبہ کو رہا کرانا یہ سب ہندوستانی قصوں کا مشترک اثاثہ ہے۔ وصل کے بعد سب کا بچھڑ جانا' دیو سے لڑائی اور اس کے بعد طوطے کی مدد سے سب کا یک جا ہونا' یہ بھی پرانے قصوں میں جا بجا دکھایا جاتا ہے۔"(۱) یہ سب فوق فطرت عناصر ہیں' اور پرانے قصوں کہانیوں کے لازمی جز ہیں۔ اس کے باوجود قاری ایک قسم کا لطف محسوس کرتا ہے' اور جب تک کتاب ہاتھ میں لے کر پڑھتا ہے' ایک عالم تخیل میں پرواز کرتا رہتا ہے۔ اس وقت وہ اس دھرتی کا انسان نہیں رہتا' بلکہ دیو' جن' بھوت' جادوگر' اور دوسرے عجائبات میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے اس قسم کی کتابیں ذہنی طور پر اس دنیا سے وقتی طور پر فرار حاصل کرنے کے لئے بڑی مدد دیتی ہیں۔ یہ صحیح ہے جیسا کہ رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے: یہ نوجوان طبیعتوں کو بہت مرغوب ہے' مگر سن رسیدہ لوگ نفس قصہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے' البتہ اس کی زبان اور مصنوعی عبارت کو اکثر پسند کرتے ہیں۔(۲)

بقول ڈاکٹر گیان چند: فسانہ عجائب کی عظمت دو وجہوں سے ہے۔ اس کی زبان اور معاشرت کا بیان۔ اس کا دیباچہ گو قصے کا جز نہیں' لیکن اس میں چند صفحوں میں جو لکھنؤ کی معاشرت کے لوازمات گنا دیئے گئے ہیں' وہ ادب میں مستقل جگہ پا گئے ہیں۔ کتنے ماہرین فن کا نام قلبند کر کے انہیں دوام عطا کر دیا ہے۔(۳) اس میں اس زمانہ کے شہر لکھنؤ کی سوسائٹی' وہاں کے طرز معاشرت' امراء و روسا کی وضعداریوں' ان کے پر تکلف جلسوں' شہر کے رسوم و رواج' کھیل تماشوں' دلچسپ مناظر' مختلف پیشوں اور اہل کمال کے حالات' بازاروں کی چہل پہل' سودا فروشوں کی آوازوں وغیرہ کی دلکش اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔"(۴)

سرور نے "فسانہ عجائب" کے دیباچہ میں میرا من اور ان کی کتاب "باغ و بہار" پر بڑی چوٹیں کی ہیں:

"اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے' یا اس فسانہ کو بنظر نثاری کسی کو سنائے۔ اگر شاہجہاں آباد کہ مسکن اہل زباں' کبھی بیت السلطنت

ہندوستان تھا، وہاں چندے بود و باش کرنا، فصیحوں کو تلاش کرنا، فصاحت کا دم بھرنا، جیسا میرا من صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے دین و حصہ میں یہ زبان آئی ہے، دلی کے روڑے ہیں کہ محاوروں کے ہات پاؤں توڑے ہیں، پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر کہ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے، مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے، بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے، کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔"

لیکن ان کا یہ لعن طعن ہنگامہ آرائی کا باعث بنا، اور اس کے جواب میں خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی نے ۱۸۶۰ء میں "سروش سخن" کے نام سے ایک قصہ لکھا۔ پھر اس جواب کے جواب میں سرور کی حمایت میں جعفر علی شیون لکھنوی نے ۱۸۷۲ء میں "طلسم حیرت" کے نام سے ایک فسانہ لکھا

سرور سلطانی

سرور کی دوسری کتاب "سرور سلطانی" ہے جو انہوں نے واجد علی شاہ کے حکم سے ۱۸۴۷ء میں مرتب کی تھی۔ کسی نے شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ فارسی نثر میں "شمشیر خانی" کے نام سے لکھا تھا۔ "سرور سلطانی" اسی کا ترجمہ ہے۔ اس میں بھی سرور کا خاص اسلوب موجود ہے، لیکن اس کے باوجود اسے قبولیت عامہ نصیب نہ ہو سکی۔ عبارت مقفیٰ و مسجع ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

"دوسرے دن جس وقت تہمتیں مشرق (آفتاب) آغشۃ بخوں سمند نیلگوں (آسماں) پر سوار ہوا، سہراب رستم سے دوچار ہوا۔ آخر کار تہمتن نے نعرہ کیا۔ کوہ دماموں کا جگر پارہ کیا، اور سہراب کا کمر بند پکڑ کے سر سے بلند کر کے زمیں پر دے پٹکا، اور فورا کمر سے خنجر آبدار نکال اس کے سینہ کو چاک کر دیا۔ سہراب نے آہ سرد دل زخمی پردرد سے کھینچی اور کہا افسوس مشتاق دیدار پدر محروم و ناکام پر، دار ناپائیدار سے چلا، تہمتن شیر افگن نہ ملا۔ مگر اب تو مچھلی بن کر زیر قدم گاہ و زمیں پناہ لے جائے گا یا اختر ہو کر ملک ہفتمین پر اپنے تئیں چھپائے گا۔ میرا باپ کہیں منہ نہ موڑے گا۔ کسی طرح تجھ کو زندہ نہ چھوڑے گا رستم نے پوچھا اس کا کیا نام ہے۔ سہراب نے کہا رستم جہاں پہلوان ہے اور میری ماں دختر شاہ سمنگاں ہے۔ یہ سنتے ہی دنیا رستم کی نظر میں تیرہ و تار بن گئی۔"

سرور نے ۹۶ ۱۸ء میں نواب سکندر جہاں بیگم کے حکم سے ایک اور کتاب "شرر عشق" لکھی، جس میں بھوپال کے جنگل کے پرندوں کا عجیب و غریب واقعہ بیان کیا ہے، اس سال انہوں

نے "شگوفہ محبت" کے نام سے اور ایک کتاب لکھی۔ اس قصہ کو پہلے مہرچند کھتری نے لکھا تھا۔ سرور نے اس کو اپنے طرز میں لکھا۔ یہ دونوں کتابیں غیر مطبوعہ ہیں اسلئے نمونہ عبارت نہیں پیش کیا جا سکتا۔

گلزار سرور

سرور کی چوتھی کتاب "گلزار سرور" ہے۔ یہ فارسی کتاب "حدائق العشاق" کا ترجمہ ہے، اور مذہبی کتاب ہے۔ اس میں روح و عشق کا مناظرہ دکھایا گیا ہے۔ اس میں بھی سرور نے اپنا خاص اسلوب برقرار رکھا۔ شروع میں اپنا حال اور تالیف کتاب کا سبب بیان کیا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے :

"یہاں سے نقاش ثانی معترف نادانی، گردش دیدہ بلا رسیدہ، یار و دیار سے دور، رجب علی بیگ سرور اپنی گزشتہ داستان حیرت بیان لکھتا ہے۔ بارہ سو چوہتر (۱۲۷۴) ہجری شہر شعبان میں فلک نے وہ سامان کیا، گلزار لکھنؤ پر عین بہار میں خزاں آئی۔ اس شعبدہ باز کہن نے نئی نیرنگی دکھائی..... بے فکری اس جا کی دور دور مشہور تھی۔ بقول مشہور لنگوٹی میں پھاگ کھیلتی تھی، فاقہ کشی میں ڈنڈ پیلتی تھی۔ اپنے زعم میں قیصر و فغفور تھی۔ ایسی چمک دمک ہوئی کہ حد سے گزر گئی۔ ہر کمالے را زوالے، فلک کو اجاڑنا اس کا نام و نشاں بنا کے بگاڑنا منظور تھا، وگرنہ نہ بادشاہ کے دل میں نہ یہاں کی رعایا کی طبیعت میں فتور تھا۔"

حواشی

۱- اردو کی نثری داستانیں- ڈاکٹر گیان چند جین- صفحہ ۴۲۵-

۲- تاریخ ادب اردو (ترجمہ) حصہ دوم صفحہ ۲۴-

۳- تاریخ ادب اردو (ترجمہ) حصہ دوم صفحہ ۲۴-

۴- ایضاً- صفحہ ۲۴-

سدا سکھ لال

یہ ہندو اہل قوم ہیں۔ انہوں نے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء میں اردو نثر میں "مجموعہ قوانین" (ایکٹ ہائے سپریم گورنمنٹ) چار جلدوں میں مرتب کیا، جس میں ۱۷۹۳ء سے ۱۸۳۴ء تک کے جملہ ایکٹ ہائے مروجہ ممالک مغربی و شمالی شامل تھے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۶۴ء میں مطبع نور الابصار' آگرہ سے چھپی تھی۔ باقی تین جلدیں بھی اسی مطبع سے ۱۸۶۶ء میں چھپی ہیں۔ اس کے دیباچہ میں سے نمونہ عبارت ملاحظہ ہو :

"فائدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج ان کے بیان کی ہو۔ فی الواقع یہ جلدیں آئینہ نمائے انتظام جملہ سر رشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلیشہ کی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے باسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر باب میں کتنے قوانین مجاریہ وقت ہیں' اور کتنے منسوخ ہو گئے۔ واضح ہو کہ مصنف نے ترجمہ اردو میں کہ وہ مسلمہ گورنمنٹ اور مندرجہ گزٹ سرکاری تھا' کچھ تصرف نہیں کیا ہے۔ اگر بنظر سرسری کسی معنوں میں اصل انگریزی اختلاف صریح پایا' اس کو اسی اصل کے مطابق بہ ثبت نشان ذیل صفحے میں مرقوم کیا ہے۔"

فقیر محمد خاں گویا

فقیر محمد خاں گویا (م ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء) شاہان اودھ کے زمانہ میں فوج کے رسالدار تھے۔ انہوں نے ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں "بستان حکمت" کے نام سے۔ "انوار سہیلی" کا فارسی سے اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ ان کی بس ایک ہی یادگار ہے۔ "انوار سہیلی" کا ترجمہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی ان سے پہلے اور بعد میں کیا ہے' لیکن ان کا ترجمہ سب سے بہتر ہے۔ اس میں عام رواج کے خلاف قافیہ پیمائی کم ہے۔ لیکن الفاظ و فقرات کی ترتیب میں وہی پرانا ڈھنگ ہے۔ انہوں نے بعض جگہ اصل کتاب کے عربی فارسی الفاظ کو برقرار رکھا ہے۔ اس لئے پڑھنے میں ذرا دقت محسوس ہوتی ہے۔ دیباچہ کی عبارت دیکھئے۔ اس میں بھی تقریباً یہی رنگ ہے :

"آپ سنا چاہئے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاگرد ارشد شیخ ناسخ صاحب کے ہیں' اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے ہوئے تھے' اور وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعہ کا تھا۔ اور اس کے مصنف کی فکر رسا پر سب نے زباں ثنا کھولی تھی کہ سبحان اللہ مصنف اس کا عجیب حکیم بے مثل تھا۔ اور عجب کتاب تصنیف کی ہے کہ گنجینہ ہے اسرار الٰہی کا اور خزینہ ہے فیض غیر متناہی کا۔ بلکہ قرینہ اس پر دال ہے کہ جو کچھ اس نے بیان کیا ہے مظنہ ہے کہ بامداد الہام غیبی ہو۔ والا رائے انسان ضعیف البنیان کب کنہ کو اس قدر جزئیات عالم کے پہنچ سکتی ہے۔"

نیم چند کھتری

نیم چند کھتری ایک اور ہندو اہل علم ہیں۔ انہوں نے ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۷ء میں "قصہ گل با صنوبر" کا فارسی سے اردو نثر میں ترجمہ کیا ہے۔ نمونہ عبارت یہ ہے:

"بعد ازاں فقیر حقیر رضائے الٰہی پر خرسند نیم چند یوں لکھتا ہے کہ اس عالم ناپائدار میں کسی چیز کو قرار نہیں' اور نیستی پر سب کا مدار ہے۔ اس کی ذات لازوال کے واسطے بقا اور باقی سب کو فنا ہے۔ مگر ایک گلستان سخن کہ خزان جہاں اس کے گلوں پر نہیں آتی' چوروں کی چوری اور رہزنوں کی سرزوری سے یہ دولت کہیں نہیں جاتی۔ چمن اس کا ہمیشہ تازہ و خرم رہتا ہے' اور اس کی نہروں میں زلال زندگی بہتا ہے۔ اس کے مکان کی نیو کو حادثے کے بھونچال کا کچھ خطرہ نہیں ہوتا۔"

اس میں بھی قدیم روش کے مطابق قافیہ پیمائی کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ زبان کافی صاف اور سلیس ہے۔

مولوی قطب الدین دہلوی

مولوی قطب الدین دہلوی (م ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء" دہلی کے بہت بڑے عالم اور محدث تھے اردو نثر میں انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ ان میں سے صرف دو کا پتا چلتا ہے۔ ایک کا تاریخی نام "ظفر جلیل" ہے' جو قاضی القضاۃ شمس الدین محمد دمشقی کی کتاب "حصن حصین" کا ترجمہ ہے۔ کتاب کے نام سے سنہ تالیف ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء نکلتا ہے۔ اس کا نمونہ عبارت حسب ذیل ہے:

"حمد بے شمار ہے اس پاک پروردگار کے لئے کہ ہم کو توفیق دی اپنے ذکر کی۔ اور

راہ بتائی اپنی فکر کی۔ یا الٰہی درود و سلام بے حد نازل کر خاتم النبین شفیع المذنبین رسول امی پر اور ان کے اصحاب ابرار اور آل اطہار پر اور سب پر۔"

ان کی دوسری کتاب کا تاریخی نام ہے "مظاہر حق" جس سے سنہ تالیف ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء نکلتا ہے۔ یہ حدیث کے مشہور انتخاب "مشکوۃ المصابیح" کا اردو ترجمہ اور شرح ہے' اور چاروں جلدوں میں بڑی تقطیع کے دو ہزار صفحوں پر محیط ہے۔ مولوی قطب الدین کا یہ عظیم المرتبت کام ہے اور اردو میں سب سے پہلی جامع اور مکمل حدیث شریف ہے۔ ترجمہ اور شرح کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"اور روایت ہے واثلہ بن اسقع سے کہ' فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص نے کہ طلب کیا علم' اور حاصل ہوا اس کو' ہوگا واسطے اس کے دوہرا ثواب' اور اگر نہ حاصل ہوا اس کو علم' تو ہوگا واسطے اس کے ایک حصہ ثواب سے روایت کی یہ دارمی نے۔ (ف) دوہرا ثواب' ایک ثواب طلب کا اور مشقت کا کہ تحصیل علم میں کھینچی ہے' دوسرا ثواب حاصل ہونے علم کا' اور پڑھانے کا اوروں کو' یا ثواب عمل کا کہ علم پر کیا ہے' اور دوسرے کو ایک ثواب مشقت کا ہوگا۔ بہر تقدیر طلب علم میں رہنا چاہیے۔ اگر حاصل ہوا نور علی نور' وا الا طلب علم میں مرنا بھی سعادت ہے۔"

مولوی قطب الدین کے ترجمہ اور شرح میں اسلوب قدیم ہے۔ ترجمہ کا انداز بالکل وہی ہے' جو آج کے زمانہ ترقی میں ہمارے بعض دینی مدرسوں میں رائج ہے۔

سید فضل علی

سید فضل علی شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۴ء میں "مفید الاجسام" کے نام سے اردو نثر میں ایک کتاب لکھی ان کا ذاتی حال سوائے اس اقتباس کے جو مولانا احسن مارہروی نے "تاریخ نثر اردو" میں نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے' اور کہیں نہیں ملتا۔ وہ نمونہ حسب ذیل ہے:

"سید فضل علی بن شاکر علی ابن میر کرم علی رہنے والے قدیم شاہجہاں آباد کے' کہ استاد پڑھانے اور لکھوانے میں بادشاہ زادوں کے ہوتے آئے ہیں' اور اب بھی اسی خدمت پر بھائی صاحب علی درجات اور روزگار کے بیچ سرکار پادشاہ کے جلوہ گستر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت با کرامت رکھے۔ لیکن اپنی خرابی اور بربادی کا کیا بیان کروں اور کیا کہوں کہ سینہ قلم کا چاک چاک ہوتا ہے کہ پروردگار عالم نے بزرگوں

کی تقدیر میں ریاست اور امیری لکھی تھی اور اس نالائق رو خلائق کے مقسوم میں ندامت اور فقیری......

الغرض یہ بے سرو سامان اور سرگرداں ننگ خاندان اپنے کا ہوا' رات اور دن اس سوچ میں رہتا کہ ایام طفلی میں اس گروش کج رفتار و زمانہ ناسازگار نے مانند اوراق گنجفے کے سب عزیز و اقربا سے جدا کرکے ایسا ابتر پریشان بادِ بریان کیا کہ باگ اختیار کی ہاتھ سے چھوٹ گئی' اور رہوار برق رفتار حواس خمسہ کا تا در حیرانی جانے جنگل پر مستعد ہوا اور کچھ تدبیر بن نہ آئی۔ القصہ منزلیں طے کرتا رفتہ رفتہ کلکتے میں پہنچا کہ وہاں نہ کوئی یار نہ مددگار سوائے ذات پروردگار کے مونس و غمخوار نہ تھا۔ نو برس کے سن میں کہ ۱۲۳۰ ہجری تھے' اس کم سنی میں یہ خیال پیدا گزرا کہ کوئی فن کسب کسی طرح کا ہو اس کو اختیار کیجئے' اور دل سے سیکھئے' تاکہ آنکھوں میں لوگوں کی عزیز ہو جیئے۔ الحاصل اسپتال انگریزی ڈاکٹر کلاک یا ئن صاحب کہ نام ان کا آج بیچ کلکتے کے مشہور اور معروف ہے کہ فن جراحی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے' ان کی خدمت فیض درجات میں دست بستہ بہ ارادہ شاگردی حاضر ہوا' اور سوال کیا کہ امیدوار اس بات کا ہوں۔ میری زبانی یہ حال سن کر وہ صاحب فیلسوف ہمسر جالینیوس' استاد زمانہ اپنے فن کا یگانہ مہربان ہوا' اور یوں فرمایا کہ بہتر ہے' مگر رہنا یہیں ہوگا۔ جب تک اس کو خوب حاصل نہ کر لوگے تب تک پروانگی کہیں جانے کی نہ ملے گی۔ اوپر عاقلوں کے چھپا نہ رہے کہ اس فقیر نے' جو یہ اجزا جمع کئے ہیں' تو ان میں آسان عبارت اور سلیس ترکیب علاج دیکھ کر واسطے تعلیم بندیوں کے۔ اگر ان اجزا کو دقیق کر کے لکھتا' تو فہم مبتدی اس کو بوجھ نہ سکتا۔ یہ کتاب شہر ذی الحجہ میں تمام ہوئی۔ اور تاریخ دسویں روز دو شنبہ اور ۱۲۵۹ ہجری مطابق ۱۸۴۴ء۔"

اقتباس ذرا طویل پیش کیا گیا۔ اس لئے کہ اس میں مصنف اور تصنیف کے بارے میں کچھ کیفیت درج ہے۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نثر اردو ترقی کی طرف گامزن ہے لیکن ابھی تک زبان و بیان میں اغلاق ذرا باقی ہے۔

منشی عبدالکریم

منشی عبدالکریم لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ غالباً ایام شباب میں وہ کلکتہ گئے اور گورنر جنرل کے دفتر میں فارسی سیکشن کے میر منشی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے مشہور کتاب "الف لیلہ" کے ترجمہ کا ارادہ کیا۔ لیکن اصل عربی کتاب وہاں میسر نہ آسکی۔ اس لئے ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ جب مسلسل بیماری کے سبب ریٹائر ہو کر لکھنؤ واپس ہوئے تو ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء میں اس کے انگریزی ترجمہ سے اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ اور ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء میں پہلی مرتبہ شائع

کرایا۔ اس کے ۳۲ سال بعد دوبارہ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں مطبع نولکشور کی فرمائش پر مطبع نظامی سے طبع کروایا۔ اس مرتبہ انہوں نے کتاب کی دلچسپی بڑھانے کی غرض سے اس کے انگریزی ترجمہ مطبوعہ لندن سے اچھی تصویریں لے کے موقع و محل کے مطابق شامل کیں۔ ذیل میں اس کے دیباچہ سے عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے ان کے طرز کا بخوبی اندازہ ہوگا:

"جس طرح مطالعہ کتب تواریخ سے عجائب و غرائب واردات اور حال سلاطین ماضیہ دانشمندوں کو موجب بصیرت ہر ایک امر میں ہوتا ہے، اسی طرح کتب قصص اور حکایات سے کہ عاقلوں نے ہر ایک زبان میں واسطے تجربے اور تفریح خاص و عام کے تالیف کی ہیں، ہر ایک کو فوائد کثیر حاصل ہوتے ہیں۔ خصوصاً مبتدیوں کو کہ قصد زباندانی کا رکھتے ہیں۔ ایسی کتابوں سے مہارت لکھنے اور پڑھنے اور بول چال کی ہو جاتی ہے، اور راقم اثیم کو ابتدائے شعور سے کمال شوق دیکھنے کتابوں کا قصے کہانی کا تھا، اور سب قصوں میں تمنا الف لیلہ کی زیادہ رہتی تھی، اور وہ عربی میں الف لیلہ و لیلہ یعنی ایک ہزار اور ایک رات ہے، وہ کتاب سوا دو سو رات کہ جس کو شیخ احمد عرب یعنی شروانی نے واسطے پڑھانے صاحبان عالی شان کالج کلکتہ کے بکمال تلاش عرب سے منگوا کر چھپوایا تھا، میسر نہ آئی۔ آخر کار جب راقم بہ سبب شدت امراض کے اور تقرر پنشن بیت السلطنت لکھنؤ میں کہ مولد اپنا ہے، خانہ نشین ہوا۔ وہ نسخہ تمام و کمال انگریزی زبان میں مع تصویرات پہنچا۔ راقم نے اس کو اول سے آخر تک بسبب..... استعداد سمجھنے کے انگریزی کے دیکھا۔ از بسکہ قصے دلچسپ تھے۔ دو برس تک اس کا ترجمہ کرتا رہا۔ اور سنہ ۱۲۵۸ھ میں تمام کیا۔ شہر میں شہرہ ہوا۔ اکثر لوگوں نے منگوا کے اس کی نقل کی، کمتر مسودہ راقم کے گھر رہا، دست بدست پھرا کیا۔ چنانچہ پانچ سات جز تلف ہوئے۔ راقم کو اس کے لکھنے میں دوبارہ تکلیف کرنا پڑی۔ اور طلب کرنے احباب سے نہایت تنگ آیا۔ جس کو نہ دیتا، وہ خفا ہوتا اور دینے میں اپنی کتاب سے ہاتھ دھوتا۔ آخر کو خیال ہوا کہ یہ کتاب چھپ جائے، تا سب کے ہاتھ آئے، اور راقم بھی ایک ایک نسخہ اس کا عزیزوں اور دوستوں کو بانٹے۔ فقط اسی واسطے راقم نے جس طرح ہو سکا بیچ عہد معدلت عہد بادشاہ و جم جاہ، خاقان زمان، ابوالمظفر مصلح الدین محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی ملک اودھ خلد اللہ ملکہ، اور وزارت وزیر اعظم، نواب امین الدولہ عماد الملک امداد حسین خان بہادر ذوالفقار جنگ دام اقبالہ کے چھپوایا اور سنہ ہجری طبع اس کتاب کے ۱۲۶۳ھ اور عیسوی ۱۸۴۷

میں۔"

اوپر کی عبارت بہت صاف اور سادہ اور قافیہ پیمائی سے پاک ہے۔ الفاظ کی ترتیب اور جملے کی ساخت میں البتہ تھوڑی سی قدامت پائی جاتی ہے۔ عہد کا تقاضا ہے۔ لیکن اس سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اردو نثر رفتہ رفتہ ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی سادگی اور سلاست کی طرف آ رہی ہے۔ ترقی یافتہ نثر اور اس میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ جو ہے وہ بھی چند سال میں ختم ہو جائے گا۔

ماسٹر رام چندر

ماسٹر رام چندر' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' ہندو اہل قلم تھے' لیکن بعد میں عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ۵ دسمبر ۱۸۵۲ء کے خطبے میں گارسان دتاسی لکھتے ہیں کہ اس سال جولائی میں اس پر دہلی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی' اس لئے کہ رام چندر شاید پہلے ہندو تھے' جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی ۳۵ سال کی تھی۔(۱) ان کا سنہ پیدائش یا سنہ وفات معلوم نہیں۔ دہلی کالج سے فارغ التحصیل ہو کر اسی کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد' مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ ان کے شاگرد رشید تھے۔ ایک مرتبہ وہ ریاست پٹیالہ میں ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم مقرر ہوئے تھے۔

ماسٹر رام چندر نے ۱۸۴۹ء میں "تذکرۃ الکاملین" کے نام سے ایک کتاب لکھی' جس میں مشاہیر یونان' ایران' اور ہندوستان کا ذکر ہے' اور جو انگریزی' عربی اور دیگر زبانوں کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب دوسری مرتبہ کب اور کہاں سے شائع ہوئی۔ معلوم نہیں' البتہ اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۸۷۷ء میں مطبع نولکشور' لکھنؤ سے شائع ہوا۔ کتاب دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

> "صاحبان دانش و بینش پر ظاہر ہو کہ زمانہ قدیم میں ایسے ایسے فاضل اور کامل شخص قوم ہنود میں گزرے ہیں کہ وہ فضیلت میں اچھے اچھے حکمائے فرنگ اور یونان سے کم نہیں تھے' لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ ان بزرگوں کے حالات نہیں ملتے' سوائے نام کے ہم اور کچھ نہیں پاتے۔ ہم کیا کریں کہ ہمارے ہم وطنوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی کہ ایسے ایسے خدا رسیدہ اور کامل شخصوں کے حالات لکھیں۔ لیکن خیر جیسا کچھ مجھ کو چار پانچ بزرگوں کا حال معلوم ہوا ہے حتی المقدور راست ان چند اوراق میں درج کرتا ہوں۔ چنانچہ اول میں ذکر والمیکی جی کا کروں گا۔ ہنود میں والمیکی جو کہ مصنف پاک کتاب "رامائن" کے ہیں' بہت مشہور بزرگ

گزرے ہیں۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہم کو کسی کتاب میں نہیں معلوم ہوتا کہ یہ جناب کس جگہ پیدا ہوئے۔ اہل فرنگ نے اس بات سے کہ یہ بڑے نامی گرامی شخص ہنود میں گزرے ہیں۔ ان کے حال کی تحقیقات کی۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ یا سولہ برس پیشتر سن عیسوی کے والمیکی جی کی قدوم کی برکت سے باغ ہستی کو رونق تھی۔ بیان کرتے ہیں کہ والمیکی جی ایک غریب گھر میں پیدا ہوئے تھے' اور اس باعث سے کہ ان کے مربی مفلس تھے' انہوں نے بڑی عمر تک تربیت نہیں پائی' اور بے علم رہے۔ جب کہ بڑی عمر ہوئی تو ان کو فرض پڑا کہ اپنے ماں باپ کی پرورش کریں۔ لاچار انہوں نے پیشہ ٹھگی اور قزاقی کا اختیار کیا۔ (اور ان دنوں میں یہ بزرگ شخص بالکل علم کی روشنی سے جاہل تھے) اور جنگل میں رہنا شروع کیا۔ اور اضلاع ہوگلی اور کرشنا گڑھ میں جو مسافر کہ گزرتا اور اس کو لوٹنا اور قتل کرنا اختیار کیا۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ پیشہ انہوں نے کب تک رکھا۔"

ماسٹر رام چندر کی کتاب "تذکرہ الکاملین" کے مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اردو نثر کافی ترقی کر چکی۔ قافیہ کی پابندی اور مسجع عبارت لکھنے کا رواج کم ہو چلا ہے۔ اردو نثر نگار اب سادگی کی طرف مائل ہو گئے۔ قدامت کو ترک کر کے طرز جدید کی طرف آ رہے ہیں۔

"تذکرہ الکاملین" کے علاوہ ماسٹر رام چندر کی اردو نثر میں اور بھی دو کتابیں ہیں۔ ایک کا نام "اصول علم ہیئت ہے"' اور دوسری کا "عجائب روزگار۔" یہ دونوں کتابیں ۱۸۴۷ء تا ۱۸۴۸ء میں دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ آج کل نایاب ہیں۔ نمونہ عبارت بھی کہیں نہیں ملتا اس کے علاوہ "تذکرۃ الکاملین" کی عبارت کا نمونہ پیش کرنے کے بعد اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ اس سے اردو نثر کی ترقی کی رفتار کا اندازہ ہمیں ہو گیا ہے۔

آغا امانت لکھنوی

آغا امانت لکھنوی (م ۱۸۵۸ء) ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کا منظوم ڈراما "اندر سبھا" اردو ڈراما کی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ لیکن یہاں ان کا ذکر ایک نثر نگار کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ بیس سال کی عمر میں کسی بیماری سے زبان بند ہو گئی۔ اور دس برس تک قوت گویائی مفقود رہی۔ اس لئے اس عرصہ میں زبان کا کام قلم سے لیتے تھے۔ اسی حالت میں کربلا کی زیارت کی۔ کہتے ہیں' اس سے زبان کھل گئی' لیکن لکنت باقی رہی۔

اردو نثر میں امانت کی یادگار ان کی "شرح اندر سبھا" ہے' جو ان کے منظوم ڈراما "اندر

سبھا" کی توضیح و تشریح میں لکھی گئی- سنہ تالیف ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء ہے- یہ کتاب پہلے نایاب تھی- سید مسعود حسن رضوی نے اس کا ایک نسخہ کہیں سے ڈھونڈ نکالا' اور مجلہ "اردو" بابت اپریل' ۱۹۲۷ء میں اپنے محققانہ مضمون کے ساتھ چھپوا کر محفوظ کر دیا-

"شرح اندر سبھا" کی عبارت زمانہ کے عام اسلوب پر مقفی ہے' لیکن اس میں الجھاؤ اور تعقید نہیں ہے- عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو :

"ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی یگانہ ازلی رفیق شفیق' مونس و غمخوار' قدیمی جان نثار' شاگرد اول موزوں طبیعت تخلص عبادت' عاشق کلام امانت' انہوں نے از راہ محبت کہا کہ بے کار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے- ایسا کوئی جلسے (ناٹک یا تھیٹر) کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیئے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے' اور خلق میں شہرت ہووے- آخر الامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا' دم بدم شوق زیادہ ہوا' چوں کہ یہ جلسہ کہنا سب کو مرغوب تھا- مگر اپنے نزدیک معیوب تھا' اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل کر اس میں تخلص کیا لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب سے بندے کا کلام دریافت کر لیا- غرض کہ چودھویں تاریخ شوال کی سنہ ۱۲۶۸ ہجری اندر سبھا اس جلسے کا نام رکھ کر بجائے چار باب چار پریان قرار دے کر شروع کیا- شہرت گھر گھر ہوئی' اہل محلّہ کو خبر ہوئی' دو شخص اس جلسہ کی تیاری پر آمادہ ہوئے' ہجوم حد سے زیادہ ہوئے- رفتہ رفتہ بعد ہزاروں ہزار شور و فساد اور حجت و تکرار کے ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا' مگر اپنے نزدیک بے کار ہوا- کہ کس ریاض سے ایک درخت لگایا- آخر کو اس سے رنج کا پھل پایا- خیر جو ہوا سو بہتر ہوا' اپنا تو یہ قول ہے:

"تقدیر سے گلہ ہے کسی سے گلہ نہیں-"

حواشی

تمہیدی خطبے از گارسان دتاسی صفحہ ۱۵-

مرزا غالب دہلوی

حالات زندگی:

مرزا غالب کا پورا نام اسد اللہ بیگ خان اور عرف مرزا نوشہ تھا۔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ/۲۷ دسمبر، ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مرزا کے دادا شاہ عالم بادشاہ دہلی کے عہد (۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء تا ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔ وہ مغل خاندان سے تھے، اس لئے اعلیٰ منصب حاصل کرنے میں دیر نہ لگی۔ وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک کے ہاں ملازم ہوئے۔ اور جب وہ فوت ہوگئے، تو دہلی جا کر نواب ذوالفقار الدولہ کی وساطت سے شاہی ملازمت میں داخل ہوئے، اور معقول آمدنی کا پہاسو پرگنہ حاصل کیا۔(۱)

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خان کی آگرہ کے ایک معزز گھرانے میں شادی ہوئی تھی۔ مرزا عبداللہ بیگ کے تین بچے تھے دو بیٹے غالب، اور مرزا یوسف اور ایک بیٹی خانم۔ مرزا عبداللہ بیگ کے والد کا انتقال ہو گیا تو پہاسو کی جاگیر جاتی رہی۔ اس لئے تلاش معاش کے لئے انہیں جگہ جگہ پھیرنا پڑا آخر ایک فوج کے ساتھ لڑائی میں جا کر مارے گئے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو مرزا غالب کی عمر فقط پانچ سال کی تھی۔ ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے انہیں اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ لیکن مرزا غالب کی ابھی آٹھ ہی سال کی عمر تھی کہ چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی تربیت ننھیال میں ہوئی۔ اس لئے ان کا بچپن آگرہ میں گزرا۔ شیخ معظم کے نام سے ایک بزرگ استاد سے تعلیم حاصل کی۔ مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کے پاس بھی کچھ پڑھا۔ غالب کی شادی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں تیرہ سال کی عمر میں نواب الٰہی بخش خان معروف کی لڑکی سے ہو گئی تھی۔ غالب کے چچا نے بھی اس خاندان میں شادی کی تھی۔ غالب کے سسر نواب الٰہی بخش خاں دہلی میں رہتے تھے۔ اس وجہ سے غالب کی آمدورفت دہلی میں ہوتی رہی۔

مرزا غالب کو فارسی سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے استاد یا اتالیق کی حیثیت سے ایران کے ایک سیاح ملا عبدالصمد ہرمزد کا نام لیا جاتا ہے۔ خود غالب نے بھی اس

بات کا اعتراف کیا ہے۔ ملا ہرمزد ۱۸۱۰ء کے قریب آگرہ وارد ہوا تھا' اور دو سال تک مرزا غالب کے گھر رہا' اور ان کو فارسی سکھاتا رہا۔ لیکن مرزا غالب نے ایک جگہ اس سے انکار بھی کیا ہے کہ ملا ہرمزد کا ان کی فارسی دانی میں کوئی ہاتھ ہے۔ بلکہ فارسی میں ان کی مہارت ان کی اپنی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے۔(۲)

مرزا غالب کا یوں بھی شروع سے دہلی آنا جانا تھا' لیکن غالباً وہ ۱۸۱۳ء یا ۱۸۱۴ء میں مستقل طور پر وہاں منتقل ہو گئے۔ اگرچہ کبھی کبھی آگرہ بھی جاتے رہے ہوں گے۔ مرزا کو گورنمنٹ کی طرف سے اپنے چچا نصراللہ خان کی جاگیر کے عوض سالانہ کل سات سو روپے ملتے تھے۔ آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لئے تنگی میں گذارا کرتے تھے۔ وظیفہ بڑھانے کی غرض سے انہوں نے ۱۸۲۸ء میں کلکتہ کا سفر کیا' اور تین سال تک قیام کر کے گورنمنٹ میں کوشش کرتے رہے۔ لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ آخر ناکام واپس ہونا پڑا۔ اس سفر میں لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھہرے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ نے از راہ قدردانی ان کے لئے پانچ سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا' لیکن وہ وظیفہ ۱۸۵۶ء میں بند ہو گیا۔

غالباً ۱۸۴۸ء میں قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہو کر چھ مہینے تک قید میں بھی رہے۔ قید میں اگرچہ ان کے ساتھ ہر طرح کی عزت کا سلوک کیا جاتا تھا' لیکن ان کے دل پر اس کا بڑا برا اثر ہوا۔ قید سے رہا ہو کر معززین سے کچھ دن ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ گویا وہ خود اپنی ہی نظر میں گر گئے تھے۔(۳) لیکن ان کا یہ وہم بہت حد تک بے بنیاد تھا۔ لوگوں کی نگاہ میں ان کی قدر بالکل کم نہ ہوئی۔ اس کا ثبوت بعد میں ان کے ساتھ لوگوں کا نہایت شریفانہ سلوک ہے۔ چنانچہ ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ ظفر نے غالب کو شاہان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا شرف بخشا' اور نجم الدولہ' دبیر الملک' نظام جنگ کا خطاب عطا کیا اور اس کے ساتھ پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ اس کے علاوہ جب بادشاہ کے استاد ذوق کا ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا' تو ان ہی سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ نواب یوسف علی خان نے ان کے لئے سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔(۴) رام پور کے رئیس نواب کلب علی نے بھی غالب کے لئے سو روپیہ ماہانہ جاری کر دیئے تھے۔ اگر قید کی وجہ سے خلائق کی نظر میں ان کی وقعت کم ہو جاتی تو ہرگز ان کے ساتھ اس قدر فیاضانہ برتاؤ نہ کیا جاتا۔

غالب کا انتقال ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ/۱۵ فروری' ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ میں دفن ہوئے۔(۵)

ادبی زندگی

اردو نثر میں غالب کی تصانیف کے بارے میں مولانا حالی لکھتے ہیں؟

"مرزا کی اردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں' چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے ہیں' جو برہان قاطع کے طرف داروں کے جواب میں لکھے ہیں۔"

مرزا غالب کے رقعات کا پہلا مجموعہ "عود ہندی" کے نام سے خود ان کی زندگی میں وفات سے چار مہینے پہلے اکتوبر ۱۸۶۸ء میں مطبع مجتبائی' میرٹھ سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اس میں کل ۱۶۳ رقعات' ان کی لکھی ہوئی دو کتابوں کی تقریظیں اور تین کتابوں کے دیباچے شامل ہیں۔

غالب کے رقعات کا دوسرا مجموعہ "اردوئے معلی" حصہ اول ان کے انتقال سے ۱۹ روز بعد ۶ مارچ' ۱۸۶۹ء کو مطبع اکمل المطابع' دہلی سے چھپ کر شائع ہوا۔

"اردوئے معلی" کا حصہ دوم ۱۸۹۹ء میں مطبع مجتبائی' دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں ۵۶ صفحات اور ۵۳ رقعات شامل ہیں۔ اس حصہ میں خصوصاً وہ رقعات شامل ہیں "جن میں مرزا نے لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے' یا کوئی نکتہ بتایا ہے۔ اس میں بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی شامل ہیں۔(۶)" "اردوئے معلی" کے دونوں حصوں کو شیخ مبارک علی' تاجر کتب' لاہور نے ۱۹۲۹ء میں یکجا کر کے شائع کر دیا ہے' جس کے ساتھ ۳۲ غیر شائع شدہ خطوط کا ایک ضمیمہ بھی لگا دیا ہے۔

غالب کے خطوط کا آخری مجموعہ "مکاتیب غالب" ریاست رام پور کی جانب سے ۱۹۳۷ء میں نہایت خوبصورت ٹائپ میں شائع ہوا۔ اس میں کل ۱۱۵ خطوط شامل ہیں۔ اور یہ ان کے صرف وہ خطوط ہیں' جو انہوں نے نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی' فرمارداﻳﺎں رام پور کے نام لکھے تھے۔ اس پر منشی امتیاز علی عرشی' ناظم کتب خانہ سرکاری نے ۱۸۱ صفحوں کا ایک فاضلانہ دیباچہ لکھا' جس میں ان خطوط کی مدد سے مرزا کے حالات پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان کے تین اردو رسالوں کے نام "لطائف غیبی" "تیغ تیز" اور "نامہ غالب" ہیں' جو ان کی فارسی کتاب "قاطع برہان" کے مخالفین کے جواب میں لکھے تھے۔

اردو نثر میں غالب کے یہی خطوط کے مجموعے اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں' جن کی بدولت انہیں ادبی دنیا میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ غالب کی اہمیت اصل میں ایک شاعر کی حیثیت سے ہے۔ شاعری میں ان کا مرتبہ بہت اعلیٰ و ارفع ہے' جس پر بحث حصہ دوم میں کی جائے گی۔ لیکن ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بہت اعلیٰ ہے۔ وہ خداداد قابلیت اور

صلاحیت کے مالک تھے' جس صنف ادب پر بھی طبع آزمائی کرتے تھے' اس میں وہ ایک عظیم فن کار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے تھے۔

خطوط نویسی کا فن دنیا میں بہت پرانا ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے' لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فن انسانی ضروریات کے باتحت وجود میں آیا۔ خطوط کی اصل میں دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بادشاہ یا حاکم اپنے ماتحتوں کو فرمان یا ہدایات کی شکل میں لکھتا ہے' یا دفتری عملے لکھتے ہیں۔ دوسرے وہ کہ لوگ انفرادی طور سے نجی خطوط اپنے دوست احباب یا عزیزوں کو لکھتے ہیں' ہماری بحث یہاں صرف دوسری قسم کے خطوط' اور وہ بھی صرف ان لوگوں کے خطوط سے ہے' جن کا ادب میں ایک خاص مقام ہے۔ اس لئے کہ خطوط ان ہی لوگوں کے ادبی محاسن کے حامل ہوتے ہیں۔ بڑے ادیبوں کی شخصیتیں بعض اوقات کچھ ایسی پیچیدہ ہوتی ہیں' کہ انہیں کما حقہ سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس وقت یہی خطوط ہوتے ہیں' جن میں ان کی حیات کے بعض گم شدہ کڑیاں ہمیں مل جاتی ہیں' اور معلومات کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے۔

نجی خطوط میں انسان اپنی اصلی خد و خال میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان میں وہ بے تکلف اور غیر شعوری طور پر وہ باتیں لکھ دیتا ہے' جنہیں اس کے ذاتی حالات سے گہرا لگاؤ ہوتا ہے' اور جو ممکن ہے' رسوائی و بدنامی کے خوف سے دوسری عام حالت میں نہ لکھ پاتا۔ مکتوب نگار کو مکتوب پر اعتماد ہوتا ہے' اور مخاطب بھی ایک ہی شخص ہوتا ہے' اس لئے اس میں بے تکلفی زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ بعض اوقات مکتوب نگار جذبات کی رو میں وہ سب کچھ لکھ دیتا ہے' جو اس کی نجی زندگی یا عمر رواں سے تعلق رکھتا ہو۔ ایک فرد کو تو اپنے اور پرائے کے معاملات میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے' لیکن ایک بزم کو نہیں بتایا جا سکتا۔ اس میں بڑے رکھ رکھاؤ اور پوری احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے' ورنہ بھری محفل میں رسوائی کا اندیشہ رہتا ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق خطوط شبلی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> "خانگی خطوں میں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں' ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے' جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے۔ اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے۔ جہاں اندیشہ لائم نہیں ہوتا۔ یہ دلی جذبات اور خیالات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔ پھر کون ہے' جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا۔ یہ ہماری فطرت میں ہے' اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں' آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق اور

شوق سے پڑھتے ہیں۔"

لیکن وہ پرائیویٹ خطوط جب شائع ہو جاتے ہیں' تو جہاں ان میں ادبی محاسن کی وجہ سے مکتوب نگار کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ وہاں بھی اندیشہ رہتا ہے کہ اس کے یہی نجی خطوط اس کی رسوائی کا بھی باعث نہ بنیں اور اس کی زندگی کے راز ہائے سربستہ دنیا میں فاش نہ ہو جائیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

" (مکتوب الیہ) بعض اوقات ایسے افراد ہوتے ہیں' جن کی نسبت یہ گمان ہوتا ہے' کہ معاملہ ان ہی تک رہے گا' اور اس کا افشا نہ ہوگا' اور اس لئے وہ کبھی کبھی ایسے اسرار بیان کر جاتا ہے' اور دل کی ایسی باتیں لکھ جاتا ہے' جو کبھی وہ زبان پر نہ لاتا اور نہ حوالہ قلم کرتا' اور شاید اسی کے ساتھ اس کے سینہ میں مدفون ہو جاتیں' لیکن اسے کیا خبر کہ رقیب گھات میں لگے ہوئے ہیں' جو اس کے ایک ایک پرچے کو ڈھونڈ نکالیں گے اور اس کے راز کو ڈنکے کی چوٹ بیان کریں گے۔"

نجی خطوط کی ایک خاص خصوصیت سادگی ہے' جو عام تصنیفات میں خال خال نظر آتی ہے۔ انسان جب خط لکھنے بیٹھتا ہے' تو اس کے ذہن میں وہ ساری باتیں صاف اور غیر مبہم شکل میں مہیا ہو جاتی ہیں' جو اسے مکتوب الیہ کو لکھنا ہے۔ اور یہ بھی ملحوظ رہتا ہے کہ اس خط میں انداز بیاں ایسا ہونا چاہیے کہ مخاطب کو مطلب کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اس لئے اس میں عام تصنیفات کے برخلاف تکلفات کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اس میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کی نمائش کرنے کی خاطر عبارت آرائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ "از دل خیزد بر دل ریزد" کا قول اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق : انسان بچپن کی سی سادگی سے' بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے' جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں' جنہیں نہ انشاء کی صنعت مسخ کر سکتی ہے' اور نہ تشبیہات اور استعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحہ پر اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے' جس میں ہر حرکت' ہر خیال اور تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔"(۵)

نج کے خطوط سوانح نگاری کی جان ہوتے ہیں۔ ان میں مکتوب نگار اپنے کردار اور گرد و پیش کے حالات کا اس طرح رنگ بھر دیتا ہے' کہ ان سے اس کی زندگی اور تصنیفات کو سمجھنے میں ہمیں بڑی مدد ملتی ہے۔ ہم کسی تصنیف کو اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ پائے' جب تک کہ ہم مصنف کے کردار اور سیرت کا بخوبی مطالعہ نہ کر لیں' اور یہ مقصد جتنا اس کے نج کے خطوط سے حاصل ہو سکتا ہے' اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ خطوط بجائے

خود ادب کے بہترین شہ پارے ہو سکتے ہیں' اگر لکھنے والا کوئی بڑے پایہ کا ادیب ہو۔ ان میں وہ صرف اپنی بات ہی نہیں کرتا' بلکہ اپنے ہم عصر لکھنے والوں کے بارے میں بھی وہ اپنی بیش قیمت رائے دیتا ہے' جو شاید وہ مصلحت کی بنا پر کھلم کھلا نہ لکھ سکتا تھا۔ اس لحاظ سے ہم بعض اوقات خود لکھنے والے کے حالات کے ساتھ ساتھ دوسرے اہل قلم کے حالات اور تصنیفات کی بھی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

غالب کے خطوط ادبی شہ پارے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے ہمیں ان کی زندگی اور کلام کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ آج تک ان کی شاعری کے متعلق جو خیالات قائم کئے گئے تھے' ان میں ان کے خطوط کی روشنی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور آج تک ان کے کلام سے حیات انسانی کے بارے میں جتنے تصورات اخذ کئے گئے اور ان کے تصور زندگی کو تلاش کرنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں' ان کی نئی توضیح و تشریح کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

غالب ایک عظیم فنکار تھے۔ ان کے مشاہدات بہت وسیع اور زندگی کی جزئیات پر حاوی تھے۔ اس لئے ان کے خطوط میں زندگی کے تقریباً ہر موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ انفرادی زندگی کے جزوی واقعات سے لے کر اجتماعی زندگی کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

غالب کو اپنی فارسی دانی پر بڑا فخر تھا۔ اس لئے وہ فارسی ہی میں شعر کہتے تھے' اور فارسی ہی میں خطوط لکھتے تھے' اور بڑی کاوش اور محنت سے لکھتے تھے۔ وہ زندگی بھر اپنی فارسی شاعری اور فارسی تحریر ہی کو اہمیت دیتے رہے۔ اردو کی ان کے نزدیک ایسی وقعت نہ تھی' اور "مجموعہ اردو بے رنگ من است" کہہ کر اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ان کی اردو شاعری پر ہمیں یہاں بحث نہیں بلکہ اردو خطوط سے ہے۔

غالب کی اردو خطوط نویسی ضرورت کے تحت شروع ہوئی۔ ۱۸۵۰ء میں جب انہوں نے بہادر شاہ ظفر کے حکم سے خاندان تیموریہ کی تاریخ(۶) لکھنی شروع کی' تو ان کے پاس اتنا وقت نہ رہا کہ فارسی خطوط نویسی کی طرف توجہ دے سکتے۔ اس میں انہیں کاوش زیادہ کرنی پڑتی تھی۔ برخلاف اس کے اردو ان کی اپنی زبان تھی' اور جو چاہتے اس میں بے ساختہ لکھ سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اردو ہی میں لکھنا مناسب سمجھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اردو میں خط لکھنا انہیں اتنا راس آیا' کہ اس فن شریف میں وہ یکتائے روزگار ہو گئے۔ انہوں نے اس میں وہ کمال پیدا کیا کہ اردو ادب میں ان کا خاص مقام پیدا ہو گیا۔ قبل اس کے کہ غالب کی خطوط نویسی پر مزید بحث کی جائے۔ مناسب ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ ان کے اس فن کے کیا اصول تھے۔

مرزا علی بخش کی درخواست پر غالب نے فارسی خطوط نویسی کے قواعد پر ۱۸۲۵ء میں فارسی

میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس سے مندرجہ ذیل چند موٹے موٹے قاعدے مترشح ہوتے ہیں:

۱۔ خط کے شروع میں مکتوب الیہ کو اس کے موافق حال کسی لفظ سے خطاب کیا جائے۔

۲۔ اس کے بعد لمبے چوڑے آداب و القاب کے بجائے ایک دم حرف مطلب شروع ہو جانا چاہیے۔ خیریت نویسی اور خیریت طلبی لغو اور زائد باتیں ہیں۔

۳۔ خط نویس کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا ہو جائے اور مطلب اس طرح بیان ہو کہ مکتوب الیہ کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

۴۔ کئی باتیں لکھنی ہوں' تو انہیں اچھی طرح ترتیب دیا جائے۔

۵۔ الفاظ مغلق اور مطلب میں پیچیدگی نہ پیدا ہونی چاہیے۔

۶۔ مشکل استعاروں اور غیر مانوس تشبیہوں سے' جو زمانہ کے مذاق کے مطابق نہ ہوں' پرہیز کیا جائے۔

۷۔ الفاظ کی تکرار نہ ہو' اور بلا ضرورت طوالت سے کام نہ لیا جائے۔

۸۔ خط میں مکتوب الیہ کے مرتبہ اور منزلت کو نظر انداز نہ کیا جائے (۷)

غالب کے اردو خطوط کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے' انہوں نے ان قواعد کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی جدت پسند طبیعت نے اردو خطوط نویسی میں بھی ایک جدت پیدا کی۔ اور جس طرح شاعری میں ان کا ایک انفرادی رنگ قائم ہے' اس میں بھی ان کا ایک جداگانہ طرز وجود میں آیا ہے۔ انہوں نے خطوط نویسی کی فرسودہ اور دقیانوسی روایت کو ترک کر کے اس صنف ادب کو ایک نئی شاہراہ پہ ڈال دیا۔ قدیم انداز تحریر کے وہ سخت خلاف تھے۔ اس سلسلے میں میر مہدی کو وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو' مسودے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا۔ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے۔ وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا اور دعا کہنا۔ اور ہاں' حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کرنا۔ لازمہ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔ کیوں سچ کہیو! اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؟ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو' وہ خط ہی نہیں' چاہ بے آب ہے' ابر بے باراں ہے' زمانہ بے چراغ ہے' چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو' تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ دیا' زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔

اگر تمہاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے' تو بھائی ساڑھے تین سطریں ایسی بھی میں نے لکھ دیں- کیا نماز قضا نہیں پڑھتے؟ وہ مقبول نہیں ہوتی؟"

پرانے طرز کے مطابق طویل آداب و القاظ لکھتے ہوئے' نہایت دلچسپ پیرایہ میں لکھتے ہیں :

"کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں؟ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں- واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلہ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں' نہ القاب' نہ آداب' نہ بندگی' نہ تسلیم؟ سن غالب! ہم تجھ سے کہتے ہیں' بہت مصاحب نہ بن- اے ایاز! حد خود بشناس- مانا کہ تونے کئی برس کے بعد نو بیت کی غزل لکھی ہے' اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے- مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے؟ پہلے القاب لکھ' پھر بندگی عرض کر' پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ پھر عنایت نامہ آنے کا شکر ادا کر-"

غالب بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج انسان تھے- ان کی یہ زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی ان کی نگارشات میں خصوصاً اردو خطوط میں ہر جگہ پائی جاتی ہے- اور اسی وجہ سے ان کے خطوط کے مجموعے بہت دلچسپ ہیں- لوگ پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں- یہ ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی ہی تھی کہ ان کا مراسلہ مکالمہ معلوم ہوتا ہے- اس بات کا خود غالب کو بھی اندازہ تھا- وہ مرزا حاتم علی مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے- ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو' ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو تفتہ کو لکھتے ہیں :

"بھائی! مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے' مکالمہ ہے-"

منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں :

"بھائی مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ یہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت گویا مکالمت ہو گئی ہے- اور باتیں کرتے ہیں- اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے- خط سے خط لکھے گئے ہیں- غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے' ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہو جاتا-"

غالب فارسی دانی میں کسی کو اپنا ہمسر نہ سمجھتے تھے' اور وہ شاعری میں اپنے آپ کو یکتائے زمانہ تصور کرتے تھے- خطوط نویسی کے فن کو بھی وہ اپنی دولت قرار دیتے تھے- دیکھئے' وہ لکھتے ہیں :

"میر مہدی! جیتے رہو! آفرین! صد ہزار آفرین! اردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو، دلی کے تمام مال و متاع اور زر و گوہر کی لوٹ پنجاب کے احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"

غالب خطوط بڑے ذوق و شوق سے لکھتے تھے۔ ان کی زندگی کا دار و مدار صرف تین چیزوں پر تھا۔ ایک شراب، دوسری شاعری اور تیسری خطوط نویسی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں، جب کہ ان کو ہر لحاظ سے کمال حاصل ہو چکا تھا، اردو میں خطوط لکھے اور کثرت سے لکھے، غالباً اس خیال کے ماتحت کہ یہ کام بھی تصنیف و تالیف کا ایک اہم جز ہے۔ اور ظن غالب یہی ہے کہ ان کو اس امر کا بھی بہ خوبی احساس تھا کہ ان کے وہ خطوط بعد میں جا کر شائع ہوں گے، اور ادبی شہ پارے ثابت ہو کر ارباب ذوق سے خراج تحسین وصول کریں گے۔ اس لئے ان کے خطوط کے بارے میں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ احتیاط سے نہیں لکھے اور کاوش نہیں کی انہوں نے احتیاط ضرور برتی ہوگی لیکن وہ احتیاط اور کاوش ہماری احتیاط اور کاوش سے جداگانہ تھی۔ ان دو لفظوں کا ہمارے نزدیک جو مفہوم ہے، وہ بعینہٖ ان پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ وہ مفہوم اضافی ہے۔ ایک باکمال شخص کے لئے بہتر سے بہتر ادب پارہ کی تخلیق کے لئے ذرا سی توجہ ہی بس بہت ہے، بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک جنبش قلم ہی کافی ہے۔ بر خلاف ایک ناکارہ آدمی کے کہ وہ اپنی تحریر میں کتنی ہی احتیاط برتے اور کاوش کرے، مگر وہ چیز نہیں بن سکتی جو ایک کامل فن کے قلم سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب لکھتے لکھتے پختہ ہو جاتا ہے اور اس میں خداداد صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے، تو وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے، وہ اعلیٰ ادب بننے کے قابل ہوتا ہے۔ سرسید کے بارے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سرسید جو ایک مجاہد وطن اور محسن قوم گزرے ہیں، وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مسلسل لکھتے رہتے تھے۔ ان کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ اپنی نگارشات پر نظر ثانی کریں۔ مضمون کا جو خاکہ ذہن میں ہوتا تھا، وہ جلدی جلدی لکھ کر چھپنے کے لئے پریس میں بھیج دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ آج جدید اردو نثر کے بانیوں میں سے ہیں، اور ان کی تحریریں ادب عالیہ کہلاتی ہیں۔

غالب کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اپنے فن میں درجہ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ قلم اٹھاتے اور صفحہ قرطاس پر لکھتے جاتے جیسے موتی جوڑتے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس جگہ پلے بڑھے، جہاں کی اردو ٹکسالی سمجھی جاتی ہے۔ اور اردو خاص ان کی زبان تھی۔ اس میں جس طرح چاہتے تھے،

آسانی کے ساتھ لکھ لیتے تھے۔ سوچنے اور کاوش کرنے یا احتیاط برتنے کی انہیں کیا ضرورت تھی؟ وہ لکھنے بیٹھتے تھے تو الفاظ ان کے سامنے آکر بھیڑ جماتے تھے۔ صرف بہتر سے بہتر الفاظ انتخاب کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔

غالب کو خطوط نویسی سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ پابندی سے خطوط لکھتے اور دوسروں کے خطوط کا جواب لکھتے۔ منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں :

"اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا' تو لفافے بناؤں گا۔"

غالب خود بھی پابندی سے خطوط لکھتے تھے' اور دوست احباب سے بھی توقع کرتے تھے کہ وہ بھی انہیں پابندی سے خطوط لکھیں۔ کسی دوست سے اس بارے میں ذرا کوتاہی ہوئی' تو وہ بہت برا مانتے اور شکایات کا پہاڑ کھڑا کر دیتے۔ ایک مرتبہ تفتہ نے خط لکھنے میں ذرا دیر کی تو ان کو لکھا:

"کیوں صاحب؟ مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا' آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو' کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بالمکند اس کا بیٹا یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر لکھنؤ کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خطوط موقوف۔ صرف تم تین صاحبوں کے خط آنے کی توقع۔ اس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ۔ ہاں ایک تم کہ ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آ پڑا' دو خط تین خط۔ ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی' اور ہر مہینے میں بھیج دی۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :

"کیوں صاحب؟ کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا' تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا کہ زنہار! کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب دوستوں کے خط نہ ملنے پر بے چین رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود زیادہ خط لکھنے کے عادی تھے' ان کی فطرت انہیں لکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ لیکن سب تو مرزا نہیں ہوتے۔ تاہم ان کے شوق کو جلا دینے اور ان کے ذوق کی تسکین سے

لئے کہیں نہ کہیں سے خط آنا ضروری تھا' تاکہ انہیں اور لکھنے کا موقع ملتا۔

خطوط غالب نے اردو خطوط نویسی میں ایک جدید رجحان عمل میں لانے میں بڑا کام کیا۔ خطوط میں عبارت آرائی' قافیہ پیائی' اور پرانے رنگ کے آداب و القاب رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ اس لحاظ سے غالب کی نگارشات کو قدیم و جدید ادب کا سنگم کہنا چاہیے۔ ان سے پہلے قدامت کا دور دورہ تھا' اور ان کے بعد سے اردو ادب میں جدید رجحانات پیدا ہونے کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ غالب کی زندگی کے آخری ایام اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں' جس میں ۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی ہوئی۔ معاشرہ میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ زندگی کی پرانی قدریں اب زوال پذیر ہونے لگیں' اور نئی قدروں کا بول بالا ہونے لگا۔ زندگی کے ہر پہلو میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہونے لگا۔ ہمارا ادب بھلا اس انقلاب کی زد سے کیسے بچ سکتا۔ اس پر بھی اثر ہوا۔ حیات انسانی کی رفتار بہت تیز ہونے لگی۔ لوگوں کو اب پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ ہر طرف سے صرف ایک آواز سنائی دیتی تھی : آگے بڑھو۔ ان حالات میں اردو نثر میں قافیہ پیائی اور عبارت آرائی کی گنجائش کہاں؟ مصروفیات پہلے کی بہ نسبت بہت بڑھ گئی ہیں۔ اب قدیم روش کی بھول بھلیاں میں پڑ کر وقت ضائع کرنے کا موقع کہاں؟ مختصر بات کرو۔ طویل آداب و القاب کو بالائے طاق رکھو۔ غالب نے اس بات کو سمجھا۔ اپنے خطوط میں سیدھی سیدھی بات کی۔ الفاظ کے گورکھ دھندوں اور بیان کی پیچیدگیوں میں پڑ کر خود اپنا اور دوسروں کا وقت برباد نہیں کیا۔ خود انہوں نے یہ طرز اختیار کیا' اور دوسروں کو بھی اس طرز کو اختیار کرنے کی تلقین کی۔ غالب کی زبان کو سادگی کی طرف مائل کرنے کی یہ ابتدائی کوششیں ان کے بعد سر سید کے زمانہ میں بار آور ہوئیں۔

لیکن یہ غور طلب امر ہے کہ غالب کو ہم جدید نثر نگاروں میں شمار کریں گے یا نہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے' نہیں۔ غالب صرف اس حد تک جدید نثر نگار ہیں کہ انہوں نے اپنے دور کی عام روش سے ہٹ کر ایک قدم آگے بڑھایا۔ لیکن سر سید کے زمانہ کی اردو نثر سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے' تو ان کو قدیم نثر نگاروں میں شمار کرنا چاہیے۔ ان کے خطوط پڑھئے' معلوم ہوگا' ان کا انداز بیان کافی مختلف ہے۔ جو طرز قدیم کی سرحد سے جا کر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ میرے خیال میں انہوں نے اردو نثر میں جو ایک نیا طرز پیدا کیا اس میں ان کی جدت طراز طبیعت کو زیادہ دخل رہا ہے۔ وہ شاید عصر نو سے اتنا متاثر نہیں ہوئے' جتنا کہ بادی النظر میں سمجھا جاتا ہے۔ ان کی وابستگی عہد کہن سے زیادہ رہی ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ دور مغلیہ کی یادگار ہیں۔

غالب کے بارے میں ہم کچھ بھی کہیں' اور رائے زنی کریں' مگر سچ پوچھئے تو غالب سب پر

غالب ہیں- قصرِ ادب میں ایک بلند مینار جیسی ان کی حیثیت ہے- ان کا سر نہ ان کی زندگی میں کبھی نیچا ہوا تھا' اور نہ کبھی نیچا ہوگا- دنیا کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک عظیم فن کار گزرے ہیں- ان کی "کلاہ نمدی" کوئی بے معنی چیز نہ تھی-

غالب کے خطوط کی قدر و قیمت پر ہم نے اوپر بالا اختصار بحث کی ہے- اس سے زیادہ بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے- ہم ذیل میں صرف بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا ایک قول نقل کر کے اس مبحث کو ختم کرتے ہیں :

"مرزا غالب کے حالات اور کلام پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں' مگر کہیں ان کی زندگی اور سیرت کا وہ نقشہ نظر نہیں آتا' جو ان کے رقعوں میں ہے- ان رقعوں میں اس عجیب و غریب شخص نے اپنی روح بھر دی ہے-"

تبصرہ

شمالی ہند میں اردو نثر کا یہ باب چودہویں صدی عیسوی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک کوئی پانچ سو سال پر محیط ہے- اس میں اولین نثر نگار کی حیثیت سے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کو دکھایا گیا ہے' اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو سنگ میل قرار دے کر مرزا غالب کو آخری نثر نگار بتایا گیا ہے' جس میں چھوٹے بڑے کل بائیس نثر نگاروں کی ادبی خدمات کا مختصر طور پر جائزہ لیا گیا ہے' جس سے شمالی ہند میں اردو نثر کے آغاز و ارتقا کا بخوبی پتا چلتا ہے- اس دور میں اور بھی بہت سے نثر نگار گزرے ہیں' لیکن چونکہ ہمارا مقصد یہاں صرف اردو نثر کے آغاز و ارتقا کو دکھانا ہے' اس لئے کل بائیس آدمیوں کا انتخاب کر کے ان کی نگارشات پر بحث کی گئی ہے- اس دور میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین بھی آتے ہیں' لیکن چونکہ وہ اس خاص ادارہ سے وابستہ ہو کر' خاص لوگوں کی سرپرستی میں ایک خاص مقصد کے ماتحت کام کر رہے تھے' اس لئے ان لوگوں کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے- لہٰذا ان کا ذکر اور ان کی اردو نثر میں گراں بہا خدمات کا ذکر ایک مستقل باب میں کیا جائے گا-

شمالی ہند میں اردو نثر کا جو آغاز و ارتقا دکھایا گیا ہے' اس میں اگرچہ ہر نقش ثانی ہر نقش اول سے بہتر معلوم ہوتا ہے' لیکن مجموعی طور پر ایک یکسانیت پائی جاتی ہے- اس عہد کے تمام نثری سرمایہ میں کم و بیش قدیم طرز نگارش نظر آتا ہے- عبارت بالعموم مقفی و مسجع ہوتی ہے- تشبیہات و استعارات زیادہ استعمال ہوتے ہیں- فارسیت کا غلبہ رہتا ہے- عبارت آرائی سے داد قابلیت وصول کرنے کا عام جذبہ پایا جاتا ہے' سوائے چند مصنفین کے' جن میں انشاء اللہ انشاء'

منشی عبدالکریم، ماسٹر رام چندر اور مرزا غالب شامل ہیں۔ انہوں نے اردو نثر کو ژولیدہ بیانی، اغلاق نویسی اور قافیہ پیمائی سے بڑی حد تک پاک کر کے ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔

حواشی

۱۔ غالب نامہ، صفحہ ۱۸۔

۲۔ داستان تاریخ اردو صفحہ ۲۳۲-۲۳۴۔

۳۔ داستان تاریخ اردو، صفحہ ۲۳۰۔

۴۔ داستان تاریخ اردو، صفحہ ۲۳۶۔

۵۔ داستان تاریخ اردو، صفحہ ۲۳۷۔

۶۔ داستان تاریخ اردو۔ صفحہ ۲۵۱۔

۷۔ اردو خطوط، صفحہ ۹۔

۸۔ اس کتاب کا نام غالب نے "پرتوستان" تجویز کیا تھا۔ لیکن اس کا پہلا حصہ ابھی ختم ہی ہو پایا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اپنی تمام تر تباہیوں اور بربادیوں کے ساتھ شروع ہوگئی۔ یہ حصہ "مہر نیم روز" کے نام سے شائع ہوگیا، جس میں تیمور سے لے کر ہمایوں بادشاہ تک کے حالات درج ہیں۔ دوسرا حصہ جس میں اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ ظفر تک کی تاریخ ہوتی، اور جس کا نام غالب نے "ماہ نیم ماہ" تجویز کیا تھا، اس ہنگامہ رستاخیز کی وجہ سے لکھنے کا موقع نہ ملا۔ (داستان تاریخ اردو۔ صفحہ ۲۴۹)۔

باب سوم

اردو نثر بنگال میں

(فورٹ ولیم کالج)

تمہید

پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنوبی ہند میں شاہان بیجا پور اور گولکنڈہ کی سرپرستی میں اردو نثر کا ایک قابل قدر ذخیرہ وجود میں آ گیا تھا- لیکن اس سرمایہ کو نقش اول ہی کہنا چاہیے' اور اس میں قدرتی طور پر جو خامیاں ہونی چاہئیں' وہ ہیں- اس عہد کا نثری سرمایہ سوائے ایک دو کتابوں کے سارا مذہبی تصانیف پر مشتمل ہے- اس میں ادبی خوبیاں پیدا نہ ہو سکیں' عبارت بھی نہایت گنجلک ہے- آج کل کے زمانہ کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی-

جنوبی ہند کے بعد اردو نثر کو جو سرپرستی ملی' وہ بھی اردو کے اصلی وطن اور مرکز شمالی ہند سے دور سرزمین بنگال میں ملی' اور وہ بھی اہل بنگال کے ہاتھوں نہیں' بلکہ سات سمندر پار کے رنگ و نسل اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بالکل مختلف قسم کے لوگوں کے ہاتھوں ملی- انگریز ہندوستان میں تجارتی اغراض سے آئے تھے' لیکن ان لوگوں کی عقل و فراست اور دانائی و تدبر کی بدولت اور یہاں کے حکمرانوں کی کمزوری اور خانہ جنگی کے سبب وہ رفتہ رفتہ ملک کی حکومت پر قابض ہونے لگے- ہندوستان میں ان لوگوں کی عملی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز کلکتہ تھا- وہاں ان لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک کمپنی قائم کی' جو تجارت کی سہولتیں فراہم کرنے اور ان کی فلاح و بہبود کی نگرانی کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی-

انگریز جب یہاں اچھی طرح جم گئے' اور انہیں کسی قدر اطمینان اور آزادی کے ساتھ تجارت کرنے کے مواقع مل گئے' تو ان لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ یہاں کی مقامی زبان سے جب تک واقفیت حاصل نہ کی جائے' روزمرہ معاملات اور لوگوں سے باہمی روابط پیدا کرنے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے- چنانچہ اسی ضرورت کے پیش نظر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام

عمل میں آیا۔ اس کالج کا افتتاح ۴ مئی، سنہ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی، گورنر جنرل کے ہاتھوں ہوا۔ اور اردو کے والہ و شیدا جان گل کرسٹ اس کے صدر مقرر ہوئے۔ ان کی سرپرستی میں اس کالج میں مختلف اہل قلم نے اردو ادب کی وہ بیش بہا خدمات انجام دی ہیں کہ اردو دنیا کبھی اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے اردو نثر جس کس مپرسی کے عالم میں تھی وہ ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔ اس کو ادبی مقام عطا کرنے میں اس کالج کا بڑا ہاتھ رہا۔ بالفرض اگر یہ کالج قائم نہ ہوتا اور جان گل کرسٹ جیسے جان نثار عالم کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی، تو شاید اردو نثر کا تابناک باب بہت بعد میں شروع ہوتا۔

فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کی جو گراں بہا خدمات انجام دیں، ان پر سید محمد ایم۔ اے نے "ارباب نثر اردو" کے نام سے ایک قابل قدر کتاب لکھی ہے۔ ذیل میں اس کتاب کی مدد سے اور دوسرے ذرائع سے جو مواد میسر آ سکتا ہے، اسے سامنے رکھ کر ہم یہاں ان خدمات کا مختصر طور پر جائزہ لیتے ہیں:

میر امن دہلوی

اس سلسلہ میں سب سے پہلا مبارک نام جو آتا ہے، میر امن دہلوی کا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، میر امن دہلی کے رہنے والے تھے۔ سنہ پیدائش اور وفات معلوم نہیں۔ ۱۸۰۰ء میں جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا، اور اُس میں لائق ادیبوں کی ضرورت ہوئی، تو حصول معاش کی غرض سے ایک دوست کی وساطت سے اس میں ملازم ہو گئے۔

میر امن نے اپنے زمانہ ملازمت میں اردو نثر کی دو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ایک ان کی مایہ ناز تالیف "باغ و بہار" ہے، دوسری "گنج خوبی"۔ ادبی دنیا میں ان دو کتابوں میں سے "باغ و بہار" کی شہرت عالمگیر ہے۔ اس کی تالیف ۱۲۱۵ھ، ۱۸۰۰ء(۱) میں شروع ہو کر ۱۲۱۷ھ، ۱۸۰۲ء میں ختم ہوئی۔ کم و بیش دو سال کا عرصہ لگا۔ "باغ و بہار" تاریخی نام ہے اس سے ۱۲۱۷ھ نکلتا ہے۔(۲)

یہ عام روایت ہے کہ "باغ و بہار" امیر خسروؒ (م ۷۲۵ھ، ۱۳۲۵ء) کی فارسی کتاب "چہار درویش" کا آزاد اردو ترجمہ ہے۔ یہ ایک فرضی قصہ ہے، جس کی شان ایجاد یہ بتائی جاتی ہے کہ امیر خسروؒ کے پیر و مرشد ایک مرتبہ بیمار پڑے، تو وہ مرشد کے دل بہلانے کی خاطر یہ قصہ سناتے، اور تیمارداری کرتے تھے۔ اتفاق یہ ہے کہ مرشد کو کئی روز کے بعد خدا نے شفا بخشی۔ غسل صحت کے وقت مرشد نے یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصہ کو پڑھے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔

لیکن اصل میں اس قصہ کا امیر خسروؒ سے کوئی تعلق نہیں ہے' جدید تحقیقات کے مطابق اس کا موجد کوئی اور ہے اور محمد شاہ کے عہد میں فارسی میں لکھا گیا ہے۔ میر امن سے کئی سال قبل میر محمد عطا حسین خان تحسین نے قصہ "چہار درویش" کو "نو طرز مرصع" کے نام سے اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ اگرچہ میر امن نے کہیں اس کا اعتراف نہیں کیا' لیکن کتاب کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ تحسین کی "نو طرز مرصع" بھی ان کے سامنے تھی۔

بہر حال' "باغ و بہار" کا ماخذ کچھ بھی ہو' اس سے ہمیں بحث نہیں ہے۔ کتاب اصل میں جس جذبہ کے ماتحت اور جس مقصد کے پیش نظر تالیف کی گئی ہے' وہ جذبہ بہت ہی پاک اور وہ مقصد نہایت ہی بلند ہے۔ ارباب علم کے نزدیک جس چیز کی قدر ہونی چاہیئے' وہ یہی پاک جذبہ اور بلند مقصد ہے۔ چنانچہ اس کی قدر ہوئی اور خوب ہوئی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں کتاب تالیف ہوئی ہے' جس کی زبان آج کی زبان سے کافی مختلف ہے۔ انداز تحریر میں قدامت کی بو آتی ہے' لیکن آج بھی لوگ بڑے شوق سے اس کتاب کو پڑھتے ہیں' اور محظوظ ہوتے ہیں۔ اولاً اس کتاب کی تاریخی اہمیت ہے' دوم یہ کہ اس کی دلچسپی کافی بڑھی ہوئی ہے' اس لئے برصغیر کی قریب قریب تمام یونی ورسٹیوں کے کورس میں یہ کتاب شامل ہے۔

میر محمد عطا تحسین کے اور میر امن کے علاوہ بھی کئی لوگوں نے قصہ "چہار درویش" کا اردو نثر میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن جو قبولیت عامہ میر امن کی "باغ و بہار" کو نصیب ہوئی' وہ اور کسی کو نصیب نہیں۔ یہ کتاب ان کے لئے شہرت دوام کا باعث بنی۔ اس کی وجہ غالباً قصہ کی دلچسپی کے علاوہ زبان کی سلاست اور انداز بیان کی شگفتگی ہے۔ یہ کتاب کسی ایک خاص طبقہ کے لئے تالیف نہیں کی گئی۔ بلکہ ہر طبقہ کے لوگوں کے لئے تالیف کی گئی۔ بقول میر امن : "اب خداوند نعمت صاحب ثروت' نجیبوں کے قدرداں جان گل کرسٹ صاحب کہ ہمیشہ ان کا اقبال زیادہ رہے' جب تک گنگا جمنا ہے' لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں' جو اردو کے لوگ' ہندو مسلمان' عورت مرد' لڑکے بالے' خاص و عام' آپس میں بولتے چالتے ہیں' ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا' جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

میر امن نے اپنی کتاب میں ایسی جادو بیانی سے کام لیا ہے کہ اس کی مقبولیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ وہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے' خاص دلی کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے "باغ و بہار" اسی دلی کی شستہ و شائستہ زبان میں لکھی ہے۔ آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال پہلے یہ کتاب لکھی گئی تھی' اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس زمانہ کی بعض ترکیبیں بدل گئیں۔ بعض محاوروں کے معنی یکسر بدل گئے' بعض الفاظ متروک الاستعمال اور بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث

میں بھی کافی فرق پیدا ہو گیا، مگر اس کے باوجود لوگ اسے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اور میر امن کی عظمت کو دل سے تسلیم کرتے ہیں۔

"باغ و بہار" کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا، اس کے بعد سے اب تک اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔ اس کی مقبولیت کی وجہ سے ایل۔ ایف۔ اسمتھ نامی ایک انگریز نے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ہے، جو پہلی مرتبہ کلکتہ ہی سے ۱۸۴۲ء میں شائع ہوا۔ اس ترجمہ کے بھی کلکتہ، مدارس اور لندن سے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ڈنکن فاربس نے بھی ۱۸۵۷ء میں انگریزی میں اس کا خلاصہ لکھا۔ مشہور مستشرق گارسان دتاسی نے بھی فرانسیسی میں اس کا ترجمہ کر کے ۱۸۸۴ء میں پیرس سے شائع کیا۔(۳)

"باغ و بہار" کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"اب آغاز قصے کا کرنا چاہیے۔ ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔ سیر میں چہار درویش کے یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں ایک شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی۔ نام اس کا آزاد بخت اور شہر قسطنطنیہ جس کو استنبول کہتے ہیں، اس کا پایہ تخت تھا۔ اس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفہ، غریب و غربا آسودہ، امن و چین سے گزراں کرتے اور خوشی سے رہتے تھے کہ ہر ایک گھر میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ اور جتنے چور چکار اور جیب کترے، صبح خیزیے، اٹھائی گیرے دغا باز تھے، ان کو نیست و نابود کر کے نام و نشان ان کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے، اور دکانیں بازار کی کھلی رہتی تھیں۔ راہی مسافر جنگل، میدان میں سونا اچھالتے چلے جاتے۔ کوئی نہ پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کئے دانت ہیں، اور کہاں جاتے ہو۔ اس بادشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے، اور کئی سلطان نعلبندی دیتے۔ ایسی بڑی سلطنت پر ایک اپنے دل کو خدا کی یاد اور بندگی سے غافل نہ کرتا۔ آرام دنیا کا جو چاہیے، سب موجود تھا، لیکن فرزند کی طرف سے محروم تھا کہ جو زندگانی کا پھل ہے، اس کی قسمت کے باغ میں نہ تھا۔ اس خاطر اکثر فکرمند رہتا۔ پانچوں وقت کی نماز کے بعد اپنے کریم سے کہتا کہ اے اللہ مجھ عاجز کو تو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا، لیکن ایک اس اندھیرے گھر کو دیا نہ دیا۔"

میر امن نے "باغ و بہار" کے بعد اپنی دوسری کتاب "گنج خوبی" تالیف کی۔ یہ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب "اخلاق محسنی" کا اردو ترجمہ ہے۔ "اخلاق محسنی" اخلاقیات کی کتاب

ہے۔ ہر فارسی کا طالب علم اس سے واقف ہے۔ میر امن نے اس کا اردو نثر میں ترجمہ کر کے اردو ادب کی ایک مفید خدمت انجام دی۔ میر امن خود "گنج خوبی" کی تالیف و نام کے متعلق رقمطراز ہیں:

"سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے "باغ و بہار" کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔ از بسکہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہئیں' اور دنیا کی نیک نامی اور خوش معاشی کے لئے درکار ہیں' سو سب اس میں بیان ہوئیں' اس واسطے اس کا نام "گنج خوبی" رکھا۔"(۴)

میر امن کی یہ دوسری کتاب بہت ہی غیر معروف ہے۔ تذکروں میں صرف اس کا نام ملتا ہے۔ اس کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ غالباً فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع نہیں ہوئی اور ایک مدت کے بعد ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں پہلی مرتبہ مطبع محبوب بمبئی میں چھپی۔ سید محمد لکھتے ہیں' کتب خانہ آصفیہ میں اسی سنہ کا ایک بوسیدہ نسخہ ان کی نظر سے گزرا اور اسی سے انہیں یہ معلوم ہو سکا کہ اس کی تالیف "باغ و بہار" کے بعد ہوئی۔"(۵)

"گنج خوبی" کی تالیف بھی میر امن نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے حکم سے کی تھی۔ اس میں بھی انہوں نے جدت سے کام لیا ہے' مگر اتنی نہیں جتنی کہ "باغ و بہار" میں پائی جاتی ہے۔ پھر بھی ترجمہ میں اصلیت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ انہوں نے حتی المقدور ترجمہ سے گریز کیا۔ اس کے بارے میں خود میر امن نے لکھا ہے:

"لیکن فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا۔ اس لئے اس کا مطلب لے کر اپنے محاورہ میں سارا احوال بیان کیا۔"(۶)

"گنج خوبی" میں چونکہ اخلاقیات پر بحث ہے' اور پند و موعظمت کا ذکر کیا گیا ہے' اس لئے میر امن نے کہیں سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس میں موضوع کے لحاظ سے ہر جگہ متانت قائم ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"کہتے ہیں کہ ایک بزرگ نے جب اپنی زندگی کی امانت اجل کے فرشتے کو سونپی' اور اسباب اپنی ہستی کا اس سرائے فانی سے منزل باقی میں پہنچایا' کسی شخص نے انہیں خواب میں دیکھا اور پوچھا' کہو مرنے کے بعد تم پر کیا کیا واردات گزری' اور اب کیا حال ہے۔ جواب دیا کہ ایک مدت تئیں عذاب کے عقاب کے پنجے میں اور سختی کے شاہین کے چنگل میں گرفتار تھا۔ ایک بارگی کریم کے کرم سے اس حالت سے چھٹکارا ہوا اور سارے گناہ معاف ہو گئے۔ سائل نے پھر سوال کیا کہ اس کا کیا سبب اور

باعث ہے۔ کچھ تمہیں معلوم ہو تو بیان کرو کہ کس کے وسیلہ سے نجات پائی۔ بولے کہ ایک میدان میں مسافر خانہ بنایا تھا۔ شاید کوئی غریب راہ چلتا جیٹھ کے دنوں دوپہر کی دھوپ میں تونسا ہوا اس کے سایہ میں آن کر بیٹھا۔ اس نے کوئی دم آرام پایا۔ جب ٹھنڈی ہوا اور راہ کی ماندگی سے ہرا ہوا خوش ہو کر نہایت عاجزی سے بدل دعا کی کہ اے بار الٰہی اس مکان کے بنا کرنے والے کے گناہ بخش' اور اس کی روح کو فردوس کی چھاؤں میں جگہ دے۔ وہیں اس کی دعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر درست بیٹھا۔ میری آمرزش ہوئی۔ اوپر جہنم کے گڑھے سے نکال کر بہشت کے غرفہ میں رہنے کا حکم ہوا۔"

مندرجہ بالا اقتباس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "گنج خوبی" کی زبان بھی بڑی سلیس' شستہ اور شائستہ ہے۔ اس میں گنجلک بہت کم ہے۔ پھر بھی وہ کتاب انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں لکھی گئی تھی۔ اس لئے آج کی زبان سے قدرے مختلف ہونا لازمی ہے۔

حواشی

۱۔ سید محمد نے "ارباب نثر اردو" میں اور مولانا حامد حسن قادری نے ۱۲۱۵ھ کو ۱۸۰۱ء کے مطابق لکھا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے' ۱۸۰۰ء لکھا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے کہ جنتری دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۵ء کا بیشتر حصہ ۱۸۰۰ء میں پڑتا ہے۔ صرف اخیر کے چار مہینے ۱۸۰۱ء میں آتے ہیں۔

۲۔ داستان تاریخ اردو۔ مولانا حامد حسن قادری۔ صفحہ ۱۰۱۔

۳۔ ارباب نثر اردو۔ صفحہ ۵۱۔

۴۔ ارباب نثر اردو۔ صفحہ ۶۳۔

۵۔ ارباب نثر اردو۔ صفحہ ۶۳۔

۶۔ ارباب نثر اردو۔ صفحہ ۶۴۔

سید حیدر بخش حیدری

سید حیدر بخش حیدری دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آبا و اجداد نجف اشرف سے ہندوستان آئے تھے' اور دہلی میں بس گئے تھے۔ سلطنت مغلیہ کا زوال ہوا' اور معاشرہ کے حالات بگڑ گئے' تو ان کے والد سید ابوالحسن دہلی کو خیرباد کہہ کر بنارس چلے گئے۔ حیدری نے پہلے دہلی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ باپ کے ساتھ بنارس چلے گئے تو نواب علی ابراہیم خان خلیل کی جو لارڈ ہیسٹنگز کے زمانہ میں ناظم عدالت مقرر ہوئے تھے' شاگردی اختیار کی۔ ان سے فارسی پڑھی اور اس میں دستگاہ حاصل کی۔ اس کے بعد انہیں اور ایک عالم قاضی عبدالرشید کی صبحت نصیب ہوئی' جن سے انہوں نے فارسی کے علاوہ عربی بھی پڑھی تھی۔ حدیث' تفسیر' فقہ وغیرہ کی تعلیم مولوی غلام حسین غازی پوری سے حاصل کی تھی۔

حیدری کے سنہ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ محمد یحییٰ تنہا نے سیئر المصنفین میں ۱۸۲۸ء لکھا ہے۔ لیکن سید محمد نے "ارباب نثر اردو" میں ۱۸۲۳ء میں بتایا ہے' جس کی تائید مولانا حامد حسن قادری نے بھی "داستان تاریخ اردو" میں کی ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں جب ڈاکٹر گل کرسٹ ملک کے گوشے گوشے سے قابل ادیبوں اور منشیوں کو جمع کر رہے تھے' تو حیدر بخش حیدری بھی تلاش روزگار کے لئے کلکتہ پہنچے۔ قصہ "مہر و ماہ" کے نام سے سلیس اردو نثر میں ایک کتاب انہوں نے پہلے ہی مرتب کر رکھی تھی۔ وہ ساتھ لے گئے' اور ڈاکٹر گل کرسٹ کے ملاحظہ کے لئے پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو کتاب پسند آئی' اور حیدری کو نوکر رکھ لیا۔ یہ صحیح پتا نہیں چلتا کہ حیدری کلکتہ میں کب سے کب تک رہے۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ وہ ۱۲۲۹ھ ر ۱۸۱۴ء سے پہلے کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر بنارس واپس آ گئے تھے۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں سید حیدر بخش حیدری نے سب سے زیادہ کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ان کی پہلی کتاب شاید "قصہ مہر و ماہ" ہے۔ جو انہوں نے اوائل ۱۲۱۴ھ ر ۱۷۹۹ء میں لکھی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ دوسری کتاب "قصہ لیلیٰ مجنوں" ہے' جو حضرت امیر خسرو

کی فارسی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں مکمل ہوا۔ اس کا بھی اب کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

اردو نثر میں حیدری کی تیسری کتاب "طوطا کہانی" ہے۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی "طوطا کہانی" مولانا ضیاء الدین بخشی کی فارسی کتاب "طوطی نامہ" کا ترجمہ ہے۔ مولانا ضیاء الدین کی "طوطی نامہ" بھی ترجمہ ہے، جو انہوں نے ۷۳۰ھ/۱۳۲۰ء میں سنسکرت کتاب "شکاسب تتی" سے براہ راست کیا تھا۔ اصل سنسکرت کتاب میں ستر کہانیاں تھیں، لیکن مولانا ضیاء الدین بخشی نے اس کے صرف باون قصوں کا انتخاب کیا ہے۔ ان کی اس فارسی کتاب کی زبان بہت مشکل اور مغلق ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی کافی شہرت ہوئی، اور فارسی ہی میں اس کے کئی اور خلاصے لکھے گئے، جن میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک شیخ ابو الفضل کا خلاصہ، دوسرا سید محمد قادری کا۔ آخر الذکر خلاصے کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ حیدری نے اس سے اردو ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے یہ ترجمہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں مکمل کر کے "طوطا کہانی" نام رکھا۔ حیدری اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "یہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی تعلیم یافتہ مجلس خاص نواب علی ابراہیم خان بہادر مرحوم و شاگرد غلام حسین خان غازی پوری دست گرفتہ صاحب عالی جناب سخندان صاحب والا شان جان گل کرسٹ بہادر دام اقبالہ کا ہے۔ اگرچہ تھوڑا بہت ربط موافق اپنے حوصلہ کے عبارت فارسی میں بھی لکھتا ہے، لیکن بہ موجب فرمائش صاحب موصوف کے ۱۲۱۵ مطابق ۱۸۰۱ء کے محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین بخشی ہے، زبان ہندی میں موافق محاورہ اردوئے معلی کے عبارت سلیس و خوب الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا۔"

حیدری کی یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۰۴ء میں کالج کی طرف سے شائع ہوئی، اور اسے قبولیت کا شرف حاصل ہوا۔ کالج کے نصاب میں داخل کر لی گئی۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر اس کے آج تک بیسویں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۸۵۳ء میں ڈنکن فاربس نے لندن سے اس کا ایک نہایت خوشنما ایڈیشن شائع کیا، جس میں تمام مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی شامل ہے۔ جی اسمال نامی ایک انگریز نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ کتاب کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> "طوطا کہنے لگا اے خجستہ یہ کیا کہتی ہے۔ دوستوں کی بات ماننا چاہیے۔ کیونکہ جو کہنا دوستوں کا نہیں مانتا خراب ہوتا ہے، اور پشیمانی کھینچتا ہے، جس طرح سے ایک

شخص نے دوست کا کہنا نہ مانا اور پشیمان ہوا۔ خجستہ نے کہا' میرے اچھے طوطے' میں تیرے صدقے' وہ کونسی نقل ہے' بیان کر۔ طوطا بولا کہ کسی شہر میں چار یار مالدار تھے۔ اتفاقاً" وہ چاروں مفلس ہو کر ایک حکیم کے پاس گئے' اور ہر ایک نے اپنا اپنا احوال اس کے آگے ظاہر کیا۔ تب حکیم کو ان کے اوپر رحم آیا اور ایک ایک مہرہ حکمت کا ان چاروں کو دے کر کہا کہ یہ مہرہ ہر ایک اپنے اپنے سر پر رکھو اور چلے جاؤ' جس کے سر کا مہرہ جس جگہ گرے' وہ اس جگہ کو کھودے جو اس میں سے نکلے وہ اس کا حق ہے۔ آخر وہ چاروں ہر ایک مہرہ اپنے سر پر رکھ کر ایک طرف کو چلے۔ جب کئی کوس گئے' ایک کے سر کا مہرہ گرا۔ اس نے اس جگہ کو کھودا تو تانبا نکلا۔ اس نے تینوں سے کہا کہ میں اس تانبے کو سونے سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر تمہارا جی چاہے تو میرے ساتھ یہاں رہو۔ انہوں نے کہنا اس کا نہ مانا اور آگے بڑھے۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ دوسرے کے سر کا مہرہ گرا۔ اس نے جو زمین کھودی تو روپیہ نکلا۔ تب اس نے ان دونوں سے کہا کہ تم ہمارے پاس رہو۔ یہ روپیہ بہت ہے۔ زندگی گزر جائے گی۔ اس کو اپنا ہی سمجھو۔ انہوں نے اس کا کہنا نہ مانا اور آگے بڑھے کہ تیسرے کے سر کا مہرہ گرا۔ اس نے بھی وہ زمین کھودی' تو سونا نکلا۔ تب خوش ہو کر چوتھے سے کہنے لگا کہ اس سے اب کوئی چیز بہتر نہیں جانتے ہیں کہ اب ہم تم کہیں رہیں۔ اس نے کہا کہ میں اگر جاؤں گا تو جواہر کی کان پاؤں گا۔ یہاں کیا رہوں۔ یہ کہہ کر آگے چلا۔ قریب ایک کوس کے پہنچا تو اس کا بھی مہرہ گرا۔ اسی طرح جو اس نے جگہ کھودی تو لوہا نکلا۔ یہ حالت دیکھ کر نہایت شرمندہ ہوا اور اپنے جی میں کہنے لگا کہ میں نے کیوں سونے کو چھوڑا اور اپنے یار کا کہنا نہ مانا۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ "طوطا کہانی" کی زبان بہت صاف' سلیس اور رواں ہے۔ اس کا طرز بھی سادہ اور دلکش ہے۔ اس میں قدیم اردو نثر کی طرح قافیہ پیمائی' مغلق عربی فارسی الفاظ کی کثرت اور تشبیہات و استعارات کا بے جا استعمال نہیں ہے۔ فورٹ ولیم کالج کا مقصد و منشا ہی یہ تھا کہ سادہ اور عام فہم زبان میں اردو نثر کی کتابیں مرتب کرائی جائیں۔ پھر بھی اپنی اپنی افتاد طبع ہوتی ہے۔ اس کالج کے مصنفین میں بعض ایسے بھی ملیں گے' جن کی نثر طرز جدید کی بہ نسبت طرز قدیم سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ سید حیدر بخش حیدری ان میں سے نہیں ہیں۔ ان کا قدم آگے کی طرف چلتا ہے' پیچھے کی طرف نہیں۔

سید حیدر بخش حیدری کی چوتھی کتاب "آرائش محفل" ہے۔ یہ فارسی قصہ "حاتم طائی" کا اردو ترجمہ ہے' جو انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے کہنے پر ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ء کے اوائل میں کیا تھا۔ یہ فارسی سے صرف ترجمہ ہی نہیں' بلکہ مترجم نے اس میں موقع و محل کے لحاظ سے بہت کچھ حذف و اضافہ سے بھی کام لیا ہے' جس سے اصلیت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے اسے حیدری کی تالیف ہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ اس سلسلے میں دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اس میں اپنی طبع کے موافق جہاں موقع پایا' وہاں اور زیادہ کیا' تاکہ قصہ طولانی ہو جائے۔ سننے والے کو خوش آئے۔"

یہ کتاب اب تک متعدد بار چھپ چکی ہے۔ امتداد زمانہ سے اگرچہ یہ قصہ اب فرسودہ ہو چکا ہے' اور پہلے کی طرح اس کی طرف عوام کی توجہ اتنی زیادہ نہیں ہے' لیکن اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ اردو نثر میں جدید اسلوب کو معرض وجود میں لانے میں "آرائش محفل" جیسی کتابوں کا بڑا دخل ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"حسن بانو نے کہا کہ دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے دروازہ پر لکھ کر لگا دیا ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ یہ کیا بھید ہے' اور اس نے کیا نیکی کی ہے' اس کی خبر لا۔ اس سخن کے سنتے ہی حاتم اٹھ کھڑا ہوا اور حسن بانو سے پوچھنے لگا کہ وہ شخص کون ہے اور کس طرف کو رہتا ہے۔ حسن بانو نے کہا' میں نے اپنی دائی سے سنا ہے کہ اس کی جگہ اتر کی طرف ہے۔ پس اتنی بات دریافت کر کے وہاں سے توکل بخدا چل نکلا۔ بعد ایک مدت کے کسی جنگل ہیبت ناک میں جا پہنچا اور شام کے وقت ایک درخت کے نیچے چپکا ہو کے بیٹھ رہا کہ اتنے میں ایک آواز سوزناک درد آلودہ ساتھ آہ و زاری کے کسی طرف سے اس کے کان میں ایسی پڑی کہ جس کے سنتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لایا' اور کلیجا جلنے لگا۔ بے اختیار اپنے جی میں کہنے لگا کہ اے حاتم' یہ بات جوان مردی سے دور ہے کہ ایک شخص بندۂ خدا کسی آفت میں گرفتار ہو کر رو دے تو اس کی آواز سن کر مدد نہ کرے' اور اس کا احوال نہ پوچھے۔ اس کام کو دل میں ٹھہرا کر اس طرف کا راستہ پکڑا۔ تھوڑی دور گیا ہو گا کہ اس جگہ جا پہنچا کہ جہاں سے رونے کی آواز آتی تھی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک جوان خوبصورت سطح خاک پر بیٹھا گوہر اشک چشمہ چشم سے اپنے گل رخسار نازنین پر بہا رہا ہے۔"

اردو نثر میں سید حیدر بخش حیدری کی پانچویں کتاب "تاریخ نادری" ہے۔ اس میں نادر شاہ

کے حالات، اس کی وفات (۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء) کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اصل کتاب فارسی میں ہے، جس کا مصنف محمد مہدی استر آبادی ہے۔ حیدری نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کا نام اصل میں "تاریخ جہاں کشائے نادری" ہے لیکن عام طور پر وہ "تاریخ نادری" کے نام سے مشہور ہے۔ حیدری نے بھی اس عرف عام کی بنا پر ترجمہ کا نام "تاریخ نادری" ہی رکھا۔ یہ ترجمہ ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں ختم ہوا تھا، لیکن آج تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا، اس لئے اس کی عبارت کا نمونہ بھی نہیں مل سکا۔ البتہ سید محمد "ارباب نثر اردو" میں لکھتے ہیں:

"یہ کتاب حیدری کا نہایت ہی قابل قدر کارنامہ ہے۔ اردو زبان کا دامن اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی ایسی علمی اور اہم کتابوں سے بہت کچھ خالی ہے۔"(۱)

حیدری کی چھٹی کتاب "گل مغفرت" ہے۔ یہ ملا حسین الواعظ کاشفی کی "روضتہ الشہدا" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کا نام پہلے تو انہوں نے "گلشن شہیدان" رکھا تھا۔ لیکن بعد میں جب اپنے ایک دوست کی تحریک پر ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء میں صرف شہدائے کربلا کے حالات پر مشتمل ایک انتخاب مرتب کیا، تو اس کا نام "گل مغفرت" رکھا۔ اس میں انہوں نے اپنی طرف سے بھی کافی نظم و نثر کے حصے اضافے کئے ہیں۔

"گل مغفرت" ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء میں پہلی مرتبہ کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کے دو تین ایڈیشن اور شائع ہوئے۔ لیکن آج کل یہ کتاب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ برٹ ریان نامی ایک فرانسیسی نے ۱۸۴۵ میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے پیرس سے شائع کیا۔ "گل مغفرت" کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"حاصل کلام وہ نیک انجام بعد تھوڑے دنوں کے مر گیا۔ شب کے وقت کسی شخص نے اسے خواب میں دیکھا کہ تاج ایک مرصع سر پر دھرے خلعت شاہانہ پہنے کار چوبی پٹکا کمر میں باندھے ہوئے حور و غلمان اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک اسپ خوش خرام پر سوار ہے، اور بہشت بریں کی سیر کرتا پھرتا ہے۔ پوچھا۔ اس نے کہا اے شخص پہلے میں غضب الٰہی میں گرفتار ہوا تھا۔ بعد میں اس کے حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم و الم یاد کرنے اور آپ کے حال زار پر رونے کے صدقے سے بخشا گیا۔ یقین ہے کہ جو کوئی آپ کے ماتم میں شریک ہو گا، اور آپ کا رنج و الم یاد کر کے روئے گا، یہ گریہ و زاری حشر کے دن اس کے کام آوے گی۔ موجب نجات کا ہو گا۔"

حیدری کی ساتویں کتاب "گلزار دانش" ہے۔ یہ شیخ عنایت اللہ کی مشہور فارسی کتاب "بہار دانش" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ایک نیم تاریخی قصہ ہے' جس میں جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کے معاشقہ اور جہاندار شاہ کی مہموں اور مبارز طلبیوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اب نایاب ہے۔

آٹھویں کتاب "گلدستہ حیدری" ہے۔ یہ حیدری کے متفرق مضامین' دیباچوں اور نظموں کا مجموعہ ہے' جو انہوں نے ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں مرتب کیا تھا۔ لیکن یہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ صرف قلمی نسخے ہیں۔ اس کے پانچ حصے ہیں:

۱۔ مجموعہ مراثی۔

۲۔ مجموعہ حکایات۔ اس میں انہوں نے اپنے حالات زندگی لکھے ہیں' اور سو سے زیادہ قصے اور لطیفے شامل کئے ہیں۔

۳۔ قصہ مہر و ماہ کا دیباچہ۔

۴۔ قصہ لیلی مجنوں کا دیباچہ۔

۵۔ دیوان غزلیات۔

حیدری کی نویں کتاب "گلشن ہند" ہے۔ یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی۔ شاید حیدری نے اسے معیاری نہ سمجھا ہو' اور اس قابل نہ تصور کیا ہو کہ گرسٹ کے سامنے پیش کیا جائے۔ بہرحال' کسی نہ کسی وجہ سے وہ کتاب طباعت ہونے سے رہ گئی۔ "گلشن ہند" شاعروں کا تذکرہ ہے' جو ایک دوست کی تحریک پر ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں لکھا گیا۔ فورٹ ولیم کالج کے اور ایک کارکن مرزا علی لطف نے بھی ڈاکٹر گل کرسٹ کے حکم سے "گلشن ہند" کے نام سے شاعروں کا ایک تذکرہ لکھا ہے' جس کا ذکر آگے آئے گا۔ حیدری کے تذکرے کا ایک قلمی نسخہ آکسفورڈ یونی ورسٹی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے۔ برٹش میوزیم میں بھی اس کا ایک نامکمل نسخہ موجود ہے۔ اس کی عبارت کا ایک اقتباس جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے برٹش میوزیم کے نسخے سے نقل کر کے سید محمد کو بھیجا تھا' حسب ذیل ہے:

"اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص کے جمع کئے اور کئی جز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس ہے کہ وہ جز حرف شین سے لے کر حرف ی تک خدا جانے کیا ہوئے اس واسطے نوبت تحریر حرف ی تک نہ پہنچی۔ انشاء اللہ تعالی اگر زمانہ اس صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے' تو یہ خاکسار پھر نئے سرے سے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے اور یہ جلد

دوچار جز کی جو کلام و ادبیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہ کی کہ وہ دستگیر درماندگان اور حامی بے کسان ہے۔ اللہ تعالی دنیا میں خوش و خرم رکھے اسے اور مشکل کشا اس کی مشکل کشائی کیا کرے۔ بہ حق محمد و آلہ الامجاد۔"

حیدری کی تالیفات جو دستیاب ہو سکتی ہیں یا جن کتابوں کے اقتباسات مل سکتے ہیں' ان سے پتا چلتا ہے کہ ان کا عام رجحان سادگی کی طرف ہے۔ پر پیچ انداز انہیں چنداں مرغوب نہیں ہے۔ میر امن نے "باغ و بہار" میں روزمرہ اور محاوروں پر زیادہ زور دیا' اس لئے اس کی زبان میں روانی ذرا کم ہو گئی ہے۔ لیکن حیدری کا میلان طبع روزمرہ اور محاوروں کی طرف اتنا نہیں' جتنا کہ سادگی کی طرف ہے۔ انہوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ عبارت میں نشیب و فراز پیدا نہ ہونے پائے' بلکہ سادہ اور صاف ستھری ہو۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کہیں کہیں عربی فارسی الفاظ ذرا زیادہ استعمال کئے گئے۔ لیکن زمانہ کا لحاظ رکھا جائے' تو یہ کوئی اتنا بڑا عیب نہیں۔ ان کا زمانہ آج سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے کا ہے۔ اس لئے قدامت یکسر چھٹ نہیں سکتی' اور پرانی روش ایک دم ختم نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ حیدری کی تالیفات دوسروں کی تالیفات کی طرح فارسی سے ترجمہ ہیں' اور ترجمہ کی زبان میں لاکھ کوشش کی جائے' ذرا اتار چڑھاؤ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ بات حیدری کے ہاں بھی ہے۔

حواشی

۱۔ ارباب نثر اردو صفحہ ۸۰۔

میر شیر علی افسوس

میر شیر علی افسوس کے آباؤ اجداد باہر سے ہندوستان آئے اور قصبہ نارنول' آگرہ میں سکونت اختیار کی۔ افسوس کے دادا محمد شاہ کے عہد حکومت (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء-۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) میں اپنے دونوں بیٹوں سید علی مظفر خاں اور سید غلام علی خان کو ساتھ لے کر دہلی آئے اور عمدۃ الملک امیر خان کی ملازمت اختیار کی۔ اسی زمانہ میں شیر علی افسوس پیدا ہوئے۔ افسوس کے باپ کا نام سید علی مظفر خان تھا۔ ۱۱۹۵ھ/۱۷۴۶ء میں عمدۃ الملک کا انتقال ہو گیا' تو ان کی جگہ افسوس کے چچا سید غلام علی خان الہ آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ محمد شاہ کے بعد سلطنت درہم برہم ہو گئی' اور غلام علی خان بھی انتقال کر گئے' تو افسوس کے والد پٹنہ چلے گئے' اور نواب بنگال میر قاسم کے ہاں ملازم ہو گئے۔ میر قاسم کے بعد میر جعفر کے ہاں ۱۷۶۰ء تک ملازم رہے۔ وہاں سے لکھنؤ آئے اور نواب شجاع الدولہ کے ہاں نوکر ہو گئے۔ افسوس جب باپ کے ساتھ بنگال میں تھے' تو ان کی عمر کوئی گیارہ سال کی تھی۔ اسی وقت سے انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ لکھنؤ آئے تو اساتذہ سخن میر' سودا' جرات و انشا کی صحبتوں سے اس ذوق کو اور جلا ملی۔ شاعری کی خوب مشق کی اور اصحاب ذوق سے داد سخن لی۔ لکھنؤ میں وہ سرفراز الدولہ کی سرپرستی میں تھے۔ فورٹ ولیم کالج میں قابل اہل قلم کی ضرورت ہوئی تو ۱۸۰۱ء میں سرفراز الدولہ نے لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کرنل اسکاٹ سے ان کی سفارش کر کے کلکتہ بھجوا دیا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے انہیں دو سو روپیہ ماہوار پر نوکر رکھ لیا۔ افسوس کا انتقال ۱۸۰۹ء میں ہوا۔

اردو نثر میں افسوس کی کتاب "باغ اردو" مشہور ہے۔ یہ ان کا شاہکار ہے۔ ان کا نام آج اسی کارنامہ سے زندہ ہے۔ "باغ اردو" شیخ سعدیؒ کی "گلستان" کا اردو ترجمہ ہے۔ "باغ اردو" کے سنہ تالیف کے بارے میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی رائے ہے کہ ۱۸۰۸ء میں تالیف ہوئی ہے۔ محمد یحییٰ انتہا نے "سیر المصنفین" میں بھی یہی سنہ لکھا ہے۔ لیکن کتاب داخلی شہادتوں کی بنا پر مصنف "ارباب نثر اردو" نے اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء ثابت کیا ہے۔

"باغ اردو" خود افسوس کے زیر اہتمام ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ آج کل یہ کتاب بہت کم یاب ہے۔ سید محمد نے لکھا ہے کہ ان کے پیش نظر جو نسخہ تھا' وہ کلکتہ میں ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں طبع ہوا' اور وہاں کی قدیم مطبوعات کی طرح ٹائپ کے حروف پر ہے۔ وہ نسخہ بالکل مکمل اور اچھی حالت میں تھا۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ جلسہ عثمانیہ حیدر آباد کے کتب خانہ میں بھی اسی سنہ اور مطبع کا ایک نسخہ موجود ہے۔(۱)

عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ حکایت:

"ایک دوست سے میں نے کہا کہ چپ رہنا میں نے اس سبب سے اختیار کیا ہے کہ بولنے میں اکثر اوقات نیک و بد کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ اور آنکھ دشمن کی سوائے بدی کے کچھ نہیں دیکھتی۔ بولا وہ کہ دشمن وہی بہتر ہے کہ نیکی نہ دیکھے۔ شعر:

ہے بڑا عیب ہنر دشمن کی آنکھوں میں

پھول ہے سعدی پر ہے آنکھ میں دشمن کی خار

بیت

گو جہاں روشن ہے سورج سے سدا

پر چھچھوندر کی نظر میں ہے برا

حکایت: ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں۔ کہا اس نے کہ بہ ظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ۔

جس کو ظاہر میں متقی دیکھے

اس کے تقویٰ کا تو نہ کر انکار

کھوج مت کر کسی باطن کی

محتسب را درون خانہ چہ کار

مندرجہ بالا اقتباس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ افسوس نے گلستان کا اردو میں اچھا ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے حتی الوسع یہ کوشش کی کہ ترجمہ کی زبان سلیس اور صاف ہو' اور وہ اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ان کا ترجمہ اس زمانہ کی اردو کا اچھا نمونہ ہے۔ اس میں میرامن کی "باغ و بہار" کی طرح روزمرہ اور محاوروں پر زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ اس کی عبارت میں سلاست اور روانی کے ساتھ سنجیدگی اور وقار پایا جاتا ہے۔

اردو نثر میں افسوس کی دوسری قابل قدر کتاب "آرائش محفل" ہے۔ یہ منشی سبحان رائے

کی ہندوستان کی معتبر اور مستند فارسی تاریخ "خلاصتہ التواریخ" کا اردو ترجمہ ہے' جو انہوں نے مسٹر جے- ایچ- مارنگٹن کے ایما پر ۱۲۱۹ھ ر ۱۸۰۴ء میں شروع کر کے ۱۲۲۰ھ ر ۱۸۰۵ء میں ختم کیا- اور "آرائش محفل" نام رکھا- افسوس کی "آرائش محفل" پہلی مرتبہ ۱۸۰۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی' اور اردو کے اعلیٰ امتحانات کے کورس میں داخل ہوئی- کلکتہ ہی سے اس کے دو اور ایڈیشن ۱۸۴۰ء میں اور ۱۸۶۳ء میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے- اس کی مقبولیت کی بنا پر لکھنؤ اور لاہور سے بھی اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے- ۱۸۴۷ء میں جان شیکسپیئر نے اس کے دس باب کا انگریزی میں ترجمہ کیا' اور اپنی "منتخبات ہندی" مطبوعہ ڈبلن میں شائع کیا- اس کے بعد میجر ہنری کورٹ نے پوری کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ۱۸۷۱ء میں الہ آباد سے اور ۱۸۸۲ء میں کلکتہ سے دو الگ الگ ایڈیشن نکالے-(۲)

"آرائش محفل" میں پہلے غیر منقسم ہندوستان اور اس کے مختلف صوبجات کا حال تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے- یہاں کی پیداوار وغیرہ کا بھی ذکر ہے- پھر زمانہ قدیم سے لے کر فتوحات اسلامیہ تک کی جامع اور وسیع تاریخ لکھی گئی ہے- عبارت کا نمونہ یہ ہے :

"جب سے یہ مرکز خاکی آرام گاہ حیوانات ہوا' سینکڑوں لاکھوں شہر قصبے بسے اور بستے جاتے ہیں- کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ- لیکن ہندوستان کی سر زمین کا عالم سب سے نرالا ہے- کوئی ولایت اس کی وسعت کو نہیں پہنچتی- اور کسی مملکت کی آبادی اس کو نہیں لگتی- یہاں کی ہر ایک بستی میں گہما گہمی جا بجا ایک نئی طرح کا عالم' ہر شہر و قصبہ میں ستھری پاکیزہ پختہ متعدد سرائیں مسافر کے واسطے ہر موسم کے اوڑھنے بچھونے اور اقسام کی غذائیں' اکثر بیسیوں مسجدیں' خانقائیں' مدرسے' باغات' غریبوں' بے کسوں' مسافروں کے لئے متعدد مکانات- قلعے بڑے بڑے مضبوط وسعت میں ایسے کہ سینکڑوں گاؤں ان میں بسیں' اور رفعت میں اس قدر کہ بادل ان کے نیچے برسیں- ندی' نالے' تالاب' کوئیں لطیف و پاکیزہ ہزارہا- پانی ان میں میٹھا ٹھنڈا ستھرا بھرا ہوا- بڑے بڑے دریاؤں میں کشتیاں نواڑے .بجرے وغیرہ بے شمار- شاہ راہ کے ندی نالوں پر بیشتر مقاموں پر پل بند ہے ہوئے تیار- اکثر راستوں میں کوسوں تک سایہ دار درختوں کی دو طرفہ قطار- ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک ایک مینار نمودار- ہر ایک چوکی پر تمام چیزیں مہیا- سودے والوں کی دکانیں جا بجا- مسافر خوش و خرم- کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے دن بھر چلے جاتے ہیں' اور شام کو منزل پر بھی سب طرح کا آرام پاتے ہیں-

بیت
جہاں دیکھئے خیر ہی خیر ہے
سفر یہ نہیں باغ کی سیر ہے

سوا اس کے کہ راہ میں اگر سونا اچھالتے چلے جائیں، کہیں خطرہ نہیں، اور جنگل میں جہاں چاہیں، سو رہیں، کچھ پرواہ نہیں، چنانچہ ہمیشہ سوداگر بنجارے مال و متاع غلہ دور دور سے بھرلاتے ہیں، اور منزل مقصود پر سلامت جوں کا توں پہنچ جاتے ہیں۔"

"آرائش محفل" کی عبارت جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے، فورٹ ولیم کالج کی قائم کردہ روایت کے مطابق صاف اور سلیس ہے۔ لیکن قدیم روش کے مطابق کہیں کہیں قافیہ پیمائی کا التزام پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ افسوس کی ذہنی نشو و نما اسی قسم کے ادبی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس سے یکایک اپنے آپ کو آزاد کرنا ذرا مشکل تھا۔ پھر بھی وہ بہت حد تک اس طرز سے آزاد ہیں۔ قافیہ پیمائی کا ایک آدھ جگہ جو ہلکا نمونہ ملتا ہے، اس سے عبارت کی روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

"آرائش محفل" کا موضوع تاریخی ہے۔ اس لئے اس کی زبان اور انداز بیان جیسا ہونا چاہئے، بالکل ویسا نہیں۔ اس میں اس عہد کی دوسری عام کتابوں کی طرح ذرا مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ مبالغہ آرائی داستان یا افسانوی ادب کے لئے بالکل موزوں ہے، لیکن تاریخ کی کتاب کے لئے بیجا ہے۔ اس سے تاریخ کی اہمیت گھٹ جاتی ہے۔ بہرحال، شیر علی افسوس بھی زمانہ کے تقاضے سے مجبور تھے، اور شاید ان کی افتاد طبع کو بھی اس قسم کی عبارت لکھنے میں کچھ دخل تھا۔

حواشی

۱۔ ارباب نثر اردو، صفحہ ۱۰۲۔

۲۔ ارباب نثر اردو، صفحہ ۱۰۸-۱۰۹۔

میر بہادر علی حسینی

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں میر بہادر علی حسینی کافی مشہور ہیں۔ لیکن ان کے ذاتی حالات کا زیادہ پتا نہیں چلتا۔ غالباً دہلی کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام سید عبداللہ کاظم تھا۔ سنہ وفات بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اردو نثر میں ان کی کئی کتابیں یادگار ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

"ان کی پہلی کتاب "نثر بے نظیر" جو میر حسن کی شہرہ آفاق مثنوی "سحرالبیان" کا نثری خلاصہ ہے۔ یہ خلاصہ انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے حکم پر تیار کیا تھا، تاکہ اردو کے نو آموز لوگ میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کے مطالب سے آسانی کے ساتھ آگاہ ہو کر لطف اندوز ہو سکیں۔ بقول میر بہادر علی حسینی: "پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرز سہل واسطے صاحبان نو آموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی کہ اس داستان شیریں کو (کہ فی الحقیقت قصہ شیریں سے شیریں تر ہے) اس رویہ سے نثر کروں کہ ہر ایک زبان دان و شاعر اس کو سن کر عش عش کرے، اور اس ہیچمدان کی ایک یادگاری اس دنیا میں رہے۔"(۱)

یہ کتاب ڈاکٹر گل کرسٹ کے زیر اہتمام اصل مثنوی کے ساتھ ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن میر شیر علی افسوس کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنی بیاض ہندی میں بھی اس کا ایک نمونہ شائع کیا ہے۔ بعد میں مختلف جگہوں سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ ایم۔ ایچ۔ اے۔ کورٹ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ۱۸۷۱ء میں شملہ سے شائع کیا۔ یہ کتاب آج کل کمیاب ہے۔ برٹش میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ سید محمد، مولف "ارباب نثر اردو" کو بڑی کوشش کے بعد کالج پریس، کلکتہ سے ۱۸۰۷ء کا مطبوعہ ایک نسخہ ملا تھا، جو چھوٹی تقطیع کے ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔(۲) عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"جب گیارہ برس خیریت سے گزرے' بارہواں برس آیا' الحمد اللہ۔ جس دن کی آرزو تھی سو کریم نے ساتھ خوشی کے دکھایا۔ شادی محل میں چاروں طرف بچ گئی۔ مبارک بادی کی صدا پھر بلند ہوئی۔

نظم:

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی
کھلی گھڑی غم کے جنجال کی

چار گھڑی دن رہے عرض بیگی کو بادشاہ نے ارشاد کیا کہ صبح سواری مبارک جلوس سے تیار ہو کہ میں شہزادے کو لے کر سوار ہوں گا۔ تا رعیت اور سپاہ اس کا دیدار دیکھ کر شاد ہو اور بستی ان کے دل کی بھی آباد ہو۔ تم نقیبوں کی تاکید کرو گھر گھر یہ حکم پہنچا دیں' اور ہر ایک چھوٹے بڑے کو جتا دیں کہ زرق برق سے نکلے اور تمام اسباب سواری کا بھی نیا اور جگمگا ہو۔ خبردار ایک سوار میلا اور ایک گھوڑے کا زین پرانا نظر نہ آوے۔ احیاناً کسی کو اس وقت گر کوئی چیز میسر نہ آوے تو سرکار سے بے تکلف لیوے کہ ما بدولت کی مرضی اور خوشی اسی میں ہے۔"

اس کتاب پر تبصرہ کرنے کے لئے کوئی نئی بات ایسی نہیں ہے' جو قابل ذکر ہو۔ فورٹ ولیم کالج کی تمام تصنیفات کا جو انداز پایا جاتا ہے' وہ اس میں بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گل کرسٹ نے سب کے لگام ایک ہاتھ سے تھام رکھے ہیں کہ ایک ہی شاہراہ پر گامزن ہوں۔ گویا طرز کہن سے آزاد ہو کر طرز نو اختیار کرنے کے لئے وہ ہر مصنف کو مجبور کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان کے دل کی بھڑاس کہیں کہیں نکل ہی آتی ہے' اور ایک آدھ جملے اپنے آبا و اجداد (ادبی لحاظ سے) کی روش میں قافیہ کی پابندی کے ساتھ لکھ ہی جاتے ہیں۔

اردو نثر میں میر بہادر علی حسینی کی دوسری گراں مایہ تالیف "اخلاق ہندی" ہے۔ یہ کتاب ترجمہ از ترجمہ ہے۔ اصل کتاب زمانہ قدیم میں "ہتو پدیش" کے نام سے سنسکرت میں لکھی گئی تھی' جس کے فارسی میں دو ترجمے ہوئے۔ ایک کا نام "نگار دانش" ہے' جو عام طور پر مشہور ہے۔ دوسرے ترجمہ کا نام "مفرح القلوب" ہے' جو مفتی تاج الدین نے کیا تھا۔ میر بہادر علی حسینی کے پیش نظر آخر الذکر فارسی ترجمہ تھا۔ انہوں نے اس کا ترجمہ ۱۲۱۷ھ ر ۱۸۰۲ء میں سلیس اردو نثر میں کر کے "اخلاق ہندی" نام رکھا جو ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوا۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں اس کے کوئی دس بارہ ایڈیشن کلکتہ' بمبئی' مدراس' بنگلور اور لندن سے شائع ہوئے۔ آج کل اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ خود مولف کے زمانہ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔(۳)

عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"ایک پرانا سانپ کہ اس میں چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی تھی' ایک جھیل کے کنارے پر آہستہ آہستہ آ کر غمگین ہو بیٹھا- تب مینڈکوں کے بادشاہ نے اس سے پوچھا' اے سانپ' تجھے کیا ہوا ہے جو اتنا دلگیر ہے- اس نے جواب دیا کہ تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی نبیڑ- مینڈک بولا' اے سانپ ناخوش کیوں ہوتا ہے- اگر کچھ تیری چیز پانی میں گر پڑی ہو' تو کہہ دے اپنے لشکر کو حکم کروں کہ بجنسہ اس چیز کو ڈھونڈ لاوے- اس نے کہا اے مینڈک- اس شہر میں ایک برہمن کا لڑکا بہت خوبصورت تھا- اس کو میں نے کاٹا- ماں باپ نے اس کے درد سے کھانا پینا سب چھوڑ دیا- اس کے بھائی نے اس کو سمجھا بجھا کر کھلایا پلایا- یوں اسے نصیحت کی کہ بھائی صبر کیجئے- سب کی یہی راہ ہے- تب برہمن یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ اے دوستو' میں اس گاؤں میں نہ رہوں گا- کس واسطے کہ یہی ایک لڑکا میرا تھا' سو خدا کی راہ میں گیا- اب مجھے بستی سے کیا کام- بن باسی رہوں گا- تب انہوں نے کہا' اے بھائی' کوئی ڈاڑھی منڈھانے اور جامہ پھاڑ کر جنگل میں جا رہنے سے سادھو نہیں ہوتا- مگر جس کی کرنی اچھی ہو-"

اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر بہادر علی حسینی کا انداز بیان بہت سادہ ہے- اس میں پیچیدگی مطلق نہیں- لیکن بقول سید محمد' مولف "ارباب نثر اردو" اس طرز میں دلکشی کا فقدان ہے- قصہ کہانی کی زبان میں ذرا لچک اور دلاویزی نہ ہو' تو قاری پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے- ان کی عبارت صاف اور سلیس ضرور ہے' لیکن قدرے بے نمک اور پھیکی ہے- کہیں کہیں محاورات اور روزمرہ کی چاشنی ملا دیتے' تو خوب ہوتا- قصہ کو دلچسپ بنانے کے لئے تھوڑی بہت تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی ضروری ہے- پھر بھی تاریخ ادب اردو میں اس کتاب کو خاصی اہمیت حاصل ہے-

اس سلسلہ میں میر بہادر علی حسینی کی تیسری اور آخری تالیف "تاریخ آسام" ہے' جو شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی کتاب "تاریخ آسام" کا اردو ترجمہ ہے- یہ ترجمہ ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوا- اس میں اورنگ زیب عالمگیر کے جرنیل میر جملہ کی ۱۶۶۲ء کی اس مہم کا تفصیلی بیان ہے' جس میں اس نے آسام فتح کیا تھا- اس میں آسام کی قدیم تاریخ اور مختلف حکومتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے- یہ کتاب نایاب ہے- سید محمد نے مولوی نصیر الدین ہاشمی کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اس کا ایک قلمی نسخہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں ہے- اس کی عبارت کا نمونہ

حسب ذیل ہے:

"شہر رجب کی بیسویں تاریخ کلیا بر سے کوچ ہوا۔ آگے وہاں سے دو منزل تک لشکر کا کنارہ پکڑ کر چلنا مہاپتر ندی کے سبب جو پہاڑ کے جست میں ہو کر بہتی ہے، مقدور نہ تھا۔ اس لئے لشکر اور نواڑی کے درمیان بڑا پیچ پڑ گیا۔ ابن حسن نواڑی کا داروغہ جو تھا سو نواب کے حکم سے کچھ بعض بعض کام سنوارنے کے لئے فتح چندون کے ساتھ رہ گیا تھا۔"

اوپر کا نمونہ، جو دستیاب ہو سکا، بہت مختصر ہے، اور جس کی بنا پر کتاب کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم کرنا از بس دشوار ہے۔ تاہم اتنا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے، "لشکر اور نواڑی کے درمیان بڑا پیچ پڑ گیا" کی طرح اس کی عبارت بھی کافی پر پیچ اور پر خار ہے۔ یہ عبارت گویا ایسی پتھریلی راہ ہے، جس پر سے گزرتے وقت قدم ذرا سنبھال کر ڈالنا پڑتا ہے، اور فورٹ ولیم کالج کی شان کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ پوری کتاب دستیاب ہوتی یا عبارت کا نمونہ زیادہ ملتا، تو ممکن ہے ہمیں اس قسم کی رائے ظاہر کرنے کی گنجائش نہ ہوتی۔

حواشی

۱۔ ارباب نثر اردو، صفحہ ۱۱۴۔

۲۔ ارباب نثر اردو، صفحہ ۱۱۵۔

۳۔ ارباب نثر اردو، صفحہ ۱۱۹۔

مرزا علی لطف

اردو کے نثری ادب میں مرزا علی لطف کا واحد کارنامہ تذکرہ "گلشن ہند" ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے' لیکن ان کا نام اسی کتاب سے زندہ ہے۔ ان کے والد مرزا کاظم بیگ خاں بھی شاعر تھے' اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد استر آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان وارد ہوئے' اور شاہجہاں آباد میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔

مرزا علی لطف دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت بھی وہیں پائی۔ ابتدا سے علم و ادب کا شوق تھا۔ وقت کے اساتذہ اور فضلا کے فیضِ صحبت سے ادبی ذوق پیدا ہوا اور شعر و شاعری کرنے لگے۔ دلی کے اجڑ جانے کے بعد بھی ایک عرصے تک وہ اس کے در و دیوار سے چمٹے رہے۔ لیکن آخر کب تک۔ بقول مرزا غالب' دلی میں رہیں گے تو کھائیں گے کیا"۔ وہ بھی قدردانوں کی تلاش میں نکل پڑے۔ غالباً پہلے انہوں نے لکھنؤ کی خاک چھانی' لیکن خاطر خواہ قدر نہ ہوئی۔ وہاں سے شاید عظیم آباد' پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے' جہاں ڈاکٹر گل کرسٹ سے ملاقات ہوئی۔ وہاں ان کو فورٹ ولیم کالج میں ملازم رکھ لیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ کلکتہ سے پھر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء میں انتقال کیا۔

مرزا علی لطف نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء "تذکرہ گلشن ہند" مرتب کیا۔ اس کتاب کو ترتیب دیتے وقت' جیسا کہ اس کے دیباچہ سے مترشح ہوتا ہے' انہوں نے علی ابراہیم خان کا تذکرہ "گلزار ابراہیم" کو پیش نظر رکھا ہے' لیکن یہ اس کا نرا ترجمہ نہیں ہے' بلکہ مستقل تالیف ہے۔ اس میں انہوں نے بہت سی باتیں اپنی چشم دید لکھی ہیں' اور کافی تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے۔ اس کتاب کی اصل میں دو جلدیں ہیں' ایک مشہور اردو شعرا پر' دوسری اردو کے غیر معروف شعرا پر۔ چنانچہ وہ خود اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"گلشن ہند" کی دو جلدیں ہیں۔ جلد اول میں یہ جو تحریر کی جاتی ہے' اس میں عرش

پروازیاں سلاطین نامدار کی اور گوہر باریاں وزرائے والا تبار کی اور خوش استعداد امرائے عالی مقدار کی اور سخن تراشیاں شعرائے صاحب وقار کی' جو کہ نام آور صاحب دیوان تھے' بیان کی گئی ہے۔ جلد دوم میں مذکور کئے گئے' شعرائے گم نام و غیر مشہور یا نو مشق کہ ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں کہانی شمع و پروانہ اور گل و بلبل کی۔"

"تذکرہ گلشن ہند" کی صرف ایک ہی جلد لکھی گئی' اور غالباً مولوی عبداللہ خان' سابق منتظم کتب خانہ آصفیہ کے زیر اہتمام اس کا اب تک ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اس میں کل ۶۹ شعرا کے حالات درج ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ ۱۹۰۸ء سے تین چار سال قبل حیدر آباد کی موسی ندی میں زبردست سیلاب آیا تھا۔ اس میں کسی غریب کا کتب خانہ بھی بہہ گیا۔ لوگوں کو وہ کتابیں ملیں تو کوڑیوں کے مول بکنے لگیں۔ ان میں سے "تذکرہ گلشن ہند" کا ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء کا مرتب کیا ہوا ایک نسخہ حیدر آباد کی مجلس کابینہ کے ایک مددگار کے ہاتھ لگا۔ انہوں نے اسے مولانا شبلی کو دکھایا' جنہوں نے اس کی قدر کا اندازہ کرکے اس کو انجمن ترقی اردو کے سپرد کیا۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر انجمن اس کتاب کو شائع نہ کر سکی۔ مولوی عبداللہ خان اس کی اشاعت پر آمادہ ہو گئے' اور نہایت اہتمام کے ساتھ مولانا شبلی کے حاشیہ اور تصحیح اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ایک طویل مقدمہ کے ساتھ ۱۹۰۶ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات اور اس کے کارناموں پر بحث کرنے کے بعد تذکرہ کی خوبیوں پر روشنی ڈالی۔ سید محمد لکھتے ہیں کہ مولوی عبداللہ کے مطبوعہ نسخے میں بعض جگہ تحریف کی گئی' اور کتاب کی ضخامت کم کرنے کی غرض سے مرزا علی لطف اور چند دیگر شعرا کے نمونہ کلام کا بہت سا حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔(۱)

"تذکرہ گلشن ہند" چونکہ نو آموز اور کم استعداد لوگوں کے لئے لکھا گیا تھا' اس لئے مرزا علی لطف نے اس میں اپنے پہلے تذکروں کے مقابلے میں شعرا کے حالات زندگی ذرا پھیلا کر لکھے ہیں۔ انہوں نے اکثر اساتذہ سخن کے حالات اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر درج کئے ہیں۔ اس لئے زیادہ معتبر اور قابل سند ہے۔ اس میں بعض شعرا کے حالات میں جن کا تعلق دربار شاہی سے رہا' بعض تاریخی واقعات بھی درج کئے ہیں اور اس زمانے کا معاشرہ اور سوسائٹی کی کیفیت بھی اس میں جا بجا ملتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی خاصی قدر ہونی چاہیے۔ کتاب کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو' قائم چاند پوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قائم تخلص" شیخ محمد قائم نام' متوطن چاند پور ندینہ کے نظم ریختہ میں استاد مسلم الثبوت تھے' ساتھ طبع بلند اور ذہن رسا کے موصوف' مضمون تراشی اور معنی بندی

میں معروف۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے مشق میں مشورہ سخن کا انہوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا، اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو مرزا محمد رفیع سودا سے ہوا ہے۔' سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا یہ اسلوب نہیں ہے۔ راقم آثم کو تو طور گویائی کا اس سخن آفرین کے نہایت مرغوب ہے۔ طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اس شیریں مقال اور خامہ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اس نازک خیال کے، صفائے بندش کے اس کی آئینہ کو طلب صفائی دام اور خجالت سے اس کلام رنگین کے گل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اس نظم صفا پرور کی رشک افزا آب گوہر کی اور موج زنی اس طبع معانی خیز کی حسد انگیز چشمہ کوثر کی۔ افسوس ہے کہ ایسے شخص کا اس جہان فانی سے اٹھ جانا اور داغ حسرت سے دلوں کو ارباب فہم کے جلانا۔ اس عندلیب شاخسار سحر بیانی نے شاید ۱۲۱۰ھ میں ادھر ہی نوائے وطن میں اپنے اس دار فانی سے سیر عالم باقی کی تھی۔ اور عجب طرح کی ایذا جان اہل معانی کے دی۔ اگرچہ اقسام نظم میں کوئی قسم اس شیریں کلام سے نہیں رہی ہے۔ لیکن رغبت طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر کی ہے۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے، تذکرہ گلشن ہند" کی زبان نہایت پیچیدہ اور مغلق ہے۔ اور فورٹ ولیم کالج کی قائم کردہ روایت کے بالکل خلاف ہے۔ حالانکہ یہ ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا علی لطف قافیہ پیمائی کی طرف زیادہ مائل ہیں اور سادہ عبارت لکھنا اپنے لئے باعث عار سمجھتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال معمول سے کافی زیادہ ہے۔ یہ کتاب شعرائے اردو کا تذکرہ نہیں، بلکہ کچھ اور ہی چیز معلوم ہوتی ہے۔ مرزا علی لطف کو اس قسم کے انداز بیان کے لئے یا تو اور سو سال پہلے پیدا ہونا چاہیے تھا یا کوئی داستان لکھنی چاہیے تھی۔ تذکرہ کے لئے ایسی زبان اور طرز بیان مطلق موزوں نہیں۔ تعجب کی بات ہے، کالج کے ارباب اختیار نے اپنے بنائے ہوئے اصول کے خلاف ایسی مغلق اور دقیق زبان میں کتاب لکھنے کی اجازت کیسے دی۔ لیکن اس کتاب کی اہمیت چونکہ تاریخی ہے، اور اس میں وقت کی کچھ مفید معلومات ملتی ہیں، اس لئے اہل علم مجبور ہیں کہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے اس کتاب کو پڑھیں، اور مفید مطلب باتیں نکالیں۔

حواشی

۱۔ ارباب نثر اردو، صفحہ ۱۴۶۔

مولوی امانت اللہ

مولوی امانت اللہ بھی فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے' اور عربی فارسی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور تھے۔ ان کے ذاتی حالات معلوم نہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے زمانہ ملازمت میں انہوں نے اردو نثر میں مندرجہ ذیل کتابیں تالیف کیں:

ان کی پہلی کتاب کا نام "ہدایت الاسلام" ہے۔ انہوں نے پہلے عربی میں اس نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ بعد میں جب کہ فورٹ ولیم کالج قائم ہوا' اور اس کی ادبی سرگرمیوں سے وہ واقف ہوئے' تو ان کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔ سوچا' کسی اور کتاب کا ترجمہ کرنے کی بجائے خود اپنی عربی کتاب "ہدایت الاسلام" کا ترجمہ کیوں نہ کر لیا جائے۔ اس سے کتاب کی افادیت بھی بڑھ جائے گی' اور فورٹ ولیم کالج کا منشا بھی پورا ہو جائے گا۔ اصل کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اردو میں جب اس کی پہلی جلد تیار ہو گئی' تو ڈاکٹر گل کرسٹ کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو کتاب پسند آ گئی' اور لیاقت اور قابلیت کا بخوبی اندازہ ہوا تو انہیں خصوصاً عربی فارسی کی کتابوں کے ترجمے کے لئے شعبہ تالیف و تراجم میں نوکر رکھ لیا۔ "ہدایت الاسلام" کی پہلی جلد ۱۸۰۴ء میں کالج کی جانب سے شائع ہوئی۔(۱) عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

> "فرض کی یا نفل کی نماز کعبہ کے اندر صحیح ہے۔ اگرچہ مقتدی کا منہ امام کے منہ کی طرف ہو۔ اور جو مقتدی کی پیٹھ اس کے منہ کی طرف ہو' تو نماز اس کی صحیح نہیں ہوتی ہے' اور کعبہ کے اوپر مکروہ ہے۔ اور کعبہ کے چاروں طرف اقتدا کرنا گو بعضے مقتدی امام کی نسبت اس کی طرف نزدیک ہو صحیح ہے۔ پر امام جس جانب میں ہے' اگر مقتدی اسی طرف کو امام کی نسبت سے کعبہ کی طرف نزدیک ہو' تو اس کی نماز درست نہیں۔ کیونکہ اس تقدیر میں وہ امام کے آگے ہو جائے گا۔ اور مقتدی کو اس کے آگے کھڑا ہونا درست نہیں ہے۔"

یہ عبارت کافی صاف ہے۔ مذہبی کتاب کی حیثیت سے انداز بیان جیسا ہونا چاہیے ویسا ہی ہے۔ اگرچہ آج کل اس طرح نہیں لکھا جاتا۔ بہرحال' اس کی زبان فورٹ ولیم کالج کی قائم کردہ روایت کے عین مطابق ہے۔ "ہدایت الاسلام" کی دوسری جلد کا ترجمہ انہوں نے کالج میں ملازم ہونے کے بعد کیا۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ترجمہ شائع ہوا تھا یا نہیں۔ "ہدایت الاسلام" کے بعد مولوی امانت اللہ میر بہادر علی حسینی کے ساتھ قرآن مجید کا اردو ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے۔ لیکن ابھی اس کام کو شروع کئے ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ ڈاکٹر گل کرسٹ خرابی صحت کی بنا پر کالج سے سبکدوش ہو کر ولایت چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے جانشینوں نے اس کام کو روک دیا۔ جو تھوڑا بہت کام ہو گیا تھا' اس کو بھی کالج کی طرف سے شائع ہونا گوارا نہ ہوا۔ لیکن اتفاق سے کالج کے باہر سے کسی نے مولوی امانت اللہ کا کیا ہوا ترجمہ' جو سورہ فیل سے آخر قرآن مجید تک ہے' شائع کر دیا تھا۔ سید احمد کو اس کا ایک نسخہ بمبئی کے ایک قدیم کتب خانہ میں دریافت ہوا۔ اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"اور نہیں کوئی چلنے پھرنے والا مگر زمین میں۔ مگر خدا ہی پر ہے اس کی روزی' اور جانتا ہے وہ اس کے ٹھیراؤ کو اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو۔ سب کچھ روشن کتاب میں ہے۔ اور وہی تو وہ خدا ہے' جس نے بنا ڈالا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں' اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ آزمائے ہمیں کہ کون ہے تم میں سے بہتر چال چلن کی راہ سے۔ اور اگر کہتا ہے تو کہ ضرور تم اٹھائے جاؤ گے مرنے کے بعد تو کہنے لگتے ہیں وہ لوگ کہ جو کافر ہو گئے کہ نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔ اور اگر دیر لگا دیں تو ہم ان کے عذاب میں گنتی کے کچھ زمانوں تک کہنے لگے ہیں کہ کس نے روک رکھا اسے۔ آگاہ ہو کہ جس دن آ پڑے گا وہ ان پر تو نہ ہٹایا جائے گا ان سے اور گھیرے گا انہیں وہی عذاب کہ جس پر ہمیشہ وہ ٹھٹے لگایا کرتے تھے اور چکھا لگا دیتے ہیں ہم آدمی کو اپنی رحمت کا۔ پھر چھین لیتے ہیں اس سے تو ضرور وہ ...... اور نہ بڑا ناشکر ہو جاتا ہے۔ اور اگر چکھا دیتے ہیں ہم ان سے نعمتیں ضرروں کے بعد وہ ضرور کہ چھو جاتے ہیں اسے تو کہنے لگتا ہے کہ گئے گزرے ہوئیں سب برائیاں مجھ سے' اور ضرور وہ بہت مگن اور بڑا ہوتا ہے۔ مگر وہی لوگ کہ جو جھیل جاتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں جو کیے کام تو انہیں کے لئے تو بخشش اور بہت کھری مزدوری۔"

"ہدایت الاسلام" کی عبارت کا نمونہ دیکھ کر یہ پہلے اندازہ ہوا تھا کہ فورٹ ولیم کالج کی روایت کے مطابق میر امانت اللہ کی زبان بڑی سیدھی سادی' ہوگی اور طرز بیان قدیم روش سے

مختلف ہوگا۔ لیکن قرآن مجید کے مندرجہ بالا ترجمے سے وہ اندازہ غلط نکلا۔ اس کی عبارت تو بہت ہی پیچیدہ اور مغلق ہے۔ اور وہ اپنے انداز بیان میں بالکل مرزا علی لطف کے نقش قدم پر چلنے لگے ہیں۔ اس کی عبارت سے قرآن مجید کے معنی صحیح طور پر سمجھنا بہت دشوار ہے۔ اس لئے ان کی یہ تالیف قبولیت عامہ حاصل کرنے سے محروم رہ گئی۔

مولوی امانت اللہ کی تیسری تالیف "جامع الاخلاق" ہے۔ یہ کتاب انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے جانشین کپتان جیمس مونٹ کے حکم سے ۱۸۰۵ء میں مرتب کی۔ یہ اصل میں فارسی کتاب "لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق" معروف بہ "اخلاق جلالی" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا موضوع، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اخلاقیات ہے۔ جو خشک اور دقیق ہے۔ عام لوگ اس سے دلچسپی نہیں لے سکتے۔ اس لئے زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ اس کو مولوی امانت اللہ کا ظمی کا کارنامہ کہنا چاہیے، جو مولف کی اعلیٰ صلاحیت اور قابلیت کا بین ثبوت ہے، اور جس کی اہل علم کے نزدیک قدر ہونی چاہیے۔

مولوی امانت اللہ نے اگرچہ اس کتاب کے دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ انہوں نے ترجمہ کی زبان کو آسان اور قابل فہم بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے عربی فارسی کے الفاظ ذرا زیادہ استعمال کئے ہیں، جس سے زبان آسان نہیں رہی۔ انہوں نے ترجمہ میں "اخلاق جلالی" کے موٹے موٹے الفاظ کو اکثر و بیشتر رہنے دیا ہے۔ اس سے زبان اور مشکل ہو گئی ہے۔ ان کے مقابلے میں فورٹ ولیم کالج کے تقریباً تمام اہل قلم نے سادگی اور سلاست کو زیادہ ترجیح دی۔ لیکن مولوی امانت اللہ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ انہوں نے اپنی مولویت قائم رکھی، اور فارسی عبارت کو فارسی کے انداز پر لکھا۔ ترجمے میں آزادی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ فارسی کی کورانہ تقلید کی گئی ہے۔ یہ ان کی کمزوری کہئے، یا ان کا تبحر علمی کا نتیجہ۔ بہرحال، ان کا یہ انداز بیان ان کی تحریر کا عیب بن کر رہ گیا۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو

"حکیم ارسطا طالیس نے کہا ہے، عدالت، فضیلت کے جزو کے برابر ہے، بلکہ وہ تمام فضیلت ہے اور ظلم جو مقابل اس کے ہے رذیلت کے جزو کے مطابق ہے بلکہ وہ سرتاپا رذیلت ہے۔ لیکن عدالت پہلے شخص اور اس کے خصائل سے علاقہ رکھتی ہے۔ جیسے اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پھر اس کے شریکوں کے ساتھ اہل خانہ یا شہر کے رہنے والوں میں سے ہوں۔ اس واسطے پیغمبر خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ہر ایک تم میں سے اپنے اعضائے جسمانی اور قوائے نفسانی کا نگہبان ہے۔ وہ

قیامت میں پوچھا جائے گا۔ ان کے احوال سے اور جب فرمایا کہ عادل لوگ منبر کے اوپر حق سبحانہ تعالیٰ کے نور کے مثال ہیں۔ صحابیوں نے پوچھا وے کون آدمی ہیں۔ فرمایا وے جو پہلے اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں عدالت کریں۔ پھر ان کے حق میں جو ان کے ملک اور ان کے تابع فرمان ہیں۔ حکیموں نے بطور تمثیل کے کہا ہے' جو چراغ کہ اپنے پاس ہے' اگر اسے روشن نہیں رکھ سکتا ہے۔ پس جو کہ اس سے تفاوت ہے' بطریق اولیٰ اس کو روشن نہیں رکھے گا' یعنی جو کوئی اپنی اور اپنے خصائل اور اعضا کی عدالت سے عاجز رہے' پھر اس سے اہل خانہ اور شہریوں کی عدالت متصور نہیں ہے۔ چاہیے کہ اپنے تن بدن کی عدالت سے خبردار ہو اور افراط و تفریط کی مضرت سے احتراز کرے۔ بعد اس کے گھر کے لوگوں یا شہر کے رہنے والوں سے وہی طریق سلوک رکھے اور نائب خداوند تعالیٰ کا کہلاوے۔ حکیموں نے کہا ہے کہ جب خلق اللہ کی بندوبست کی ڈوری ایسے بزرگ کے قبضہ اقتدار میں رہے تو زمانہ کا انتظام کا سر رشتہ بخوبی مستحکم ہو اور اس کے مبارک ڈوری کی تاثیر سے کنبے اور نسل میں برکت پیدا ہو۔"

"جامع الاخلاق" شاید کالج کی طرف سے شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس کا قدیم ترین ایڈیشن منشی غلام علی حیدر نے مطبع حمدیہ' کلکتہ سے ۱۸۴۸ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے نسخے بہت کمیاب ہیں۔ کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک ایک نسخہ ہے۔(۲)

حواشی

۱۔ ارباب نثر اردو' صفحہ ۱۵۵۔

۲۔ ارباب نثر اردو' صفحہ ۱۶۵۔

مظہر علی خان ولا

مظہر علی خان ولا کا اصلی نام مرزا لطف علی تھا' لیکن وہ مظہر علی خان ولا کے نام سے شہرت پا گئے۔ اور انہوں نے اپنی تالیفات میں بھی یہی نام برقرار رکھا۔ فورٹ ولیم کالج کے بعض دوسرے مصنفین کی طرح ان کے بھی ذاتی حالات نہیں ملتے۔ سید محمد نے تحقیق کر کے صرف اتنا پتا چلایا کہ "ان کے والد سلیمان علی خان وداد عرف میرزا محمد زمان فارسی کے مشہور شاعر تھے' اور دادا محمد حسین علی قلی خان کے خطاب سے مفتخر اور شرفائے دہلی میں شمار ہوتے تھے۔ مظہر علی خان ولا کا مولد و وطن دہلی ہے۔ ان کی نشو و نما اور تربیت بھی دہلی میں ہوئی۔ انہوں نے فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ ہندی اور سنسکرت میں کافی عبور تھا۔ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو وہ اس کے شعبہ تالیف و تراجم میں ملازم ہو گئے۔

مظہر علی خان ولا کی اردو نثر میں پہلی تالیف "مادھونل اور کام کندلا" ہے جو انہوں نے اوائل ۱۸۰۲ء میں مرتب کی تھی۔ یہ اصل میں ہندی زبان کا ایک عاشقانہ قصہ ہے' جو موتی رام کیسور نے لکھا تھا۔ اس میں ایک برہمن مادھونل اور ایک رقاصہ کام کندلا کے عشق و محبت کی داستان ہے۔ یہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنی بیاض ہندی میں اس کا صرف ایک حصہ چھاپا تھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔ سید محمد نے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی معرفت اس کا ایک اقتباس حاصل کیا تھا' جو حسب ذیل ہے:

"بلند بلند مکانوں کے بالا خانوں کا عالم دیکھ کر آسمان زمین کا عالم تہ و بالا نئے نئے طور کے مکان منقش عالی شانوں پہ سنہری کلسوں کے چمکنے سے عجیب اجالا۔ صاحب علم و ہنر' افعال و نیک کردار اور لوگ اچھے اچھے آرام چین سے اس بستی میں بستے تھے۔ وہ پہ پاوتی نگری مشہور تھی۔ اور راجہ گوبند چند دانش و بخشش میں یکتا' نیک افعال' خجستہ خصال' مہر سے معمور' علم و حیا سے مشہور' صورت و سیرت میں خوب' خلق طالب وہ مطلوب' دوست اس کے لطف سے شاد' اور دشمن اس کے قہر سے

برباد جا بجا اس کی دھاک۔ غرض وہاں راج راجہ اندر کی طرح کرتا تھا۔ اور اس کے محل میں عورتیں ہر ایک ذات کی تھیں، لیکن سب سے بہتر اور برتر، پاکیزہ طینت و آراستہ بزیب و زینت، شرم و ادب سے اور علم و ہنر سے مالا مال، اور خوبیوں سے اس کی ساری خلقت خوشحال، سامان عیش و نشاط، بلکہ سراپا انبساط، شکل و شمائل پری، سراپا غرور سے بھری عیش و نشاط کے طور سے آگاہ، شکل میں مانند ماہ، گلبن چمن شادمانی، گل گلزار جوانی، ابرو کمان تیر اس کی ہر ایک مژگان، ناز و عشوے کے اس میں تمام آئین، نپٹ حسین و نازنین اس کی رانی تھی، اور ایک مادھو نام برہمن، خوبصورت خوش سیرت اس کا بڑا مصاحب تھا"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی زبان زیادہ صاف نہیں ہے۔ اس میں سلاست اور روانی کم ہے۔ قافیہ کا التزام جا بجا کیا گیا ہے۔ تشبیہات و استعارات کے استعمال سے بھی ذرا قابلیت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قصہ کہانی کی زبان بالکل سیدھی سادی ہو، تو دلکشی نہیں پیدا ہوتی، لیکن اتنی سیدھی سادی نہیں تو اتنی پیچیدہ اور گنجلک بھی نہ ہونی چاہیے۔ عہد جدید کے جو مقتضیات ہیں، وہ اس کتاب کی زبان و عبارت میں مفقود معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم کتاب اگر چھپ کر منظر عام پر آ جاتی تو اس کے قدر دانوں کی کمی نہ ہوتی۔

اردو نثر میں مظہر علی خان ولا کی دوسری تالیف "ہفت گلشن" ہے۔ یہ ناصر علی خان واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ولا نے اس کی تمہید میں لکھا ہے کہ انہوں نے ترجمہ ڈاکٹر گل کرسٹ کے حکم پر ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں کیا تھا۔ اس کا موضوع اخلاقیات ہے۔ اس میں سات باب ہیں۔ ہر باب گلشن کے نام سے موسوم ہے، اس لئے اس کا نام "ہفت گلشن" رکھا ہے۔ اس میں عام اخلاقیات کی طرح طریق معاشرت، آداب مجلس، طرز گفتگو اور بزرگوں کی اطاعت و فرمانبرداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ بعض جگہ اخلاقی قصے اور حکایتیں بھی درج ہیں۔ احادیث نبوی اور حضرت علیؓ کے اقوال و امثال سے کتاب کو زیادہ قابل قبول بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ایک ہی نسخہ کا اب تک پتا چلا ہے، اور وہ بھی عام کمیاب کتابوں کی طرح برٹش میوزیم میں ہے۔ سید محمد نے اس کا ایک اقتباس ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے ذریعے حاصل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے:

"حکایت چوتھی، مرغی اور مور کی ہے کہ ایک مرغی دانے کی تلاش میں جنگل کو گئی اور ہر طرف دانہ چگنے لگی کہ ناگاہ ایک سوراخ پاس انڈے کتنے ایک مار سیاہ کے پائے۔ تب خوش ہو کر نہایت شفقت و مہربانی سے ایک درخت کے نیچے ان انڈوں کو

اکٹھا کر کے اپنے پروں کے نیچے لے بیٹھی اور سینے لگی۔ یہ تمام احوال طاؤس نے اس درخت کے اوپر سے دیکھ کر کہا اے مرغی یہ کیا خیال فاسد تیرے دل میں آیا ہے۔ مگر انڈے سانپ کے نہیں پہچانے ہیں تو نے۔ بہتر یہ ہے کہ اس بلا سے دست بردار ہو' واللہ جس وقت کہ بچے انڈوں میں سے نکلیں گے' تو تجھے مار ڈالیں گے۔ اس بے ہوش نے اس کی بات کو نہ سنا اور اپنے کام میں بدستور مشغول رہی' لیکن بعد گزرنے چالیس روز کے بچے انڈوں میں سے مانند خراطین کے ایک بارگی جو نکلے تو سارے بدن میں اس کے چمٹ گئے۔ یہاں تلک کہ کام اس کا تمام کیا۔ فائدہ اس قصہ سے یہ ہے کہ جو کوئی نصیحت یار صادق کی اور دوست مشفق کی نہ سنے' آخر کار وہ پشیمانی کھینچتا ہے' اور اسی طرح سے ہلاک ہوتا ہے۔"

اوپر جو اقتباس پیش کیا گیا' اس سے اندازہ ہوتا ہے' "ہفت گلشن" کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔ اور عہد جدید کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ انداز بیان میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے کہ سمجھ میں نہ آئے۔ دوچار لفظ جو ذرا غیر مانوس ملتے ہیں' تو وہ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل کے ادبی نقوش ہونے کے سبب ہے۔ زمانہ کے ساتھ ہر چیز بدلتی رہتی ہے۔ زبان کیسے اپنی جگہ پر قائم رہے۔ وہ بھی بڑھتی رہتی ہے' اور پیچھے کچھ نشانیاں اپنی چھوڑ جاتی ہے۔ آج ہم جس زبان پر ناز کرتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ بہت سادہ ہے' اور بقول حالی "نیچرل" ہے' شاید آج سے سو سال بعد یہ فرسودہ ہو جائے۔ اور آج کی بہت سی باتیں' صرف تاریخی یادگار بن جائیں۔

ولا کی تیسری کتاب "بیتال پچیسی" ہے۔ اصل کتاب سنسکرت میں تھی۔ محمد شاہ کے عہد (۱۱۳۱ھ، ۱۷۱۹ء– ۱۱۶۱ھ، ۱۷۴۸ء) میں سورت کیسور کے نام سے ایک آدمی نے برج بھاشامیں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ چونکہ اس میں پچیس کہانیاں ہیں' اور ایک ہی آدمی کی روایات ہیں' اس لئے اس کا نام "بیتال پچیسی" رکھا گیا ہے۔ بیتال ایک مرد کا نام ہے' جو ذات کا تیلی تھا۔ اس کو کسی جوگی نے مسان (یعنی قتل کر کے درخت سے لٹکا کر بھوت) بنا رکھا تھا۔ اس نے بھوت کی شکل میں یہ کہانیاں بیان کی ہیں۔

"بیتال پچیسی" پہلی مرتبہ کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ایک عرصے تک کافی مقبول رہی اس کے کئی ایک ایڈیشن دوسری جگہوں سے بھی شائع ہوئے۔ اس کا نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

"ایک راجہ پرتاب مکٹ نام بنارس کا تھا' اور اس کے بیٹے کا نام بجر مکٹ' جس کی ناری کا نام مہا دیوی۔ ایک کنور اپنے دیوان کے بیٹے کو ساتھ لے کر شکار کو گیا اور

بہت دور جنگل میں جا نکلا' اور اس کے بیچ ایک مندر نایاب دیکھا کہ اس کے کنارے ہنس' چکوی چکوا' مرغابیاں سب کے سب کلول میں تھے۔ چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوئے۔ کنول تالاب میں پھولے ہوئے۔ کناروں پر طرح طرح کے درخت لگے ہوئے کہ جن کی گھنی گھنی چھاتھ میں ٹھنڈی ہوا آتی تھی اور پنچھی پکھیرو درختوں پر چہچہوں میں تھے اور رنگ برنگ کے پھول بن پھول رہے تھے۔ ان پر بھونوروں کے جھنڈ کے جھنڈ گونج رہے کہ اس تالاب کے کنارے پہنچ اور منہ ہاتھ دھو کر اوپر آئے۔ وہاں ایک مہا دیو کا مندر تھا۔ گھوڑوں کو باندھ' مندر کے اندر جا' مہادیو کا درشن کر باہر نکلے۔ جتنی دیر کو درشن میں لگی تھی' اس عرصے میں کسو راجہ کی بیٹی سہیلیوں کا جھنڈ ساتھ لئے ہوئے اسی تالاب کے دوسرے کنارے پر آشنان کرنے آئی۔ سو اشنان دھیان پو جا کر سہیلیوں کو ساتھ لے درختوں کی چھاتھ میں ٹہلنے لگی۔ ادھر دیوان کا بیٹا بیٹھا اور راجہ کا بیٹا پھرتا تھا کہ اچانک اس کی اور راجہ کی بیٹی کی چار نظریں ہوئیں۔ دیکھتے ہی اس کے روپ کو راجہ کا بیٹا فریفتہ ہوا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اے چنڈال کام دیو مجھ کو کیوں ستاتا ہے اور راج پتری نے اس کنور کو دیکھ کر سر میں جو کنول کا پھول پوجا کرکے رکھا تھا' وہی پھول ہاتھ میں کان سے لگا دانت سے کتر پاؤں تلے دبا۔ پھر اٹھا چھاتی سے لگا لیا اور سہیلیوں کو ساتھ لے سوار ہو اپنے مکان کو گئی اور یہ راج پتر نہایت نراس ہو برہ میں ڈوبا ہوا دیوان کے پاس آیا اور ساتھ شرم کے اس کے آگے حقیقت کہنے لگا۔"

فورٹ ولیم کالج کی نثری تالیفات میں "بیتال پچیسی" شاید پہلی کتاب ہے جس میں اس کثرت سے ہندی الفاظ استعمال کئے گئے۔ اردو کیا ہے' اس کی زبان کو ہندی ہی کہہ لیجئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ عربی رسم الخط میں ہے۔ اس کو اگر دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اردو کی کتاب ہے۔ مظہر علی خان ولا کا غالباً اس قسم کی زبان لکھنے کا مقصد یہ ہوگا کہ اس کے پڑھنے میں ہندو مسلمان یکساں طور پر دلچسپی لیں۔ لیکن حقیقت میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے یا نہیں' کہنا مشکل ہے۔ ہمیں آج اس کی عبارت پڑھنے اور آسانی سے اس کے مطالب سمجھنے میں خاص دشواری ہوتی ہے۔ ہلکے پھلکے ہندی الفاظ کا استعمال کوئی عیب نہیں ہے۔ بلکہ اس سے زبان کی چاشنی اور بڑھ جاتی ہے۔ عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ کی بہ نسبت یہ طریقہ ہمیں گوارا بھی ہے لیکن ٹھیٹ اور مشکل ہندی الفاظ کا استعمال کوئی پسند نہیں کرتا۔ "بیتال پچیسی" برج بھاشا کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔ ممکن ہے' مولف پر اس کا بھی اثر رہا ہو'

اور اس کے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ برقرار رکھنا انہوں نے پسند کیا ہو۔ بہرکیف اردو دان طبقہ اس قسم کی زبان اور عبارت سے کافی نالاں ہے۔

اردو نثر میں مظہر علی خان ولا کی چوتھی کتاب "تاریخ شیر شاہی" ہے۔ یہ کتاب اصل میں عباس خان شیخ علی شروانی نامی ایک آدمی نے شہنشاہ اکبر کے حکم سے فارسی میں لکھی تھی۔ کپتان جیمس موئٹ کے کہنے پر ولا نے ۱۲۳۰ھ/۱۸۲۰ء میں اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں شیر شاہ سوری بادشاہ دہلی کے عہد (۱۵۴۰ء۔ ۱۵۴۵ء) کی مکمل تاریخ ہے۔ گارسان دیتاسی نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کر کے ۱۸۶۵ء میں پیرس سے شائع کیا تھا۔ ولا کا ترجمہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ کتب خانہ، محکمہ ہند، لندن میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جس کا ایک اقتباس نقل کر کے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے سید محمد کو بھیجا تھا، اور جو ارباب نثر اردو میں درج ہے:

> "اس نے کہا اپنے بھائی میرداد کو شیر خان کے پاس بھیجئے، تا وہ اس سے یہ قرارداد کر کے کہ ہم قلعہ دیتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ تو عہد کرے کہ جس بیٹے بدبخت نے اپنے باپ کو مارا ہے، اس کی ناک اور کان کاٹنے تا اوروں کو کان ہوں۔ جب میر داد شیر خان کے پاس گیا، اس سے یہ قسمیہ عہد و پیمان کیا کہ لاؤ ملکہ اور تم تینوں بھائیوں کے ساتھ کسی نوع کی مخالفت نہ کروں گا، اور مہمانداری کی رسم بخوبی بجا لایا۔ کوئی فرو گذاشت نہ کی، اور اس کے آنے سے نہایت خوش ہوا۔ محبت و اخلاص حسد سے زیادہ کیا اور کہا کہ گر لاؤ ملکہ میرے تین قلعہ دیوے اور مجھ سے نکاح کرے تو میں اس کا نہایت ممنون احسان ہوں گا۔ مرغ دل کا شکار کرنا احسان سے خوب ہے اور اچھے کاموں سے ہے۔ میرداد نے کہا کہ خزانہ اور قلعہ سوائے بادشاہ کے دنیا مناسب نہیں ہے۔ لیکن جو بندہ آپ کی ملازمت میں آیا اور تم نے بہت اشتیاق آرزو و تمنا اظہار کی اور میرا بھی اعزاز و اکرام بہت سا کیا، اور مہمانداری کا حق جتنا چاہیے بجا لائے۔ میرے دل میں بدلہ اس کا سوائے اس کے کوئی نہیں آتا کہ یہ قلعہ تمہارے ہاتھ آوے اور میں مقدور اپنے تئیں اس کی سعی میں قصور نہ کروں گا۔"

اوپر "تاریخ شیر شاہی" کا جو اقتباس پیش کیا گیا ہے، اس کی زبان نہایت غیر مانوس ہے، اور تاریخی موضوع کے لئے بہت ناموزوں ہے۔ معلوم ہوتا ہے، ولا نے فارسی سے لفظی ترجمہ کیا ہے، اور آزادی تحریر سے مطلق کام نہیں لیا۔ ولا کی ہر کتاب ایک الگ نوعیت رکھتی ہے، کسی میں عربی فارسی الفاظ کا غلبہ ہے، کسی میں ہندی الفاظ اس قدر استعمال کئے، کہ اس کی زبان بجائے اردو کے ہندی معلوم ہوتی ہے، اور کسی میں ترجمہ کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ ان میں کسی نوع کی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔

مرزا کاظم علی جوان

مرزا کاظم علی جوان فورٹ ولیم کالج کے ممتاز مصنفین میں سے تھے۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ دلی اجڑ گئی' تو دوسرے ارباب علم و فضل کی طرح انہوں نے بھی پہلے لکھنؤ کا رخ کیا۔ وہ اچھے شاعر تھے۔ لکھنؤ میں اس وقت اردو شاعری اپنے دور شباب پر تھی۔ انہوں نے مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر کاملین فن سے داد تحسین حاصل کی۔ ۱۸۰۰ء میں کرنل اسکاٹ' ریذیڈنٹ لکھنؤ نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ملازمت کے لئے ان کی سفارش کی۔ وہاں جا کر وہ ملازم ہو گئے۔ اور وہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ ان کا انتقال بھی غالباً کلکتہ ہی میں ہوا۔ سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا۔ انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما پر ۱۸۰۱ء میں ہندی کے مشہور ناٹک "شکنتلا" کو اسی نام سے اردو کا جامہ پہنایا۔ اصل ناٹک تو سنسکرت میں ہے' اور اس کا مصنف کالیداس ہے' لیکن ہندی میں اس کے کئی ترجمے ہو چکے تھے۔ مرزا کاظم علی جوان نے نواز کیسور کے ہندی ترجمہ کو سامنے رکھا۔ یہ اردو ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے ۱۸۰۲ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی بیاض ہندی میں اس کا ایک طویل اقتباس شائع ہوا تھا۔ اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"اگلے زمانہ میں وسوا متر نام ایک شخص تھا۔ شہر کو چھوڑ کر جنگل میں رہا کرتا اور اپنے طور کی عبادت و ریاضت دن رات کیا کرتا۔ اپنے صاحب کی بندگی میں تن بدن کی کچھ اسے خبر نہ تھی۔ سوا اسی کے تصور کے کبھی نگاہ ادھر ادھر نہ تھی۔ یہاں تک کہ دبلا پے سے لگتا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔

بدن سوکھ کر اس کا کانٹا ہوا تھا
ریاضت کے مارے وہ جیتا ہوا تھا

ان دکھوں سے اس کو کبھی ایک دم آرام نہ تھا۔ سوا اٹھانے ان جفاؤں کے کچھ کام نہ تھا' تاکہ اس خاکساری سے آرزو دل کی بر آوے' اور درخت سے مدعا کا پھل پاوے۔ ایسا جوگ کیا'

ایسا آسن بیٹھا، نزدیک تھا کہ بندگی کے زور سے راجہ اندر کی سنگھاسن چھین لے۔ جتنے تیرتھ تھے، ان سب میں گیا۔ شہر شہر دریا دریا گھاٹ گھاٹ پیکرا کرتا پھرا۔ نہ چھوڑا کسی ندی کا کنارہ۔ جس جنگل میں کسی درخت تلے ذرا بیٹھتا گردا گرد آگ جلاتا۔ پھر اپنے تئیں الٹا لٹکا دم بدم دھواں منہ میں لیا کرتا۔ تپشیا اس طرح کیا کرتا۔ غرض ان تپشیوں کا یہی حال تھا۔ آٹھوں پہر تپ جپ کا خیال تھا۔ چونسٹھ برس تلک وہ بیابان نورد تھا۔ سر سے لگا کر پاؤں تلک گرد گرد تھا۔ بناسپتی کھاتا رہا۔ بھوک پیاس کی ایذائیں سہتا، اور روبہ آفتاب ہو کر

گرمیوں میں وہ جگر تفتہ جلا کر گرد آگ
بیٹھتا تھا ڈھیر جیسے راکھ کا آوے نظر

اور جاڑوں میں گلے تک پانی میں ہو کر کھڑا جپ کیا کرتا تھا شوق دل سے ہر شام و سحر ایسی باتیں سن کر راجہ کو بہت سوچ پڑا، ڈر دل میں ہوا۔ اس کے اس جوگ کو توڑنے کے لئے منو کا پری کو بلا کر بہت سی آؤ بھگت کی اور یہ احوال ظاہر کیا۔ وہ راجہ کے حسن سلوک سے بہت خوش ہوئی، اور اس مطلب کے سنتے ہی یوں بولی کہ میں وہ پری ہوں کہ اگر میرا سایہ برہما بشنو مہادیو پر پڑے دیوانے ہو جائیں۔"

اوپر کی عبارت اگرچہ کہیں کہیں طرز کہن کے مطابق مقفی ہے۔ لیکن اس کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔ ہندی کے الفاظ جا بجا ہیں، لیکن وہ بے محل نہیں ہیں، اور ان سے روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس میں ہندو مذہب کی روایات بھی ہیں۔ اس معاملہ میں وہ مجبور تھے۔ اصل کتاب چونکہ سنسکرت میں ہے، اور مصنف بھی ہندو ہے، اس لئے مترجم کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ "شکنتلا" کی زبان پھر بھی مظہر علی خان ولا کی "بیتال پچیسی" کی زبان سے کہیں بہتر ہے، اور فورٹ ولیم کالج کا جو معیار تھا، اس پر پوری اترتی ہے اس میں مترجم نے دلچسپی بڑھانے کے لئے موقع و محل کے مطابق اپنی طرف سے اردو کے اشعار بھی شامل کر دیئے ہیں۔

"شکنتلا" کو اردو ڈراموں میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ اردو ڈراما پر بحث ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔ سر دست صرف یہ بتانا ہے کہ مرزا کاظم علی جوان نے جب ہندی "شکنتلا" کو اردو میں منتقل کیا، تو اس وقت اردو ادب اس صنف سے بہت حد تک خالی تھا۔ اس لئے ان کو اس میدان میں ایک لحاظ سے اولیت اور فضیلت حاصل ہے۔

شیخ حفیظ الدین احمد

شیخ حفیظ الدین احمد بھی فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں شامل تھے۔ ان کے ذاتی حالات پر تذکرہ نگاروں نے زیادہ روشنی نہیں ڈالی۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد پہلے

عرب سے دکن آئے تھے۔ کئی پشتوں کے بعد ان کے پردادا دکن سے بنگال چلے گئے تھے۔ اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے والد شیخ ہلال الدین محمد کلکتہ کے نیٹو کالج میں، جیسے وارن ہیسٹنگز، گورنر جنرل اول نے قائم کیا تھا، مدرس تھے۔ انہوں نے اسی مدرسہ سے اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ بیس سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہو کر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ وہ اس میں عربی فارسی پڑھانے پر مامور تھے۔ انہوں نے درس و تدریس کے علاوہ ترجمہ کا کام بھی کیا۔ اردو نثر میں ان کی ایک یادگار "خرد افروز" ہے۔ یہ فارسی کتاب "عیار دانش" کا اردو ترجمہ ہے "عیار دانش" اصل میں "کلیلہ و دمنہ" کا حصہ ہے، یہ قصہ اولاً سنسکرت زبان میں تھا۔ متعدد لوگوں نے اسے فارسی میں ترجمہ کیا۔ سب سے مشہور ترجمہ ملا حسین الواعظ کاشفی کا ہے، جو "انوار سہیلی" کے نام سے مشہور ہے اور بعض قدیم طرز کے مدرسوں میں اب تک داخل نصاب ہے۔ انوار سہیلی کی طرح "خرد افروز" کو بھی اردو دنیا میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کتاب کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"برہمن نے کہا۔ نقل ہے کہ روم کی سرحد میں ایک بادشاہ عالی ہمت بزرگ منش تھا۔ اس کے دو بیٹے حسین و خوش خو تھے۔ جب بادشاہ نے عالم بقا کے کوچ کا نقارہ بجایا، بڑا بھائی دولت بادشاہی یہ خبر لے کر چھوٹے بڑے سبھوں کے دل کو ہاتھ میں لایا اور باپ کے تخت سلطنت پر بیٹھا اور خزانہ کا منہ کھول دیا۔ چھوٹے بھائی نے اس ڈر سے کہ مبادا مجھ پر کچھ آفت لاوے وطن چھوڑ کر سفر اختیار کیا، اور اکیلا راہ دور دراز کو چلا۔ اتفاقاً" ایک جوان نازنین خوبصورت کہ جس نے زمانہ کی گردش سے سفر کیا تھا، اس کے ہمراہ ہوا۔ شاہزادے نے جو اس چہرہ سے راست بازی دریافت کی، اس کی رفاقت سے خوش ہوا۔ دوسری منزل میں ایک دانا سوداگر بچہ ہوشیار کہ جس نے گھر بار تج کر سفر کیا تھا، ان کو ملا۔ تیسری منزل میں ایک زور آور دہقان بچہ جو کسی دانا کے نطفہ سے تھا ان کا رفیق ہوا۔ تمام اذیت سفر کی راحت سے بدل ہوئی۔ چاروں دوست ایک دن خوشی سے منزل طے کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فارغ بال و آسودہ حال رہتے تھے۔ دور دراز منزل کو طے کر کے شہر نسطور میں پہنچے اور شہر کے ایک کنارے اچھی جگہ اترے۔ کسی کے پاس کچھ خرچ کو نہ رہا تھا۔ ان یاروں میں سے ایک نے کہا اب وہ وقت ہے کہ ہر کوئی اپنا اپنا ہنر دکھلائے اور زور بازو سے کچھ بہم پہنچاوے تو چین سے چند روز اس شہر میں رہیں۔ بادشاہزادے نے کہا، سب کام خدا کی تقدیر پر موقوف ہیں۔ آدمی کی کوشش سے سرانجام نہیں

ہو سکتے۔ جو لوگ دانا ہیں' اس کی تلاش میں نہیں دوڑتے ہیں۔ خوبصورت جوان نے کہا' حسن دولت کے حاصل کرنے میں بڑا ایک وسیلہ ہے۔ جہاں اس کی نمود ہو' دولت تابع ہوگی۔"

فورٹ ولیم کالج کے مطمح نظر کے مطابق "خرد افروز" کی عبارت جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ بہت صاف اور سلیس ہے۔ اس میں نہ "بیتال پچیسی" کی عبارت کی طرح ہندی الفاظ کی کثرت ہے' نہ فارسی عربی الفاظ زیادہ استعمال کئے گئے۔ بقول سید محمد کے "اس میں سرسید کے اسلوب بیان کی جھلک پائی جاتی ہے۔ "سرسید کا بیان اگلے باب میں آئے گا۔ حفیظ الدین نے کمال فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے موٹے موٹے الفاظ' بڑی بڑی ترکیبیں اور دور از کار تشبیہات و استعارات کا کثرت سے استعمال نہیں کیا ہے' بلکہ جو کچھ لکھا ہے' بڑی صفائی اور سادگی کے ساتھ لکھا ہے۔ جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی' اس وقت زمانہ کا رجحان ابھی پوری طرح نہیں بدلا تھا۔ لوگوں کے طبائع کو ابھی تک قدیم طرز کی عبارت مرغوب تھی' تاہم "خرد افروز" کو لوگوں نے نظر انداز نہیں کیا۔

اس کتاب کا ایک حصہ پہلے ڈاکٹر گل کرسٹ کی بیاض ہندی میں چھپا۔ اس کے بعد پوری کتاب اہتمام کے ساتھ ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن کاظم علی جوان اور چند دوسرے رفقائے کار کی نظر ثانی کے بعد ۱۸۱۵ء میں نکلا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن بڑے اہتمام سے ۱۸۵۷ء میں ہارٹ فورڈ (انگلستان) سے شائع ہوا۔

خلیل علی خاں اشک

خلیل علی خان اشک کے ذاتی حالات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ کب اور کہاں پیدا ہوئے' سنہ وفات اور مقام وفات کیا ہے' تعلیم و تربیت کہاں تک حاصل کی' آباؤ اجداد کہاں سے آئے تھے اور وہ کہاں کے رہنے والے تھے' ان باتوں پر معاصر یا بعد کے تذکرہ نگاروں نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ ان کا نام بھی ایک زمانہ تک پردۂ اخفا میں رہا۔ غالباً سید محمد نے "ارباب نثر اردو" میں پہلی مرتبہ انہیں پرانے ادب کے شیداؤں سے روشناس کرایا۔

اردو نثر میں انہوں نے "داستان امیر حمزہ" لکھی۔ اس کا اصل مصنف کون ہے' اور اس کا اصل ماخذ کوئی عربی داستان ہے' یا کوئی فارسی کہانی' پتا لگانا دشوار ہے۔ بہرحال' برصغیر میں بہت سے لوگوں نے اس نام سے کئی کئی جلدوں میں ضخیم داستانیں مرتب کیں۔

اشک نے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو کر ڈاکٹر گل کرسٹ کے اشارہ پر ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں بڑی کاوش اور محنت سے کئی سو صفحات پر مشتمل داستان امیر حمزہ مرتب کی' اور قیاس ہے کہ

اردو میں ان سے پہلے اور کسی نے یہ داستان نہیں لکھی۔ اولیت کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ یوں تو امیر حمزہ کی داستان بہت مشہور ہے، لیکن اس کے مولف کو کوئی شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

حکایت۔ یہاں سے دو کلمہ داستان ملاک النقش کے ملاحظہ فرمایئے۔ جب کہ وہ باغ تیار ہوا، ایک دن بادشاہ کے حضور میں عرض کی غلام نے ایک باغ حضور کی بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظل سبحانی وہاں رونق افروز ہو کر ایک چمچہ آش نوش جان فرمائیں کہ باعث عزت اور از دیار خانہ زاد ہے۔ مصرع

شاہاں چہ عجب گر بہ نوازند گدا را

فرمایا کیا مضایقہ، تم جا کر تیاری کرو ہم بھی آتے ہیں۔ النقش حضور سے رخصت ہو کر واسطے تیاری کے آگے گیا۔ بعد اس کے جانے کے بادشاہ بھی زمرد کے تخت پر سوار ہو کر اور تمام وزراء امرا ہمراہ لے کر طرف باغ بیداد کے رونق افزا ہوئے۔ جب کہ سواری قریب باغ کے آئی، ملک النقش نے ایک تخت ہوادار واسطے بادشاہ کے ایسا تیار کیا تھا کہ اس میں گل اور بوٹے لعل اور الماس کے تھے اور چاروں کونوں پر اس کے چار طاؤس زمرد کے بنائے تھے کہ جنھوں کے پیٹ میں لخلخے خوشبو کے رہتے تھے۔ اور واسطے تخت کی شان کے طاؤس کے پہلو میں دونوں طرف ایک ایک نرگس دان رکھا تھا کہ جن کے کونے مرصع کے مثل زمرد سرسبز تھے اور الماس کے پھول جنھوں کی زردی پکھراج کی سی تھی اس کو مع ہودجون اور چالیس ہاتھیوں جن پر جھولیں زربفت کی پڑی ہوئیں اور عماریاں کارزری و جواہر نگار انھوں کی پیٹھ پر کسی ہوئیں اور دو سو گھوڑے عربی، عراقی، ترکی، تازی مع جواہر مرصع اور کئی اونٹ بغداد کے دو کوہانی کہ جن کے کجاؤں پر کار چوبی زربفت کی چادریں کسی ہوئیں اور کتنے خیمے کتنی کشتیاں سلاخ اور جواہرات کی اور پارچہ جات سوتی اور ریشمی اور پشمینے اپنے ساتھ لئے اور باہر کے جلو خانہ تک استقبال کر کے بادشاہ کو یہ سب نذر گزرانا اور تخت کا پایہ پکڑ کر بوسہ دیا اور ہمراہ ہوا۔"

اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے، خلیل علی خان اشک کا طرز بیان نہایت سلیس اور بے تکلف ہے۔ انھوں نے اس عہد کے بعض دوسرے اہل قلم کی طرح عبارت آرائی سے گریز کیا۔ ان کی زبان میں سادگی بھی ہے اور مٹھاس بھی۔ مناسب موقعوں پر ہندی کے اچھے اچھے شبدوں کا چٹخارہ پایا جاتا ہے۔ بعض الفاظ جو اب متروک ہو چکے ہیں، ان کے ہاں ضرور پائے جاتے ہیں،

لیکن دوسروں کے مقابلے میں ان کے ہاں یہ عیب بہت کم ہے۔ جو کچھ ہے' وہ زمانے کے تقاضے کی وجہ سے ہے۔ اس وقت ان متروک الفاظ کے بارے میں آج کی طرح واضح طور پر معلوم نہیں تھا کہ وہ متروک ہونے والے تھے۔

خلیل علی خان اشک کی دوسری کتاب "واقعات اکبر" ہے۔ یہ علامی ابوالفضل کی مشہور کتاب "اکبر نامہ" کا اردو ترجمہ ہے۔ جو انہوں نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ولیم ٹیلر کے ایما پر کیا تھا۔ یہ ترجمہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ اور نہ اس کا کوئی قلمی نسخہ یا مسودہ ہی کہیں ملتا ہے۔ اس کا صرف نام ہی نام ہے۔

سید محمد نے نصیر الدین ہاشمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانہ میں اشک کی دو اور کتابیں ہیں۔ ایک کا نام "قصہ گلزار چین" ہے' اور دوسری کا "رسالہ کائنات"۔ "قصہ گلزار چین" میں چین کے شہزادہ رضوان شاہ اور روح افزا پری زاد بادشاہ اجنہ کی لڑکی کے معاشقہ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ فارسی کے ایک مشہور قصہ کا ترجمہ ہے' اشک نے ہنری بوٹ کے حکم سے ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء میں مرتب کیا ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

> "بلاد چین میں ایک بادشاہ عادل و باذل' رعیت پرور' غریب نواز' داد گستر ایسا تھا کہ اقلیم سبع آفتاب مہتاب کی شکل اس کے فیض سخاوت و عدالت سے روشن تھی۔ جناب باری نے اسے ہر ملک کی شہریاری دی تھی۔ روز و شب عیش و عشرت میں رہتا تھا۔ اس کے شہر میں دن عید اور شب' شب برات تھی۔ کسی کو کسی بات کا غم نہ تھا۔ بادشاہ کو سدا ایک غم فرزند رہتا تھا۔ اس کے گھر میں اولاد نہ تھی۔"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب کی زبان بہت ترقی یافتہ ہے۔ طرز بیان بھی اوروں کے مقابلے میں بہتر ہے۔ رسالہ "کائنات" ایک مختصر کتابچہ ہے۔ ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۳ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے حکم سے لکھا گیا۔ اس کی عبارت کا کوئی نمونہ نہیں ملتا۔

مولوی اکرام علی

مولوی اکرام علی کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے اس وقت ہوا جب ڈاکٹر گرسٹ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر وطن انگلستان جا چکے تھے۔ ان کے جانشین کپتان جان ولیم ٹیلر کے ایما پر مولوی اکرام علی نے ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالے کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی اردو نثر میں یہی واحد تالیف ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> "اللہ تعالیٰ نے جس گھڑی انسانوں کو پیدا کیا' عریان محض تھے۔ بدن پر کچھ نہ تھا کہ

سردی اور گرمی سے محافظت میں پھل پھلاری، جنگل کے کھاتے اور درختوں کے پتوں سے تن کو ڈھانپتے۔ اس واسطے ان کے قدوں کو سیدھا اور لمبا بنایا کہ درختوں کے پھل توڑ کر با آسانی کھاویں اور اپنے تصرف میں لاویں' اور غذا ہماری گھاس ہے۔ اس لئے ہمارے قدوں کو ٹیڑھا بنایا ہے کہ بخوبی چھوئیں' اور کسی نوع کا دکھ نہ اٹھائیں۔ بادشاہ نے کہا' یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ یعنی انسان کو ہم نے نہایت سڈول بنایا ہے' اس کا کیا جواب دیتے ہو۔ اس نے عرض کیا' جہاں پناہ کلام ربانی میں ظاہرا معنون کے سوا بہت سی تاویلیں ہیں کہ بغیر اہل علوم کے کوئی نہیں جانتا۔ تفسیر اس کی عالموں سے پوچھنا چاہیے۔"

اوپر کی عبارت بھی فورٹ ولیم کالج کے اکثر اہل قلم کی تحریروں کی طرح بہت صاف اور سلیس ہے' اور کالج کے مقصد و منشا کو کامیاب بنانے میں مد و معاون معلوم ہوتی ہے' "اخوان الصفا" چونکہ مناظرہ کے انداز پر لکھی گئی ہے' اس لئے میں قرآن کی آیتیں اور رسول اکرم صلعم کی حدیثیں ضرور ہوں گی۔ اسے ہم کوئی عیب نہیں قرار دے سکتے۔

یہ کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۱۱ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد مختلف جگہوں سے اس کے بہت سے اور ایڈیشن نکلے۔

نہال چند لاہوری

نہال چند کے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ غالباً دہلی کی تباہی کے بعد لاہور چلے گئے تھے' اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اسی لئے شاید وہ لاہوری کہلاتے تھے۔ ولورٹ نامی ایک انگریز کپتان سے ان کے مراسم تھے۔ اس کی سفارش سے ڈاکٹر گل کرسٹ تک ان کی رسائی ہوئی' اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے۔ اردو نثر میں ان کا واحد کارنامہ "مذہب عشق" ہے اور اسی سے ان کا نام زندہ اور روشن ہے۔ یہ قصہ اولاً بنگال کے ایک شخص عزت اللہ (م ۱۲۲۴ھ، ۱۸۰۹ء) نے فارسی میں لکھا تھا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے کہنے پر نہال چند لاہوری نے ۱۲۱۷ھ، ۱۸۰۲ء میں اس کا اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ وہ کتاب ۱۸۱۴ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی' اور قبولیت کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہوئے۔

"مذہب عشق" ایک طویل قصہ لکھا ہے' جو چھبیس ابواب پر مشتمل ہے' ہر باب داستان کے نام سے موسوم ہے۔ اصل فارسی کتاب کی عبارت میں لفظی آرائش و تصنع ہے۔ مصنف نے انشا پردازی کا کمال دکھانے کی غرض سے مشکل طرز بیان اختیار کیا تھا۔ نہال چند لاہوری نے ترجمہ میں اس کی زبان اور طرز بیان کو بہت حد تک آسان بنا دیا ہے۔ ترجمے میں اگرچہ اصل

کتاب کے بعض فارسی الفاظ باقی رہ گئے ہیں، لیکن عبارت کی روانی میں کوئی زیادہ فرق نہیں آیا۔ کتاب توقع سے کہیں زیادہ مقبول ہوئی، اور لوگوں نے اس کی بڑی قدر کی۔ شاید زبان اور طرز بیان کی وجہ سے نہیں تو نفس قصہ کی دلچسپی کی بنا پر سب کو پسند آئی ہو۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"جب تاج الملوک سے ان ناعاقبت اندیشوں نے گل بکاولی چھین لیا، اور وہ بیچارہ دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ مثل ہے کہ "قہر درویش برجان درویش" پھر کج فہموں کے پیچھے پیچھے بعد چند روز کے اپنے باپ کی سرحد میں آیا۔ ایک جنگل میں جو درختوں کا مسکن تھا، اس میں جا پہنچا، اور چقماق سے آگ جھاڑ کر حمالہ کے دیئے ہوئے بال کو اس پر رکھ دیا۔ چوتھائی بھی نہ جلا ہوگا کہ وہ اٹھارہ ہزار دیووں سمیت آ پہنچی۔ اور تاج الملوک کو فقیروں کے بھیس میں دیکھ کر آگ بر گئی کہ اے شہزادے میری بیٹی کو کیا کیا اور تو نے اپنا حال کیا بنایا۔ تاج الملوک بولا کہ آپ کی توجہ سے سب خیریت ہے، لیکن ایک کام مجھے نہایت ضروری ہے، اور اس کی تدبیر مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے آپ کو تصدیع دی ہے۔ حمالہ نے کہا کہ اے عیار باتیں نہ بنا، وہ کون کام ہے، جلدی کہہ۔ تاج الملوک نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ایک محل اور باغ ہو کہ ہو بہو بکاؤلی کے قصر اور باغ سا ہو، تم جس طرح جانو، جلد بنوا دو۔ وہ بولی، اے بیٹا جو یہ کتنی بڑی بات ہے۔ مگر میں نے اس باغ اور عمارت کو دیکھا نہیں۔ بھلا بن دیکھے مکان کا نقشہ کس طرح بناؤں اور بنوا دوں۔ تاج الملوک بولا، جس طرح میں کہوں، اسی طرح بنوا دو۔"

فورٹ ولیم کالج کے دیگر مصنفین

گزشتہ صفحات میں جن اردو نثر نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے' ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے اہل قلم تھے' جنھوں نے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو کر اردو نثر میں ترجموں کی شکل میں کتابیں مرتب کیں' اور اردو ادب کی گراں بہا خدمات انجام دیں۔ ان میں سے منشی بینی نارائن جہاں' مرزا محمد فطرت' اور سید حمید الدین بہاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ منشی بینی نارائن جہاں نے اردو نثر میں "چار گلشن" "دیوان جہاں" اور "تنبیتہ الغافلین" کے نام سے تین کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ لیکن وہ ابھی تک قلمی نسخوں یا مسودوں کی شکل میں ہیں۔ انہیں اشاعت کا موقعہ نہیں ملا' مرزا محمد فطرت نے ایک قواعد اردو مرتب کی' جو اگرچہ بہت ناقص ہے' لیکن اس زمانہ میں نو وارد انگریزوں کو کچھ مفید معلومات بہم پہنچائی تھی' اور سید حمید الدین بہاری نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے حکم سے ۱۸۰۴ء میں اس سے قبل غیر منقسم ہندوستان کے کھانوں پر "خوان الوان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

تبصرہ

فورٹ ولیم کالج کا قیام تاریخ نثر اردو میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کالج اردو کے نثری ادب کی شاہراہ پر ایک زبردست موڑ ہے۔ یہیں سے اردو نثر قدیم روایات اور طرز کہن کو پیچھے چھوڑ کر کچھ نئی امنگوں اور خوش آیند آرزوؤں کے ساتھ نئی شاہراہ کی طرف مڑتی ہے۔ اور مجاز کی دنیا سے حقیقت کی زمین پر اترنے لگتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی منظم اور اجتماعی کوششوں نے اردو نثر کی جو گراں بہا خدمات انجام دیں' وہ کبھی مٹ نہیں سکتیں' اور ان کی قدر و قیمت رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔ خدا بھلا کرے اس مرد دور اندیش کا' جس نے رنگ و نسل اور قومیت کے امتیاز کو بالائے طاق رکھ کر برصغیر کی زبان اردو کی خدمت میں اپنی عمر کے کئی سال وقف کئے۔ انہوں نے اس کالج کی صدارت اختیار کر کے ملک کے گوشے گوشے سے لائق اور قابل اہل قلم کو تلاش کر کے کلکتہ میں جمع کیا' اور ایک خاص نصب العین کے ماتحت ان

سے وہ کام لیا' جو ان کے بغیر ہرگز انجام پانا ممکن نہ تھا۔ یہ گراں قدر ہستی ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے سلسلہ میں جو انگریز برصغیر آتے تھے' ان کے لئے یہاں کی رائج الوقت زبان اردو کا کچھ ایسا آسان لٹریچر پیدا کیا جائے' جسے پڑھ کر وہ یہاں کے طور طریق' رسم و رواج اور عادات و روایات سے آگاہ ہو سکیں' تاکہ تجارتی اور دیگر معاملات میں ان کے لئے سہولت ہو۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ کمپنی کا اقتدار اس سر زمین پر کافی مستحکم ہو چکا تھا۔ اس وقت ہمارے ادب کا نثری سرمایہ بہت ہی قلیل تھا۔ لوگوں کی توجہ شعرو شاعری کی طرف زیادہ تھی۔ نثر سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ اس میں جو کچھ بھی لکھا گیا تھا' اس کی عبارت عموماً مقفی و مسجع ہوتی تھی۔ طرز اس قدر پیچیدہ اور دشوار فہم ہوتا تھا کہ غیر اہل زبان اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ان کے لئے شعرو شاعری تو ایک عجوبہ روزگار تھی۔ یہ پڑھ کر زبان سیکھنا اور دستگاہ حاصل کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ شاعری خصوصاً اردو شاعری سے صرف اسی وقت انسان لطف اندوز ہو سکتا ہے جب اسے زبان پر کافی قدرت حاصل ہو۔ سات سمندر پار کے نووارد لوگ اردو پر بھلا قدرت اتنی جلدی کیسے حاصل کر سکتے تھے۔ ان کے لئے آسان نثر کی کتابوں کی ضرورت تھی۔ جن کی زبان عام بول چال کی زبان سے قریب ہو۔

اردو نثر میں یہ آسان لٹریچر بہت جلد اور تیزی سے مہیا کرنا تھا۔ سالہا سال تک انتظار کرنا کہ طبع زاد تصنیفات وجود میں آتیں' ممکن نہ تھا۔ اسلئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ عربی' فارسی اور ہندی کی اچھی اچھی کتابوں سے ترجمے کئے جائیں۔ لیکن مندرجہ ذیل باتیں مد نظر ہوں۔

۱۔ زبان سیدھی سادی اور عام بول چال کے مطابق ہو۔

۲۔ مغلق اور ناقابل فہم الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔

۳۔ دور از کار تشبیہات و استعارات سے پرہیز کیا جائے۔

۴۔ عربی فارسی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ نہ لکھے جائیں۔

۵۔ طرز بیان ایسا سادہ ہو' جسے نیچرل اور سائنٹفک کہا جا سکے۔

۶۔ عبارت مقفی اور مسجع نہ ہونی چاہیے۔

یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جو فورٹ کالج کے نثری کارناموں میں ملحوظ رکھی گئی ہیں'' اور یہی اس کی عام خصوصیات قرار پائیں۔ اگرچہ اس کے دو چار اہل قلم ایسے بھی ہیں' جنہوں نے ان باتوں سے انحراف کیا ہے' اور اپنی پرانی عادت کی بنا پر پرانی روش پر لکھا' لیکن ان کی تعداد بہت

کم ہے۔

فورٹ ولیم کالج کا دور اردو نثر میں ترجمہ کا دور ہے۔ کسی بھی زبان کا ادب جب اپنے ابتدائی مراحل سے گزرتا ہے، تو پہلا مرحلہ ترجمہ کا آتا ہے۔ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے اچھے ادب پاروں سے ترجمہ کر کے اس کا دامن پہلے مالا مال کیا جاتا ہے۔ ترجمہ کا دور ختم ہوتا ہے، تو لوگوں کا مذاق سنورتا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ طبع زاد تصنیفات کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی فطرت کا قانون ہے۔ اس طریقے سے کوئی ادب بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ فورٹ ولیم کالج میں جب کام شروع ہوا، اس وقت اردو نثر کا ابھی ابتدائی مرحلہ تھا۔ اس میں طبع زاد تصنیفات کا وجود میں آنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے اس ادارہ کو ترجموں کی طرف توجہ دینا پڑی۔

فورٹ ولیم کالج نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی سرپرستی میں چند ہی سال کے اندر اردو نثر میں بہت سی کتابیں تیار کر دیں، اور لوگوں کو جدید طرز نگارش سے دلچسپی پیدا کرنے میں بڑی مدد کی۔ نئے حکمرانوں کا مقصد اگرچہ براہ راست اردو کی خدمت کرنا نہ تھا، بلکہ اپنی ہی قوم کا مفاد زیادہ مد نظر تھا، لیکن اس سے بالواسطہ اردو کا دامن بہت وسیع ہو گیا۔ اس میں اب لکھنے کا ایک نیا انداز پیدا ہو گیا۔

فورٹ ولیم کالج کی یہ خدمات مئی، ۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۸۲۰ء تک کوئی بیس سال چار ماہ رہیں۔ اس عرصہ میں چھوٹے بڑے کوئی اٹھارہ مولفین نے پچاس ساٹھ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں، جن میں مختلف موضوعات، جیسے افسانہ، تذکرہ، تاریخ، اخلاق، فقہ اسلام، ترجمہ قرآن مجید اور صرف و نحو شامل ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی یہ خدمات اردو نثر میں عظیم کارنامے ہیں۔ اگر بالفرض یہ کالج قائم نہ ہوتا، تو اس نوعیت کا کام شاید نہ ہوتا، اگر ہوتا تو بھی اس میں کافی وقت لگتا۔ اس کالج کی کتابوں نے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، لوگوں کے مذاق کو ہموار کرنے اور ان کی پرانی ذہنیت کو بدلنے میں بڑا کام کیا۔ یہ واقعہ ہے، اس کالج کے قیام سے نہ تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقصد یہ تھا کہ اردو کی ترقی اور اس کی اشاعت ہو، اور نہ کالج کے ان منشیوں کا یہ منشا تھا کہ اردو کو سادہ اور آسان بنایا جائے، اور ایسا ایک اسلوب تحریر قائم کیا جائے، جو آنے والی نسل کے لئے شمع راہ کا کام دے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا تو خاص مقصد یہ تھا، جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ اس کے نووارد انگریز ملازمین کے لئے یہاں کی زبان میں آسان لٹریچر پیدا کیا جائے، تاکہ وہ ملک کی زبان اور کلچر سے واقفیت حاصل کر کے اپنے فرائض منصبی بخوبی انجام دے سکیں۔ اور ان منشیوں کا خاص منشا پیٹ پالنا تھا۔ وہ روزگار کی تلاش میں کلکتہ پہنچے، اور اپنی قابلیت اور صلاحیت کے بموجب کالج میں ملازم ہو گئے، اور ڈاکٹر گل کرسٹ اور ان کے جانشینوں کی راہنمائی میں ایک خاص نصب العین کے ماتحت لٹریچر پیدا کرتے رہے۔

یورپین مصنّفین

ڈاکٹر گل کرسٹ وغیرہ

فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی گراں قدر خدمات کے سلسلے میں مناسب ہوگا اگر اردو کے ان یورپین مصنفین کا بھی ذکر کیا جائے، جنہوں نے بالواسطہ اردو کو فائدہ پہنچایا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اردو کے بہت بڑے محسن ڈاکٹر گل کرسٹ کا نام آتا ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ، جن کا پورا نام جان بارتھ وک گل کرسٹ تھا۔ ۱۷۵۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے دارالحکومت اڈنبرا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جارج ہیرٹ ہسپتال اڈنبرا میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں غیر منقسم ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کاروبار زوروں پر تھا۔ اس میں انگلستان سے تعلیم یافتہ نوجوان مختلف عہدوں کے لئے بھرتی ہو کر یہاں آنے لگے تھے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے بھی طب کی تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کے لئے درخواست دی۔ ان کی اعلیٰ قابلیت اور مستعدی کو دیکھ کر ۱۷۸۲ء میں ان کو ایک طبی عہدہ پر مقرر کر لیا گیا۔ پہلے وہ بمبئی پہنچے، وہاں سے ایک سال کے بعد کلکتہ بھیجے گئے۔ ان کو اسی اثنا میں اردو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کو یہ محسوس ہوا کہ اس ملک میں اگر رہنا ہے تو یہاں کی زبان سے واقفیت حاصل کرنی ازبس ضروری ہے۔ ورنہ قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس میں ایسا دل لگایا کہ دو تین سال میں اچھی خاصی استعداد حاصل کر لی۔ اردو سے ان کا یہ شوق جنون کی حد تک دیکھ کر ۱۷۸۵ء میں اس وقت کے قائم مقام گورنر جنرل سر جان میکفرسن نے اس میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے طویل چھٹی دینا منظور کر لیا۔ وہ اسی سال ماہ اپریل میں کلکتہ سے فیض آباد گئے، اور مقامی لوگوں سے میل جول بڑھا کر اردو کا حقیقی مطالعہ کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے دوسرے بعض اہم مقامات جیسے دہلی، بنارس، لکھنؤ وغیرہ کا بھی سفر کیا۔ اور ممتاز اہل قلم اور ادیبوں سے مل کر اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کو جب اردو میں مہارت تامہ حاصل ہو گئی۔ تو کلکتہ واپس جا کر تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا، اور قواعد اردو اور لغت وغیرہ پر کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے دوسرے ہم وطنوں کو اس زبان سے آگاہ کرنے کے لئے روزانہ درس دینے کا انتظام کیا۔ مئی، ۱۸۰۰ء میں جب لارڈ ویلزلی، گورنر جنرل کی کوششوں سے فورٹ ولیم کالج قائم ہوا، تو ڈاکٹر گل کرسٹ کو اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ اس لئے کہ اس وقت ان سے بڑھ کر اس عہدہ کے لئے اور کوئی بہتر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ اس عہدے پر کوئی چار سال تک فائز رہے۔ اس کے بعد ۱۸۰۴ء میں انہیں خرابی صحت کی بنا پر قبل از وقت ریٹائر ہونا پڑا۔ لیکن چار سال کے قلیل عرصے میں انہوں نے وہ کام کر کے دکھایا، جو شاید اور کسی سے انجام پانا ناممکن تھا۔ انہوں نے برصغیر کے اطراف و جوانب سے قابل اہل قلم اور ادیبوں کو کلکتہ میں جمع کیا اور ان سے اردو میں ترجمہ اور تالیف کا کام کرایا، جس پر پچھلے صفحات میں بحث کی گئی ہے۔ ان کا زمانہ صدارت فورٹ ولیم کالج کا بہترین دور ہے۔ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد ترجمہ و تالیف کے کام میں اتنا جوش و خروش باقی نہ رہا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنے وطن واپس پہنچ کر کچھ دن تو آرام کیا۔ اس کے بعد صحت ذرا ٹھیک ہوئی، تو لندن آ گئے، اور پرائیویٹ طور پر ان انگریز نوجوانوں کو اردو پڑھانے لگے، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں برصغیر آنا چاہتے تھے۔ ۱۸۱۸ء میں لندن میں بمقام لیسٹر اسکویر اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا، تو اس میں ان کو اردو کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۲۵ء میں تخفیف مصارف کی وجہ سے کمپنی نے اس ادارہ کو بند کر دیا تو وہ پروفیسری کے عہدہ سے سبکدوش ہو کر نجی طور پر لوگوں کو اردو پڑھاتے رہے۔ عمر زیادہ ہو گئی تو وہ یہ سلسلہ بند کر کے اپنے گھر اسکاٹ لینڈ چلے گئے۔ پھر علاج کی خاطر پیرس گئے، جہاں انہوں نے ۹ جنوری ۱۸۴۱ء کو ۸۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے حسب ذیل کتابیں تالیف کیں:

۱۔ **انگریزی۔ ہندوستانی لغت** یہ انگریزی اردو کی اولین مبسوط اور مستند لغت ہے، جو نو سال کی متواتر کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۷۹۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۱۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا۔

۲۔ **ہندوستانی علم اللسان** یہ کتاب اردو لسانیات پر ہے۔ اس میں انگریزی اردو اور اردو انگریزی کی ایک طویل فرہنگ بھی شامل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کب نکلا تھا معلوم نہیں۔ دوسرا ایڈیشن اڈنبرا سے ۱۸۱۰ میں شائع ہوا تھا۔ پھر ۱۸۲۵ء میں

ڈاکٹر گل کرسٹ نے خود اس کا تیسرا ایڈیشن نکالا تھا۔

۳۔ **مشرقی زبان دان** ہندوستان کی مقبول خاص و عام زبان کا آسان مقدمہ۔ اس کے ساتھ انگریزی اردو اور اردو انگریزی کی ایک مبسوط فرہنگ بھی شامل ہے۔

۴۔ **ہندی کی آسان مشقیں** یہ فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی اور آخری امتحانات میں بیٹھنے والوں کی سہولت کے لئے لکھی گئی تھی۔ ۱۸۰۱ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

۵۔ **اجنبیوں کے لئے رہنمائے اردو** یہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، مبتدیوں کے لئے تیار کی گئی تھی۔ ۱۸۰۱ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ **بیاض ہندی** یہ فورٹ ولیم کالج کے ممتاز اہل قلم کی کتابوں کا انتخاب ہے۔ ۱۸۰۳ء میں طبع ہوا۔

۷۔ **عملی خاکے** اس میں اردو کے صحیح تلفظ کے اصول مرتب کئے گئے ہیں۔ ۱۸۰۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔

۸۔ **اتالیق ہندی** اس میں کالج کے اہل قلم سے آسان اور سلیس زبان میں مضامین لکھوا کر جمع کئے گئے ہیں۔ ۱۸۰۳ء اور ۱۸۲۱ء میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

۹۔ **ہندی عربی آئینہ** اس میں ایسے عربی الفاظ کی جدولیں شامل ہیں، جن کا تعلق اردو زبان سے ہے۔ ۱۸۰۴ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔

۱۰۔ **مکالمات انگریزی و ہندوستانی** اس میں انگریزوں کو اردو مکالمات سکھانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن کلکتہ، لندن اور اڈنبرا سے شائع ہوئے۔

مشرقی قصے اس میں مختلف زبانوں سے اچھی اور عمدہ حکایتوں اور افسانوں کا اردو ترجمہ کر کے شامل کیا گیا ہے۔ کالج کے دوسرے اہل قلم نے بھی اس میں مدد دی ہے۔ ۱۸۰۳ء میں طبع ہوئی۔

ہندی داستان گو اس میں فارسی اور دیوناگری رسم الخط پر بحث کی گئی ہے۔ ۱۸۰۶ء میں طبع ہوئی۔

کپتان ٹامس روبک

یہ ڈاکٹر گل کرسٹ کے رفیق کار اور جانشین ہیں۔ وہ اولاً فوج میں بھرتی ہوئے اور لیفٹیننٹ ہوئے۔ پھر کپتان کے درجے تک ترقی کی۔ فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو اس کے معتمد اور ممتحن مقرر ہوئے۔ ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے ریٹائر ہونے پر انہوں نے صدارت کا عہدہ سنبھالا۔ انہوں نے بھی اپنے پیشرو کی طرح کالج کے اردو مصنفین کی بڑی سرپرستی کی۔ ان کو اردو نثر کے علاوہ اردو شاعری سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ اسی بنا پر منشی بنی نارائن جہاں سے "دیوان جہاں" کے نام سے اردو شعرا کا تذکرہ لکھوایا۔ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں ہیں:

۱۔ **لغت جہاز رانی** اس میں بحریہ اور جہاز رانی کی تمام اصطلاحیں اور الفاظ انگریزی اردو میں جمع کیے گئے ہیں۔ ۱۸۱۱ء میں کلکتہ سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

۲۔ **ترجمان ہندوستانی** اس میں اردو کے قواعد کی ابتدائی باتیں لکھی گئی ہیں۔ ۱۸۲۴ء میں پہلے لندن سے، پھر ۱۸۲۴ء میں دوبارہ لندن اور پیرس سے بہ یک وقت شائع ہوئی۔

۳۔ انہوں نے فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر ایک مبسوط کتاب بھی انگریزی میں لکھی

کپتان جوزف ٹیلر

کپتان جوزف ٹیلر بھی ڈاکٹر گل کرسٹ اور کپتان روبک کی طرح اردو کے دلدادہ تھے، اور فورٹ ولیم کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے اردو انگریزی میں ایک مبسوط لغت مرتب کی ہے۔ ۱۸۰۸ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ پھر ۱۸۲۰ء میں اس کا ایک مختصر ایڈیشن نکلا۔

اردو کے مندرجہ بالا تینوں قدردان اور نکتہ شناس فورٹ ولیم کالج سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے یورپین مصنفین ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اردو کی بالواسطہ یا بلا واسطہ خدمات انجام دیں۔ اگر ان کا بھی یہاں سرسری طور پر جائزہ لیا جائے تو بہتر ہوگا، تاکہ ایک ہی جگہ سب کا ذکر آ جائے۔

برصغیر میں انگریزوں سے پہلے اور بہت سی یورپین قوموں کی یورش رہ چکی ہے۔ وہ سمندر کے راستے سے تجارتی اغراض سے آئیں، بود و باش اختیار کی۔ اور اپنے اپنے حوصلہ اور قوت تسخیر کے مطابق اقتدار حاصل کیا۔ ان کے آپس میں وقتاً" فوقتاً" اقتدار کے نشے میں تصادم بھی ہوتے رہے، جس سے کوئی قوم فنا ہو گئی، اور کوئی ابھر آئی۔ آخر انگریزوں کے اقتدار کے سامنے

کسی کا زور نہ چلا- اور سب کو یکے بعد دیگرے سپرانداز ہو کر میدان سے پسپا ہونا پڑا- ان قوموں میں انگریزوں کے علاوہ پرتگال' اہل ہالینڈ' اہل فرانس شامل ہیں- برصغیر کو اب آزادی مل گئی ہے ان میں سے اب کسی کا اقتدار باقی نہیں ہے- لیکن ان کے اثرات باقی ہیں- ہماری زبان تہذیب اور کلچر ہر چیز پر ان کی چھاپ موجود ہے- جدھر دیکھئے ان کے نشان قدم نظر آتے ہیں- وہ قومیں جہاں اس سرزمین کا بہت کچھ لوٹ کر لے گئیں' جس کا عام طور پر گلہ کیا جاتا ہے' وہاں انہوں نے بہت کچھ دیا بھی- ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں ان سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوا ہے- یہاں ان تمام باتوں کا احاطہ کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے- ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ان یورپین قوموں نے اردو ادب کو کیا دیا' اور اس کی ترقی میں کیا مدد دی-

پچھلے صفحات میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا ذکر آ چکا ہے- جو انگریز حکمرانوں کی سرپرستی میں انجام پائیں- اس کالج کے قیام سے پہلے اور بعد میں بہت سے یورپین مصنفین گزرے ہیں' جنہوں نے کسی نہ کسی طرح اردو ادب کی خدمت کی ہے- ذیل میں ان کا مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے-

جان جوشوا کیٹلر

جان جوشوا کیٹلر غالبا ہالینڈ کے رہنے والے تھے- ۱۷۱۱ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈاکٹر مقرر ہو کر سورت آئے' اور تین سال وہاں قیام کیا- شاہ عالم (۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء- ۱۱۴۴ھ/۱۷۱۲ء) کے دربار میں بھی ڈچ سفیر کی حیثیت سے حاضر ہوئے- لاہور' دہلی اور آگرہ کا سفر کیا- انہوں نے غالبا ۱۷۱۵ء میں "صرف و نحو ہندوستانی" کے نام سے لاطینی میں اردو زبان کی ایک گرامر لکھی' جو ۱۷۴۳ء میں شائع ہوئی- اردو الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں ہیں- اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشہور دعا کا اردو ترجمہ شامل ہے' جو حسب ذیل ہے:

"ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے' پاک ہوئے تیرے نام' آوے ہم کو ملک تیرا- ہوئے راج تیرا جون آسمان تو جمیں (زمین) میں روٹی ہمارے نہ تھی' ہم کو آس دے اور معاف کر تقصیر اپنی ہم کون' جو معاف کرتے اپرے (اپنے) قرض داروں کو' نہ ڈال ہم کو اس وسوسے میں' بلکہ ہم کوں گھس کر اس برائی سے' تیری پسجنی سواری عالمگیری حمایت' آمین-"

پادری بنجمن شلز انہوں نے لاطینی میں اردو قواعد مرتب کی' جو ۱۷۴۴ء میں شائع ہوئی- اس میں اردو کے الفاظ عربی رسم الخط میں ہیں- انہوں نے ۱۷۴۸ء میں بائبل کا بھی اردو میں ترجمہ کیا-

مل انہوں نے ۱۷۴۴ء میں ایک کتاب لکھی اور اردو کے حروف تہجی کا دوسری زبانوں کے حروف تہجی سے مقابلہ کیا۔

پادری کیسیانو بیلی گائی یہ اٹلی کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ۱۷۷۱ء میں "الفابیٹم برھانکم" کے نام سے اردو کے حروف تہجی پر ایک رسالہ لکھا۔

ہیڈ لے انہوں نے ۱۷۷۲ء میں اردو کی ایک گرامر لکھی۔ انہوں نے ۱۷۷۸ء میں "گریمیٹیکا اندوستانا" کے نام سے پرتگالی میں اردو کی ایک قواعد بھی مرتب کی تھی۔ غالباً یہ پرتگال کے رہنے والے تھے۔

ڈف یہ ۱۷۸۵ء میں یورپ سے برصغیر پاکستان اور ہند آئے اور کلکتہ میں رہ کر سنسکرت بنگلہ اور اردو زبانیں سیکھیں۔ انہوں نے کلکتہ کے زمانہ قیام میں ایک اردو گرامر لکھی، جو بعد میں لندن سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے خیال کے مطابق اس میں بڑی غلطیاں ہیں۔

جان شیکسپیئر انہوں نے غالباً کلکتہ میں رہ کر اردو سے متعلق دو کتابیں مرتب کیں۔ ایک اردو لغت ہے، جو ۱۸۱۳ء میں شائع ہوئی۔ دوسری "منتخبات ہندی"۔ یہ دو جلدوں میں ہے، جو ۱۸۱۸ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اُس کی پہلی جلد میں میر شیر علی افسوس کی "آرائش محفل" کے دس باب کا انگریزی ترجمہ شامل ہے، اور دوسری جلد میں اردو نثر و نظم کا انتخاب دو سو صفحے کا ہے۔ اور ہندی نثر و نظم کا انتخاب ۴۸ صفحے کا ہے۔

ولیم ٹیسٹ انہوں نے "مقدمہ زبان ہندوستانی" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو ۱۸۲۷ء مین کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کے تین حصے ہیں۔ (۱) قواعد، (۲) لغت (۳) زبان دانی۔

ایس ڈبلیو برٹین انہوں نے قواعد زبان ہندوستانی کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۸۳۰ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

اسٹیم فورڈ ارناٹ انہوں نے ایک کتاب مرتب کی، جس کا نام ہے "جدید خود آموز قواعد زبان ہندوستانی جو برٹش انڈیا کی نہایت کارآمد اور عام زبان ہے۔" ۱۸۳۱ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب رومن اور عربی رسم الخط میں ہے۔ آخر میں لغت کا ایک ضمیمہ بھی شامل ہے۔

جیمس آربالن ٹائن انہوں نے ایک "ہندوستانی گرامر" جو لندن سے ۱۸۳۲ء میں شائع ہوئی۔

ڈنکن فاربس ان کی "ہندوستانی لغت" یادگار ہے' جو ۱۸۴۷ء میں لندن میں طبع ہوئی-

ایف فیلن انہوں نے مولوی کریم الدین دہلوی کی شرکت میں "طبقات شعرائے ہند" کے نام سے شعرائے برصغیر کا تذکرہ مرتب کیا' جو ۱۸۴۸ء میں طبع ہوا-

برٹرینڈ یہ فرانسیسی عالم ہیں جنہوں نے ایک "اردو لغت لکھی' جو ۱۸۵۸ء میں پیرس سے شائع ہوئی-

ریورنڈ جی اسمال انہوں نے ایک "ہندوستانی گرامر" لکھی' جو ۱۸۴۷ء میں پیرس سے شائع ہوئی-

جی دت لو پراختو جرمنی کے باشندے ہیں- انہوں نے ایک "ہندوستانی گرامر" لکھی' جو ۱۸۵۲ء میں برلن سے شائع ہوئی-

ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن انہوں نے لغت کی چار کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں- (۱) ہندوستانی' انگلش' ڈکشنری' (۲) انگلش ہندوستانی ڈکشنری' (۳) ہندوستانی انگلش قانونی ڈکشنری اور (۴) انگلش ہندوستانی قانونی ڈکشنری-

پروفیسر گارسان دتاسی
اور بعض دوسرے مصنّفین

یورپین مصنفین میں یہ بہت زیادہ مشہور ہیں' اور انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کو چھوڑ کر اردو کی خدمت بھی سب سے زیادہ کی ہے- یہ فرانسیسی عالم ہیں' برصغیر کا کبھی سفر نہیں کیا لیکن وہ اردو زبان و ادب کے اس قدر دلدادہ اور شیدائی تھے کہ اس پر پیرس سے اپنے گھر بیٹھے بیٹھے تحقیقات کرتے تھے- وہ برصغیر سے اپنے دوستوں اور انگریز حکمرانوں کی معرفت اس کے بارے میں ہر قسم کی معلومات فراہم کرتے تھے اور سال کے اخیر میں ایک مرتبہ پریس کے السنہ مشرقیہ کے کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے اپنی معلومات اور تحقیقات کا نچوڑ لیکچر کی شکل میں پڑھ کر سناتے تھے- یہ کام انہوں نے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۷ء تک کوئی ۲۷ سال جاری رکھا' جس میں انہوں نے اس زمانے کی ادبی معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ جمع کر دیا- انجمن ترقی اردو نے ان تمام لیکچروں کا اردو میں ترجمہ کر کے (۱) تمہیدی خطبے' (۲) مقالات گارسان دتاسی حصہ اول (۳) مقالات گارسان دتاسی' حصہ دوم اور (۴) خطبات گارسان دتاسی کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا ہے- ان لیکچروں کے علاوہ

انہوں نے اردو سے متعلق مندرجہ ذیل کتابیں(۱) بھی ترجمہ و تالیف کیں، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی قابل قدر ہیں۔

۱۔ پند آموز حکایات کا ترجمہ، مطبوعہ ۱۸۲۱ء۔

۲۔ قصہ کامروپ، مصنفہ تحسین الدین کا فرانسیسی ترجمہ، مطبوعہ ۱۸۲۴ء۔

۳۔ انتخاب کلام میر تقی میر، فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ، مطبوعہ ۱۸۲۶ء۔

۴۔ کتبہ جات عربی فارسی اردو، مطبوعہ ۱۸۲۸ء۔

۵۔ اردو زبان کا ابتدائی رسالہ، مطبوعہ ۱۸۳۳ء۔

۶۔ مسلمانان مشرق کا علم عروض عربی فارسی و اردو، مطبوعہ ۱۸۳۴ء۔

۷۔ ہندوؤں کے کھانے جن کا ذکر اردو کتابوں میں ہے، مطبوعہ ۱۸۳۴ء۔

۸۔ انتخاب قصہ گل بکاؤلی فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ، مطبوعہ ۱۸۳۵ء۔

۹۔ انتخاب کلام ولی اورنگ آبادی، مطبوعہ ۱۸۳۶ء۔

۱۰۔ ذکر تذکرہ جات مشتمل بر حالات شعرا و مصنفین ہندی اردو، مطبوعہ ۱۹۳۸ء۔

۱۱۔ سعدی دکھنی،(۲) ہندوستان کا ایک مشہور شاعر، مطبوعہ ۱۸۴۳ء۔

۱۲۔ انتخاب اردو ہندی، مطبوعہ ۱۸۵۴ء۔

۱۳۔ تذکرہ مصنفین و تصانیف اردو، مطبوعہ ۱۸۶۴ء۔

۱۴۔ تذکرہ شعرائے اردو، تین جلدوں میں، مطبوعہ ۱۸۷۰ء

یورپین مصنفین میں گارسان دتاسی نے، جیسا کہ اوپر کی فہرست سے ظاہر ہے، اردو سے متعلق سب سے زیادہ کتابیں لکھیں۔

مندرجہ بالا مصنفین کے علاوہ یورپین مصنفین کے اور نام بھی ملتے ہیں، جنہوں نے اردو ادب کا مطالعہ کر کے اپنی کچھ یادگاریں چھوڑی ہیں، مثلاً ولیم میکفرسن، جان ولیم پیل، وغیرہ۔ ولیم میکفرسن نے "دستور العمل عدالت دیوانی حکومت فورٹ ولیم" کے نام سے ایک قانونی کتاب مرتب کی، اور جان ولیم پیل نے مولوی کریم الدین کی مدد سے آلات طبعی" پر ایک رسالہ مرتب کیا، جو ۱۸۵۴ء میں طبع ہوا۔

اس سلسلے میں گراہم بیلی کا بھی ذکر کر دیا جائے تو نا مناسب ہو گا۔ انہوں نے انگریزی میں "ہسٹری آف اردو لٹریچر" کے نام سے ۱۹۳۲ء میں اردو شعرا کا سو صفحوں پر مشتمل ایک مختصر تذکرہ لکھا ہے، جو لندن سے شائع ہوا۔ اس میں اردو زبان کے آغاز اور دکن میں اردو کی تصنیفات سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے ربع اول تک کے مشہور شعراء اور نثر نگاروں کا ذکر ہے۔

تبصرہ

اوپر کے مختصر جائزہ سے معلوم ہوتا ہے' اردو سے متعلق یورپین مصنفین کی خدمات بیشتر گرامر اور لغات کی شکل میں ہیں- ان کی مادری زبان اردو نہیں تھی- اس لئے جب انہوں نے اردو زبان و ادب کا مطالعہ کرنا چاہا' تو سب سے پہلے انہیں قواعد اور لغات کی ضرورت محسوس ہوئی- غیر قوم اور غیر اہل زبان کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے- وہ جب کسی دوسری قوم کی زبان و ادب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں' تو وہ براہ راست اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے- ان کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے- اس لئے یورپین مصنفین نے بھی اردو زبان و ادب سے واقفیت حاصل کر کے تصنیف و تالیف کا آغاز کیا' تو سب سے زیادہ انہوں نے اردو قواعد اور لغات کی طرف توجہ کی' اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنے ہم وطنوں کے لئے' جو ملازمت کے سلسلے میں برصغیر آتے تھے' ان چیزوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ مہیا کر دیا- ان کا وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف اگرچہ اہل زبان کے لئے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت نہیں- ہوئی' لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اردو کا دامن بہت وسیع ہوگیا- اور مشرق کو چھوڑ کر مغرب میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا اور وہاں کے لوگ بیش از بیش اردو سے دلچسپی لینے لگے- اس لحاظ سے اہل یورپ کی سرپرستی اور قدردانی' اور دلچسپی اردو کے لئے نیک فال ثابت ہوئی-

یورپین مصنفین نے قواعد اردو اور لغات کے علاوہ دوسرے بعض موضوعات مثلاً شعرائے اردو کا تذکرہ اردو قصے اور حکایات وغیرہ سے بھی دلچسپی لی' لیکن ان کی آج صرف تاریخی حیثیت سے زیادہ کوئی وقعت نہیں ہے-

حواشی

۱- ماخوذ از داستان تاریخ اردو' صفحہ ۸۸-

۲- جدید تحقیقات کی رو سے پتا چلتا ہے' یہ سعدی دکنی نہیں ہے' بلکہ کاکوروی ہے-

باب چہارم

اردو نثر میں اصلاحی اقدام

تمہید

یہ سر سید احمد خان اور ان کے قابل فخر رفقائے کار کا دور ہے، جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لے کر، ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی تک محیط ہے۔ اردو نثر کے اس عہد کو عہد زریں کہنا چاہیئے۔ مرزا غالب کے رقعات کی بدولت اور فورٹ ولیم کالج کی سادہ نویسی سے جس تحریک کا آغاز ہوا تھا، اس کی تکمیل گویا اسی زمانے میں ہوئی۔ اس دور میں بڑے بڑے اہل قلم پیدا ہوئے، اور انہوں نے گوناگوں موضوعات پر خامہ فرسائی کر کے اردو نثر کو مالا مال کیا۔ اس میں نئی دنیا کے تقاضوں کی پوری قدر کر کے اردو ادب کو اس کائنات رنگ و بو کی زندگی سے قریب تر کیا گیا۔ اب ہمارے ادیب عالم ماورا، سے اپنی توجہ ہٹا کر عالم مشاہدہ پر زیادہ زور دینے لگے۔ اس عہد میں جن، پری، جادوگرنی وغیرہ جیسے ما فوق الفطرت عناصر کا ذکر بالکل چھٹ گیا، اور ادب کو نیچر یا فطرت کے مطابق لانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ اس زمانے میں اردو ادب، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ہماری روزمرہ زندگی سے کامل موافقت رکھتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم جس طرح بات کرتے ہیں وہی انداز تحریر میں بھی ہے۔ قافیہ پیمائی یا مسجع عبارت لکھنی بند ہو گئی۔

اس عہد کو بعض لوگ عہد جدید سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ آج سے دو سو سال بعد ہماری زندگی کی نئی قدریں پرانی قدروں میں مدغم ہو جائیں، اور اردو ادب کا یہ جدید دور جدید نہ کہلائے بلکہ قدیم میں شمار ہو۔ اس لئے ہم یہاں اس خاص لفظ کا استعمال نہیں کرنا چاہتے۔ یہ سر سید اور ان کے رفقائے کار کا دور ہے اور یہ دور اسی نام سے موسوم ہو تو بہتر ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ اس دور کو وجود میں لانے کے لئے مرزا غالب کے خطوط اور فورٹ ولیم کالج کی تالیفات کا بڑا ہاتھ ہے، لیکن پھر بھی ان کارناموں میں ہمارے معاشرہ کی پرانی قدروں

کو یکسر ترک نہیں کیا گیا' یا نہیں کیا جا سکا- ان نگارشات میں پرانے خد و خال آسانی سے پہچانے جا سکتے ہیں- سرسید کے دور میں آ کر ادب کا رخ بالکل بدل گیا- اس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو بڑا دخل ہے- اس جنگ میں انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا' تو یہاں صدیوں کی مسلم حکومت کا شیرازہ پارہ پارہ ہو گیا- عہد نشاط ختم ہوا' اور زندگی بہت کٹھن ہو گئی- اب مجاز کی دنیا میں رہنا بالکل نا ممکن ہو گیا- حقیقت پسندی کا دور شروع ہوا-

ہم اس باب میں ان بزرگ ہستیوں اور ان کے گراں بہا کارناموں کا ذکر کریں گے' جنہوں نے زمانے کے رخ اور زندگی کے نئے دھارے کو صحیح طور پر پہچان کر ایسا ادب تخلیق کیا' جو موجودہ دنیا کے باشندوں کے لئے باعث فخر ہے-

سرسید احمد خان

تمہید- اس سلسلے میں سب سے پہلے جس گرامی قدر ہستی کا نام آتا ہے' وہ سرسید احمد خان کا ہے- سرسید احمد خان ہماری قوم کے' بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے "بہت بڑے محسن ہیں- انہوں نے اپنی بے پایاں صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر ہماری قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے بچایا' اور ساحل پر لا کر نئی زندگی بخشی-

سرسید احمد خان یوں تو ایک ہمہ گیر اور ہنگامہ خیز شخصیت کے مالک تھے- اور ان کی عملی سرگرمیاں زندگی کے ہر شعبہ پر محیط تھیں' جن میں سیاست' تعلیم' مذہب' تحقیق' ادب زیادہ نمایاں ہیں- لیکن ہم یہاں اپنی بحث کو صرف ان کی ادبی سرگرمیوں تک محدود رکھیں گے اور اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ انہوں نے اردو کے نثری ادب کو کیا دیا اور اپنے زمانے کے دوسرے اہل قلم پر کیا اثرات ڈالے

سرسید احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے- ان کے آباؤ اجداد غالباً سترھویں صدی عیسوی میں شاہجہاں کے زمانے میں برصغیر آئے' اور سلطنت مغلیہ کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے- ان کے دادا سید ہادی کو شاہ عالمگیر ثانی (سنہ جلوس ۱۷۵۵ء) نے حسن خدمت کے صلے میں جواد علی خاں کا خطاب اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار دیا- شاہ عالمگیر ثانی کے بعد شاہ عالم کے عہد (۱۷۵۹ء- ۱۸۰۶ء) میں خطاب کے ساتھ جواد الدولہ کا اضافہ ہوا- سرسید کے والد میر متقی بھی بڑے ذی وقار اور با عزت شخص تھے- شاہی دربار میں ان کا اثر و رسوخ کافی تھا- ان کی والدہ عزیز النساء بیگم نہایت پاک دل' نیک سیرت اور روشن خیال خاتون تھیں' جن کی تربیت کا اثر ان کی زندگی پر ہمیشہ رہا- والد کا انتقال ۱۸۳۸ء میں ہوا' اور والدہ کا ۱۸۵۷ء میں-

سرسید نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مشرقی علوم مثلاً فلسفہ' منطق' ریاضی' اقلیدس' ہیئت' صرف و نحو اور معانی اور بیان میں دستگاہ حاصل کی۔ طب بھی پڑھا' اور چند مہینے مطب کیا۔ اس کے علاوہ دہلی میں اس وقت جو با کمال لوگ تھے' جیسے صہبائی' غالب' آزردہ' شیفتہ' مومن' وغیرہ' ان کی صحبتوں سے فیض اٹھایا۔ مرزا غالب سے تو ان کا ربط و ضبط اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ ان کو چچا کہہ کر پکارتے تھے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر سرسید احمد خاں ۱۸۳۸ء میں دلی ہی میں سررشتہ داری کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ پھر ۱۸۳۹ء میں نائب منشی اور ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کر کے مین پوری میں منصف ہو گئے۔ جنوری' ۱۸۴۲ء میں مین پوری سے فتح پور سیکری آ گئے' اور وہاں منصف کی حیثیت سے چار سال قیام کیا۔ ۱۸۴۲ء میں ایک مرتبہ دہلی آئے تھے' تو حکیم احسن اللہ خان نے آخری تاجدار بہادر شاہ سے ان کی سفارش کی۔ بادشاہ نے ان کو ان کا پرانا موروثی خطاب جواد الدولہ سید احمد خان عارف جنگ دیا۔

۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دلی کے صدر امین رہے۔ ۱۸۵۵ء میں ان کا تبادلہ بجنور ہو گیا۔ ۱۸۵۸ء میں صدر الصدور ہو کر مراد آباد گئے۔ وہاں سے پھر ۱۸۶۲ء میں تبدیل ہو کر غازی پور گئے۔ ۱۸۶۴ء میں ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ ۱۸۶۷ء میں نوکری کے سلسلے میں بنارس گئے۔ ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ کا بھی سفر کیا' جہاں ان کو حکومت برطانیہ کی طرف سے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔ وہاں سے ۱۸۷۰ء میں وطن واپس آئے۔ ۱۸۷۸ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر تعلیمی' سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اخیر میں ایک طویل عمر پا کر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال کیا۔

ادبی زندگی :

سرسید احمد خان کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ۱۸۴۰ء سے ہوا' جب کہ ان کی عمر بائیس تیئس سال سے زیادہ نہ تھی۔ ان کے بڑے بھائی سید محمد خان نے ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں "سید الاخبار" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا۔ اس میں وہ مختلف موضوعات پر اردو میں مضامین لکھتے تھے۔ اس کے بعد ساری عمر متواتر لکھتے رہے۔ انہوں نے اتنا لکھا کہ اس زمانے میں شاید ہی کوئی ان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ ان میں ایک خاص شعور اور ذہنی بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ وہ قوم کی ناگفتہ بہ حالت سے بہت نالاں تھے۔ وہ چپ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ انہیں قوم کا بیڑا پار کرنا تھا۔ قوم کو اپنی قومیت کا احساس دلانا تھا۔ قوم کے ایک ایک فرد کو جھنجوڑ کر خواب غفلت سے بیدار کرنا تھا۔ خدا نے انہیں مصلح قوم بنا کر دنیا میں بھیجا تھا۔ انہیں صدیوں کی پرانی قدروں کے

خلاف کمر بستہ ہو کر جہاد کرنا تھا۔ ہاتھ سے، زبان سے، قلم سے، بہر صورت انہیں سرگرم عمل رہنا تھا۔ تاکہ یہ مردہ قوم پھر ایک مرتبہ آنکھ کھول کر اپنی حالت زار پر روئے، اور عملی قدم اٹھا کر اس کا کوئی درمان نکالے۔

سر سید کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست تو بہت طویل ہے، لیکن ہمیں یہاں صرف ان کے ان اہم کارناموں کی روشنی میں ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لینا ہے، جن سے ہماری زندگی اور اردو ادب پر گہرے اور دیرپا اثرات مترتب ہوئے۔ سر سید کی ادبی زندگی کو مندرجہ ذیل تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

دور اول شروع سے لے کر ۱۸۵۷ء تک۔

دور دوم ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک، جب کہ انہوں نے انگلینڈ کا سفر کیا۔

دور سوم ۱۸۷۰ء سے لے کر ۱۸۹۸ء تک جب ان کا انتقال ہوا۔

دور اول کی تصنیفات و تالیفات

۱۔ جلاء القلوب۔ یہ آنحضرت صلعم پر ایک مختصر رسالہ ہے، جو ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں مرتب ہوا۔ میلاد کی محفلوں میں عموماً جو کتابیں یا رسالے پڑھے جاتے ہیں، ان میں غیر معتبر روایتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ اس لئے سر سید احمد خان نے اس رسالے میں چھان بین کے بعد صحیح روایتیں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲۔ تحفہ حسن۔ یہ شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی کے رسالہ "تحفہ اثنا عشریہ" کے دسواں اور بارہواں باب کا اردو ترجمہ ہے۔ سنہ تالیف ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء ہے۔

۳۔ تسہیل فی جر الثقیل۔ یہ بو علی نام ایک شخص کے فارسی رسالہ "معیار العقول" کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۸۴۴ء میں طبع ہوا۔

۴۔ آثار الصنادید۔ یہ سر سید کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں دہلی کی اہم اور تاریخی عمارتوں کے بارے میں تفصیلی معلومات درج ہیں۔ سر سید ۱۸۴۶ء میں فتح پور سیکری سے تبدیل ہو کر دہلی آئے تھے، اس کے بعد وہ وہاں مسلسل چار سال تک رہے۔ یہ کتاب انہوں نے اسی زمانے میں بڑی کاوش اور محنت سے مرتب کی تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس کی عبارت بعض جگہ مولوی امام بخش صہبائی کی لکھی ہوئی تھی۔ اس لئے مقفی، مسجع اور رنگین تھی۔ ۱۸۵۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو زبان آسان اور سلیس کر دی گئی۔ گارسان دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں فرانسیسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کو دیکھ کر لندن کی رائل

ایشیاٹک سوسائٹی نے سر سید کو سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا۔ منشی رحمت اللہ نے کانپور سے نہایت اہتمام کے ساتھ ۱۹۰۴ء میں "آثار الصنادید" کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا۔ جس میں پہلے دونوں ایڈیشنوں کی ساری خوبیوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"اس مکان کے بیچوں بیچ میں شرقی دیوار سے ملا ہوا سنگ مرمر کا تخت ہے چار گز کا مربع' اور اس پر چار ستون لگا کر بنگلے کے طور پر اس کی چھت بنائی ہے' اور آدمی کے قد سے زائد کرسی دی ہے' اس کے پیچھے ایک طاق ہے' سنگ مرمر کا بنا ہوا' سات گز لمبا اور ڈھائی گز کا چوڑا۔ اس پر ہر قسم کے چرند و پرند کی تصویریں عجب عجب رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ اور اس میں ایک آدمی کی تصویر ہے' جو دو تارہ بجا کر گا رہا ہے۔ ملک اٹلی میں جو فرنگستان میں واقع ہے' آرفیوس کلاونت کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا' اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند پرند اس کی آواز سن کر مست ہو جاتے' اور اس کے گرد آ بیٹھتے تھے۔ اسی ملک میں رفیل ایک مصور تھا کہ تصویر کھینچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتا تھا۔ اس مصور نے آرفیوس کے گانے کی جو کہانی مشہور تھی' اس کے مطابق اپنے خیال سے ایک مرقع کھینچا تھا' اور چرند و پرند' اس کے گرد گانا سننے کو بیٹھے ہوئے بنائے تھے۔ یہ مصور ۱۵۲۰ء میں مرا' یہ مرقع اس کا بنایا ہوا ملک اٹلی اور ولایت فرنگستان میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے' اور اب تک اس کی نقلیں موجود ہیں۔ وہی مرقع اس طاق میں پتھر کی پچیکاری میں کھودا ہے۔ پس یہ تصویر اسی آرفیسوس کی ہے' اور جو کہ اس مرقع کا سوائے فرنگستان کے اور کہیں رواج نہ تھا۔ اس سبب سے یقین پڑتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی انگریز اٹلی کے ملک کا ضرور شریک تھا۔ اس محراب کی بغل میں دروازہ ہے' اور اندر سے بھی آنے کا رستہ ہے۔ بادشاہ اس تخت پر دربار عام کے دن اجلاس کرتے تھے۔ اس تخت کے آگے ایک تخت سنگ مرمر کا بچھا ہوا ہے۔ امرا میں سے جس کسی کو عرض کرنا ہوتا تھا' اس تخت پر چڑھ کر بادشاہ سے عرض کرتا تھا۔ یہ تخت اتنا اونچا ہے کہ اس تخت کے چڑھنے پر بھی آدمی کا گلا تخت تک پہنچتا ہے۔"

۵۔ **کلمہ الحق** یہ رسالہ سر سید نے پیری مریدی اور بیعت کے مروجہ طریقے کے خلاف ۱۸۴۹ء میں مرتب کیا۔

۶۔ **راہ سنت در رد بدعت** یہ رسالہ سر سید نے برصغیر میں فرقہ وہابیت کے عروج کے

زمانے میں اہل بدعت کے خلاف اور متبعین سنت کی تائید میں لکھا ہے۔ سنہ تالیف ۱۸۵۰ء ہے۔

۷۔ **سلسلتہ الملوک** مرتبہ ۱۸۵۲ء۔ یہ رسالہ اصل میں "آثار الصنادید" کا ہی ایک حصہ ہے' جو اس کتاب کے باب اول میں شامل تھا۔ بعد میں اس کو الگ شائع کیا گیا۔ اس میں ہندو راجہ جدھشٹر سے لے کر ملکہ وکٹوریہ تک دہلی کے ۲۰۲ راجاؤں اور بادشاہوں کے بارے میں مختصر مگر مفید معلومات درج ہیں۔ یہ حصہ اب "آثار الصنادید" کے تیسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔

۸۔ **قول متین فی ابطال حرکت زمین** یہ رسالہ سر سید احمد خان نے زمین کی گردش کی تردید اور آسمان کی گردش کی حمایت میں لکھا تھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنا خیال بدل دیا تھا۔ اس کا سنہ تالیف معلوم نہیں۔ اندازہ ہے' ۱۸۵۷ء سے پہلے کی ہے۔

۹۔ **تاریخ ضلع بجنور** یہ کتاب انہوں نے ۱۸۵۵ء میں اپنے قیام بجنور کے زمانے میں اپنے محکمے کی زیر ہدایت لکھی تھی' لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں تلف ہو گئی تھی۔

۱۰۔ **تصحیح آئین اکبری** یہ ابو الفضل کی مشہور فارسی کتاب "آئین اکبری" کا اردو ترجمہ ہے۔ سر سید نے اسے اپنے قیام بجنور کے زمانے میں دہلی کے ایک تاجر کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ اس کی پہلی اور دوسری جلدیں ۱۸۵۶ء میں شائع ہو گئی تھیں۔ تیسری جلد بھی چھپنے ہی والی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔ اس لئے چھپنے نہ پائی اور تلف ہو گئی۔

تبصرہ

سر سید کی ادبی زندگی کا یہ دور' جیسا کہ اوپر کی تالیفات سے پتا چلتا ہے' بہت حد تک مذہبی اعتقادات اور دینی رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں انہوں نے جو کچھ لکھا' اس کا بیشتر حصہ روحانی زندگی کا ترجمان ہے۔

سر سید کو تصوف اور تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی۔ تصوف کا مذاق تو انہیں خاندان سے ورثے میں ملا تھا۔ تاریخ سے دلچسپی بھی ان میں قدیم ماحول کی بدولت پیدا ہوئی تھی۔ شاہان مغلیہ کے درباروں میں اس فن کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔

سر سید جو کہ بہت جلد اردو ادب میں ایک انقلاب عظیم برپا کرنے والے تھے' اس دور میں قدیم لباس میں نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں شاہی دور کے رجعت پسندانہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ انداز بیان میں بھی ذرا قدامت کی بو آتی ہے۔ اگرچہ اس دور کے حصہ اخیر میں انگریزوں

سے میل جول کی وجہ سے ان میں تھوڑی بہت تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ نقوش ابھی ابتدائی حالت میں ہیں۔ شاید حالات کے اور بگڑنے یا بدل جانے کے منتظر ہیں۔ ان کی ایک کتاب "آثار الصنادید" ہی کو لے لیجئے۔ اس میں پہلے جو عبارت تھی' وہ مقفی و مسجع تھی۔ مانا کہ وہ ان کی اپنی نہیں' بلکہ ان کے دوست مولوی امام بخش صہبائی کی لکھی ہوئی تھی' لیکن سر سید کی پسند اس میں ضرور شامل تھی۔ بعد میں جب ۱۸۵۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا' تو سر سید نے زمانے کے نئے رجحانات کے زیر اثر اس کی زبان کو جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے' بہت حد تک آسان اور سلیس بنا دیا تھا۔

دور دوم کی تصنیفات و تالیفات

۱۔ **تاریخ سرکشی بجنور** اس میں مئی' ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء کے تمام واقعات تفصیل سے درج ہیں' جو جنگ آزادی سے متعلق تھے۔ جس وقت وہ ہنگامہ برپا ہوا تھا' سر سید بجنور میں تھے۔ وہ اس زمانے سے اس کتاب کے لئے یادداشتیں مہیا کر رہے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں وہ تبدیل ہو کر مراد آباد گئے' تو اس کو مرتب کر کے شائع کیا۔ وہ زمانہ بڑی افراتفری کا تھا۔ لوگوں کے جان و مال سب خطرے میں تھے۔ خود سر سید بھی خوف و ہراس کی حالت میں تھے۔ چاروں طرف سے مصیبتوں میں گھرے ہوئے تھے' لیکن اس کے باوجود اس کتاب کے لئے مسالہ اکٹھا کرتے رہے۔

۲۔ **اسباب بغاوت ہند** مرتبہ ۱۸۵۹ء۔ اس میں' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' ۱۸۵۷ء کے فساد پھیلنے کے اسباب پر مدلل بحث ہے۔ اس میں انہوں نے سیاسی حکمت عملی سے کام لیا ہے۔ قومی حمیت و غیرت کے جذبہ نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس ہنگامہ قیامت خیز میں مسلمانوں کو بے قصور ٹھہرایا جائے۔ ہنگامے کے بعد جب حالت ذرا معمول پر آئی' تو حکمران طبقہ جذبہ انتقام کے ماتحت یہاں کے لوگوں کو چن چن کر سزائیں دینے لگا۔ اس کا خمیازہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ کیوں کہ اسی طبقے کو ان کا مدمقابل سمجھا گیا۔ سر سید نے معذرت کے انداز میں مسلمانوں کی طرف سے صفائی پیش کی کہ ان کا اتنا قصور نہیں ہے' جتنا کہ حکومت کی ناعاقبت اندیشی اور بدتدبیری کا۔ "اسباب بغاوت ہند" کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> "لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک نہ ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت' قوانین و ضوابط کی جو جاری ہوئے' بخوبی معلوم نہ ہو سکی' اور اغراض عام رعایا' جس کا لحاظ رکھنا گورنمنٹ کو واجبات سے تھا' ملحوظ

نہیں رہیں اور رعایا کو اس مضرت کے رفع کرنے اور اپنے مطلب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی' بلکہ بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ رعایا کو منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہ ہوا۔ گورنمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی۔ جو تجویز گورنمنٹ کی ہوئی تھی' ہندوستانیوں کو بسبب اس کے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے اور کم اس تجویز سے واقف تھے' اس کی بنیاد معلوم نہ ہوئی' اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کو خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے۔ اور وہ بعض باتیں' جو درحقیقت گورنمنٹ سے برخلاف رواج اور مخالف طبیعت اور طینت ہندوستانیوں کے صادر ہوئی تھیں' قطع نظر اس سے کہ وہ فی نفسہ اچھی تھیں یا بری' زیادہ تر ان کے غلط خیالات کو تقویت دیتی تھیں۔"

۳۔ **لائل محمڈنز آف انڈیا** یہ ایک رسالہ ہے' جو ۱۸۶۰ء میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں جاری کیا گیا تھا۔ ایک سال چلا اس کے بعد ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔ اس میں ان مسلمانوں کے حالات بیان کئے جاتے تھے' جو ہنگامے کے زمانے میں حکمران طبقہ کے طرف دار تھے۔

۴۔ **تحقیق لفظ نصریٰ** ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد حکمران قوم کو کچھ ایسا لٹریچر ہاتھ لگ گیا' جس میں ان کو "نصریٰ" کہا گیا تھا۔ اس کو انہوں نے اپنی توہین اور تذلیل پر محمول کیا۔ چنانچہ اس بنا پر بعض مسلمانوں کو سزائیں بھی دیں۔ سرسید کو جب یہ بات معلوم ہوئی' تو بہت پریشان ہوئے' اور جلد اس لفظ کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھ ڈالا۔ اور بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے قرآن و حدیث سے دلائل و شواہد پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ اس لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ان کی توہین و تحقیر کی جائے۔

۵۔ **تبیین الکلام** —— یہ کتاب سرسید نے مراد آباد کے زمانہ قیام میں لکھنی شروع کی تھی' لیکن غازی پور میں جا کر تکمیل کو پہنچی۔ وہ مراد آباد سے تبدیل ہو کر ۱۸۶۲ء میں غازی پور گئے تھے۔ اس میں انہوں نے انگریزوں سے صلح جوئی کی خاطر بائبل' توریت اور قرآن کی اصولی باتوں میں وحدت کا رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان آسمانی کتابوں میں جہاں جہاں اختلافات نظر آئے' ان میں مطابقت پیدا کرنا چاہی۔ یہ اصل میں توریت اور انجیل کی تفسیر ہے۔ اس کے لکھنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے سیاسی اختلافات دور ہونے کے ساتھ مذہبی طور پر جو تفرقہ اور تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ بھی دور ہو جائے۔ اور آپس کی مخالفت او

منافرت کی بجائے صلح و آشتی کی فضا پیدا ہو۔ یہ وقت کی پکار تھی۔ انگریز اس وقت حاکم بن چکے تھے' اور مسلمان محکوم۔ ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے اس بات کی بڑی ضرورت تھی۔ سر سید نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ اگرچہ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد علمائے کرام کی طرف سے بڑے اعتراضات ہوئے' اور سر سید پر خوب طعن و تشنیع ہوئی۔ لیکن اس کے برخلاف اہل یورپ نے اس کی بڑی قدر کی۔

اس کتاب کے لکھنے میں سر سید کو بہت انرجی اور کثیر زر صرف کرنا پڑا۔ اس کی صرف دو جلدیں طبع ہوئیں' اور "تبیین الکلام فی تفسیر التوراہ والانجیل علی ملت الاسلام" کے نام سے ۱۸۶۲ء میں غازی پور سے شائع ہوئی۔ نمونہ عبارت حسب ذیل ہے:

"اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک لفظ یا فقرہ کئی معنی رکھتا ہے' اور اس کے مقابلے میں دوسری زبان کا ایسا لفظ نہیں ہوتا' جس سے وہ سب معنی حاصل ہوں۔ اس لئے مترجم بمجبوری یا تو اس کا ترجمہ کسی ایک پہلو پر کرتا ہے' یا صرف بموجب اپنی رائے اور اپنے اعتقاد اور اپنے مسلمات کے اس کا ترجمہ کر دیتا ہے' جو در حقیقت کلام الٰہی کی وسعت کو ناواجب تنگی میں ڈالتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ جب تک ذریعہ الہام کے کوئی خاص معنی کسی کلام الٰہی کے مقرر نہ ہوئے ہوں' اس وقت کلام الٰہی سے جس قدر مطالب ہوں' ان سب کو سمجھے' اور سب پر غور کرے' اور جو مطلب حق اور صحیح ثابت ہو اس کو اختیار کرے۔"

۶۔ رسالہ احکام طعام اہل کتاب —— مسلمان انگریزوں کے طرز معاشرت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے' اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے کو شرعاً ناجائز سمجھتے تھے۔ سر سید نے اس رسالے میں قرآن و حدیث سے دلائل پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ قوم اہل کتاب ہے' اور ان کے ساتھ کھانا پینا ناجائز نہیں' بلکہ حلال ہے۔

تبصرہ

سر سید کا یہ دور سماجی کشمکش اور معاشرتی آویزش میں گھرا ہوا ہے۔ اور اس سے آزادی حاصل کرنے کے لئے وہ ہمہ تن مصروف معلوم ہوتے ہیں۔ مسلمان اس وقت سیاسی اور سماجی اعتبار سے حکمران طبقہ سے سرپیکار تھے۔ ان میں آپس میں کشیدگی گھٹنے کی بجائے روز بروز بڑھ رہی تھی۔ یہ صورت حال مسلمانوں کے حق میں بہت ہی برے نتائج لانے والی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اس بات کو سمجھ نہیں رہے تھے۔ وہ تعصب اور کوتاہ اندیشی میں مبتلا تھے۔ ان

میں ابھی بادشاہت کا گھمنڈ باقی تھا۔ وہ حاکم سے محکوم بنا کسی طرح گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بر سر اقتدار قوم سے صلح و آشتی کے جویا ہونے کی بجائے اس سے نبرد آزما ہونے کو ہی ترجیح دی۔ سر سید اس وقت یکایک میدان میں نکل آئے' اور بڑی ہمت' جرات اور استقلال کے ساتھ حالات سے نبٹنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے لئے انہوں نے تحریر' تقریر اور عمل سب سے بہ یک وقت کام لیا۔

سر سید ایک طرف تو معذرت کے لہجے میں انگریزوں کے دل سے ان تمام غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے کوشش کرتے رہے' جو سوء اتفاق سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پیدا ہو گئی تھیں اور دوسری طرف خود اپنے ہم قوم مسلمانوں کے غم و غصہ کو بھی دور کرنے کے لئے افہام و تفہیم کا مسلک اختیار کیا۔ وہ یہ ایک طرف تو "تاریخ سر کشی بجنور" اسباب بغاوت ہند اور رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا" لکھ کر انگریزوں کو یہ بات دلنشین کراتے ہیں کہ ان سارے ہنگاموں میں مسلمان بے قصور ہیں۔ ان پر خواہ مخواہ بغاوت کا الزام لگا کر انسانیت سوز مظالم نہ توڑے جائیں' اور دوسری طرف وہ "تبیین الکلام" اور رسالہ احکام طعام اہل کتاب" لکھ کر مسلمان اور انگریز دونوں کو یہ بتاتے ہیں کہ ان میں آپس میں مذہبی اعتبار سے بھی کوئی بیر نہیں ہے' بلکہ دونوں کے مذاہب کے بنیادی اصول کا مبداء و منبع ایک ہی ہے۔ دونوں کی روحانی زندگیوں میں کامل ہم آہنگی ہے۔ لڑنے جھگڑنے اور ایک دوسرے کو دشمن اور حریف سمجھنے سے باز رہنا چاہیے۔

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر سر سید نے جو کچھ لکھا اس میں بے ساختہ پن موجود ہے۔ تحریر میں بے ساختگی ہو تو اس کا سادہ اور آسان ہونا ایک فطری امر ہے۔ سر سید کے اس دور کی تحریروں میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے طرز و انداز بیان میں بھی کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ ان کو تو قوم کی ڈوبتی کشتی کو سمندر کی طغیانی سے بچانا تھا۔ اس لئے ان کو ایک سپاہی یا مرد مجاہد بن کر شب و روز کام کرنا تھا۔ ان کے زمانے میں شاہی دور کا یکسر خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے ان کو وہ اطمینان اور چین کہاں تھا کہ اپنی تحریریں لفاظی' عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی سے کام لیتے۔ وہ سادہ لکھنے پر ایک لحاظ سے گویا مجبور تھے۔ ان کی نگارشات میں عہد جدید کے سارے تقاضے پورے ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی عبارت پڑھ کر کسی کو شدت کے ساتھ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ قدیم ہے۔

دور سوم کی تصنیفات و تالیفات

سر سید کی ادبی زندگی کا یہ دور آخری دور ہے' لیکن بڑا انقلاب انگیز ہے۔ یہ دور اس وقت

سے شروع ہوتا ہے' جب انہوں نے انگلستان کا سفر کیا' اور ان کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔ اس عرصے میں انہوں نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

۱۔ **سفرنامہ لندن** اس سلسلے میں پہلا نام "سفرنامہ لندن" کا آتا ہے۔ سرسید ۱۸۶۹ء میں ایک خاص غرض سے' جس کا ذکر آگے آئے گا' لندن گئے۔ وہاں ایک سال قیام کر کے ۱۸۷۰ء میں وطن واپس ہوئے۔ انہوں نے اپنے سفر انگلستان کے تاثرات قلم بند کئے۔ اس میں یورپ کے عجائبات کچھ اس انداز سے بیان کئے کہ پڑھنے والوں کو وہاں جانے کی ترغیب ہوتی ہے۔ اس کے کچھ اجزا سوسائٹی اخبار میں شائع ہوئے تھے۔ مگر پبلک کی مخالفت کی بنا پر وہ سلسلہ بند کرنا پڑا۔

۲۔ یہ سرسید کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ اس کی وجہ سے انہوں نے بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ اس کے لئے مواد برصغیر میں نہیں مل سکتا تھا' اس لئے مالی نقصان برداشت کر کے انگلستان کا سفر کیا۔ یہ اصل میں سرولیم میور' لیفٹیننٹ گورنر' صوبہ شمال مغرب' غیر منقسم ہند کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب ہے۔ سرولیم میور کی کتاب چار جلدوں میں چھپ کر جب برصغیر آئی' تو ملک میں بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ اس لئے کہ اس میں آنحضرت صلعم پر بڑے نازیبا اور ناشائستہ حملے کئے گئے تھے' اور اسلام دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ سرسید اس سے بہت پریشان ہوئے۔ بلکہ یوں کہئے' ان کو جلال آگیا۔ وہ اس کا جواب لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس لئے کہ جب تک نظریاتی طور پر اس کتاب کے مضامین کا بطلان نہ ثابت کیا جاتا۔ اسلامی دنیا کو سخت خطرہ لاحق تھا۔ سرسید کے بعض دوستوں نے یہ جواب لکھنے سے انہیں منع کیا کہ حالات سازگار نہیں۔ لیکن ان پر قومی و ملی جذبہ غالب آیا۔ ایک نہ مانی۔ پہلے تو وطن میں بیٹھ کر ہی اس کتاب کو ترتیب دیتے رہے' لیکن جب تمام ضروری مواد فراہم ہونا دشوار نظر آیا تو ولایت جانے کا ارادہ کیا۔ ۱۸۶۹ء میں ان کے صاحب زادے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے وہاں جانے لگے' تو ان کے ہم سفر ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ مصر' فرانس اور جرمنی سے عربی کی نایاب کتابیں منگوائیں' لیٹن اور انگریزی کی قدیم اور نایاب کتابیں لندن سے خریدیں اور شب و روز کی مسلسل محنت کے بعد بارہ خطبات تیار کئے' اور ۱۸۷۰ء میں لندن ہی میں چھپوا کر شائع کیا۔

"خطبات احمدیہ" لکھنے کے لئے وہ کتنے بے تاب تھے' اور ان کو اس کے سبب کس قدر مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا اندازہ ان کے بعض خطوط سے ہوتا ہے' جو انہوں نے لندن سے نواب محسن الملک کو اس زمانے میں لکھے تھے۔ بعض خطوط کا اقتباس یہاں نقل کرنا دلچسپ

سے خالی نہ ہوگا۔

"ولیم میور صاحب کی کتاب کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا' اور اس کی نا انصافیاں اور تعصبات کو دیکھ کر دل کباب ہو گیا' اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ رکھتا تھا' کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے' اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے.... لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے۔ سود اور روپیہ میں ادا کروں گا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے' اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو۔ کیا کہئے' اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے___ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے' اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے___ اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی' تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا___

سر ولیم میور اور دیگر مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے' سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ جواب ہیں' اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو' وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو' اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے' تو تو میرا نام' ورنہ میرا نام نہیں۔"

اوپر کے اقتباس سے سرسید کے جن پر خلوص جذبات و احساسات کا اظہار ہوا ہے' وہ صرف ایک سچے عاشق رسولؐ ہی سے ہو سکتا ہے۔ وہ آنحضرت صلعم کے جوش محبت میں اپنا مال و متاع آرام و آسائش سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ ہماری اسلامی دنیا میں ایسی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ سرسید کے اسی خلوص اور شدت محبت کا نتیجہ ہے کہ "خطبات احمدیہ" میں ان کا طرز استدلال اور زور بیان اپنے عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ ایسی کتاب کا مقبول ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ ان کے اس کارنامے کو مسلمان اور انگریز دونوں نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

سرسید ایک خط میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"میری کتاب "خطبات احمدیہ" ایک مسلمان عالم تبحر نے پڑھی' جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے' اور جس طرح میرے ہاتھ چومے' اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں۔"

اس کتاب کے بارے میں ریورنڈ ہوپر کے نام سے ڈونٹی کالج' لاہور کے انگریز پرنسپل نے لکھا ہے:

"مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سید احمد خان کو کافر' ملحد اور بد مذہب سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خان نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے' وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا۔"

مسٹر آرنلڈ' مصنف "پریچنگ آف اسلام" نے لکھا ہے:

"ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی' اور اس کا ترجمہ کسی یورپ کی زبان میں ہو گیا' لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ ہی کی کسی زبان(۱) میں اس مضمون پر کتاب لکھی ہو۔"

اس کے علاوہ اس کتاب کے شائع ہونے پر اسی زمانے میں لندن کے ایک اخبار میں ایک انگریز نے لکھا تھا:

"عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انہیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے' جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے' جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔"

"خطبات احمدیہ" کا اردو ایڈیشن' جو کہ انگریزی ایڈیشن کے مقابلے میں زیادہ مفصل ہے' سر سید نے وطن واپس آ کر شائع کیا۔ اردو ایڈیشن کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ اسلام میں تعدد ازدواج کے مسئلہ پر لکھتے ہیں:

"اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے' اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے۔ تعدد کو صرف ایک نہایت محدود خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا' جو اس کی مرضی کے موافق ہو' جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا' ضرور ایسا ہو گا' جو قانون قدرت کے تو برخلاف نہ ہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے' اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرت ازواج کی ممانعت' اور صورت ہائے خاص اور حالت مستثنیٰ میں اجازت ہو' اور یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پر پیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے' جہاں فرمایا ہے:

"فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ (یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروں میں عدل نہ کر سکو گے" تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے)- اس آیت کے اگر وہی ظاہری معنی لئے جائیں' جیسے اکثر فقہا اور علما نے لئے ہیں' تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد ازواج کو گویا بالکل روک دیا- کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازواج کی' جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے' جرات نہیں کرے گا' لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھہرایا گیا ہے- کیونکہ یہ نہیں کہا گیا کہ ان لم تو لوا(۲) بلکہ یہ فرمایا گیا ہے ان خفتم الا تعدلوا- پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ ہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا-"

۲- ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو ڈاکٹر ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں "آور انڈین مسلمانز" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی' جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان سیاسی اور مذہبی لحاظ سے انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور تھے' اس لئے ان کی طرف سے کسی حالت میں بھی اطمینان نہیں ہو سکتا تھا- اس زمانے میں انگریزوں اور مسلمانوں میں تو کشیدگی تھی ہی' اس کتاب کی اشاعت سے غلط فہمیوں میں اضافہ ہونے کا اور اندیشہ پیدا ہو گیا- سر سید نے اپنی کوششوں سے جو ذرا خوشگوار فضا پیدا کی تھی' اس میں پھر تکدر کا بادل چھا جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا- اس لئے وہ پھر بے چین ہو گئے' اور اس کتاب پر سخت نکتہ چینی کی' اور ہنٹر کے موہوم خیالات کی دلائل کے ساتھ تردید کی- یہ ریویو پہلے تو انگریزی میں تھا' اور "پایونیر" میں چھپا تھا' لیکن بعد میں اس کا اردو ترجمہ "سوسائٹی اخبار" کی ۲۴ نومبر ۱۸۷۱ء سے ۲۳ فروری ۱۸۷۲ء تک کی ۱۴ اشاعتوں میں شائع ہوا-(۳)

۳- تفسیر القرآن یہ سر سید کی آخری تصنیف ہے- اس میں بھی "خطبات احمدیہ" کی طرح قومیت کے تحفظ کا جذبہ کارفرما ہے- اسکی پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی- دوسری جلدیں اس کے بعد وقتاً" فوقتاً" شائع ہوتی رہیں- لیکن پوری تفسیر وہ مکمل نہ کر پائے- نصف قرآن سے کچھ زیادہ ہی کی تفسیر لکھ چکے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا- سورۃ بنی اسرائیل تک چھ جلدیں مکمل ہو کر شائع ہوئیں- سورۃ انبیاء تک ایک اور جلد لکھ لی تھی' لیکن شائع نہیں ہوئی-

انیسویں صدی عیسوی کے ربع سوم میں جب مغرب کے اثرات برصغیر کے مسلمانوں خصوصاً نوجوان مسلمانوں پر ذرا زیادہ پڑنے لگے' اور ہر چیز کو عقلیت کے سانچے میں ڈھال کر دیکھنے اور

سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا، تو سر سید کو اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ہمارے نوجوان فلسفہ اور سائنس پڑھ کر قرآن کریم کی روحانی قدروں سے منحرف ہو جائیں۔ اس بات کے پیش نظر سر سید نے طے کیا کہ قرآن شریف کی ایک تفسیر لکھ کر تمام احکام، عقاید اور قصص کو عقل کے مطابق ثابت کیا جائے۔ جو بات عقل کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی اسے نکال باہر کیا جائے۔ یہ سر سید کا بہت بڑا اقدام تھا اور اس میں شک نہیں کہ ان کا وہ اقدام ان کی نیک نیتی پر مبنی تھا۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ سر سید اس کام میں حد سے تجاوز کر گئے، اور عقلیت کے جوش میں "ایمان بالغیب" کی صداقت سے بھی انکار کر دیا۔ ہماری زندگی کی مادی قدریں اور ہیں، اور روحانی قدریں کچھ اور۔ سب کو ہم مغرب کی پیروی میں مادہ کی کسوٹی پر نہیں جانچ سکتے۔ اگر یہی واقعہ ہوتا، تو مشرق مشرق نہ ہوتا۔ مشرق روحانیت کے لئے مشہور ہے، اور مغرب مادیت کے لئے۔ اور دونوں میں فرق بین ہے۔ ایک سچے مسلمان اور محب رسول ہونے کے باوجود انہوں نے ایسا اقدام کیا یہ ان کی غلطی تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر بعد میں اس کتاب پر علمائے کبار کی طرف سے بڑے اعتراضات ہوئے۔ سر سید کا تفسیر میں قرآن کے تمام معجزات، اور فوق الفطرت باتوں سے انکار کرنا، ایمان بالغیب کی غلط تاویل کرنا اور غیر مرئی ہونے کے سبب جنوں کو صحرائی اقوام قرار دینا، یہ سب باتیں ایسی ہیں، جو ہر مسلمان کے لئے ناقابل قبول ہیں۔ مولانا حالی، جن پر سر سید کی "مداحی" کا اکثر الزام لگایا جاتا ہے، انھوں نے بھی اس بات کا اعتراف کیا۔ "حیات جاوید" میں لکھتے ہیں:

"آخر عمر میں سر سید کی خود رائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا، وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے، جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔"

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سر سید کو ہم عالم اسلام کے بہترین مسلمانوں میں ہی شمار کریں گے۔ ان کا حال دل خود ان ہی کی زبانی سن لیجئے

خدا دارم، دل بریان ز عشق مصطفیٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز سامانے کہ من دارم

"تفسیر القرآن" کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو، جو سورۃ توبہ کی تفسیر میں مسئلہ جہاد پر بحث کرتے ہوئے رسول اکرم صلعم کے غزوات کے بارے میں لکھی گئی ہے:

"تمام انبیا، جبکہ قوم کی اصلاح اور ان کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں، تو ابتدا میں

عموماً ان کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں- اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے، تو دنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ کسی اور مذہب کا- اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا- اگر بعد میں حضرت مسیح کے اس کے لئے ایسا زمانہ نہ آتا، جس میں اس کے پیرووں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی، اور بروز حکومت اس کو ترقی دی گئی..... پس یہ کہنا کہ انبیا کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں، ایک ایسا قول ہے، جس کو قانون قدرت مردود ٹھہراتا ہے- لوگ حضرت موسیٰ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں، اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیح کو پیش کرتے ہیں- مگر حضرت مسیح نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا، اس وقت سے ان کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گزرا تھا، اور صرف ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) ان پر ایمان لائے تھے- ان کو مطلق ایسی قوت، جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں، حاصل نہیں ہوئی تھی وہ اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوس ناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا- اس کے بعد اگر اس کے (یعنی ابن مسیح کے) ایسے حامی نہ پیدا ہو جاتے، جو دشمنوں کو دفع کر سکے، تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ دکھائی نہ دیتی-"

سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ

گزشتہ صفحات میں سرسید کی مستقل تصنیفات و تالیفات کا ذکر کیا جا چکا ہے- اب ہم یہاں ان کی ان سرگرمیوں کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے علم و ادب کی ترقی کے لئے جاری کر رکھی تھیں- اس سلسلے میں پہلے سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ کا ذکر آتا ہے- سرسید نے اگرچہ زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاح و تجدد لانے کی کوشش کی، جس میں سیاست اور مذہب کے شعبے زیادہ اہم ہیں- لیکن بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق:

"ان کا سب سے بڑا کام تعلیمی اور علمی تھا، اور اس کا ایک جز سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا-" سرسید نے ۱۸۶۳ء میں ایک اپیل شائع کی، جس کا عنوان تھا "التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند-" اس میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ برصغیر میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لئے ایک انجمن قائم کرنی چاہیے- اس انجمن کا کام یہ ہوگا کہ عربی فارسی کی قدیم علمی کتابیں اور انگریزی کے مفید کارنامے ترجمہ کرا کر شائع کرے- چنانچہ اسی خیال کے ماتحت انہوں نے دوسرے ہی سال عملی قدم اٹھایا- اور ۹ جنوری، ۱۸۶۴ء کو غازی پور میں، جہاں وہ اس وقت صدر الصدور کی حیثیت سے متعین تھے، اپنے مکان پر ایک

جلسہ منعقد کیا- وہ جلسہ ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے اور اس کے اغراض و مقاصد کو بیان کرنے کے لئے کیا گیا تھا- اس جلسے میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ ملک میں جتنی جلدی ممکن ہو سکے، علوم جدیدہ کی اشاعت کا انتظام کرنا چاہیے' اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا' جب تک کہ مختلف زبانوں سے علمی کتابیں اردو میں ترجمہ نہ کی جائیں- بقول مولانا حالی سرسید نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا-(۴) اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد مولانا حالی ہی کی زبانی یہ ہیں:

"سائنٹفک سوسائٹی" اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے' علمی مضامین پر لکچر دئے جائیں' رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے سے ظاہر کئے جائیں' جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے- ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کئے جائیں' اور اس طرح قومی مغائرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے' اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے-"

اسی سال کچھ دنوں کے بعد سرسید کا غازی پور سے علی گڑھ تبادلہ ہو گیا- چونکہ سوسائٹی کے بانی مبانی وہی تھے' اس لئے اس کے دفتر اور عملے کو بھی اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے- کافی پیسہ صرف کر کے وہاں اس کے لئے مستقل مکان بنوا دیا- مارچ' ۱۸۶۶ء سے سوسائٹی کا پرچہ "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" جاری ہوا- یہ پرچہ پہلے ہفتہ وار تھا- کچھ دن بعد ہفتے میں دو مرتبہ نکلنے لگا- ایڈیٹر خود سرسید تھے- مولانا حالی اس پرچے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اول اول سرسید زیادہ تر اس میں پولیٹیکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے- اس لئے ان کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹیکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے- اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا' اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے- اس لئے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے- اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا' اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا- اس کی ابتدائی جلدوں کے

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔

"اس میں سوشل' اخلاقی' علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جب تک سر سید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوتی' علاوہ ان لیڈنگ آرٹی کلون کے' وہ خود لکھتے تھے۔ انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے' برابر ترجمہ ہو کر چھپتے تھے۔

ہندوستان کے طریق معاشرت تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیئے جاتے تھے' وہ سب اس کے ذریعے سے شائع ہوتے تھے۔"

"اگرچہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے' اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانہ حال کی نئی اطلاعیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں' ان کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی پولیٹیکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچہ نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا' وہ آج تک کسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔"

یہ سائنٹفک سوسائٹی بعد میں علی گڑھ تحریک میں تبدیل ہو گئی' جس کے نتیجے میں پہلے علی گڑھ کالج' پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی معرض وجود میں آئی۔ علی گڑھ تحریک نے ملک و ملت کی کیا خدمات انجام دیں' اس پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔

سائنٹفک سوسائٹی کا خاص مقصد' جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے' مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تالیف اور مغرب اور مشرق کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ترجمہ کرنا تھا۔ اس لئے کہ لوگوں میں علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ ایک بڑا ذریعہ تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر سوسائٹی نے لائق اور قابل اہل قلم کو ترجمے کے کام کے لئے مقرر کیا' جنہوں نے کوئی چالیس کے قریب چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں تالیف کیں۔ ان کتابوں کی یہاں فہرست نقل کرنی طوالت سے خالی نہیں۔ اس لئے ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔

تہذیب الاخلاق یہ اردو کا معرکتہ الارا رسالہ ہے' جو سر سید نے ولایت سے واپس آنے کے بعد ۲۴ دسمبر' ۱۸۷۰ء سے شائع کرنا شروع کیا۔ اس میں وہ خود بھی مضامین لکھتے تھے' اور دوسروں سے بھی لکھوا کر شائع کرتے تھے۔ اس رسالے کے ذریعے سے انہوں نے ملک و ملت

کی خدمت کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی ایسی گراں قدر خدمات انجام دیں جن کے نتائج نہایت وسیع، دور رس اور دیر پا ثابت ہوئے۔ یہ رسالہ تین مرتبہ بند ہوا اور تین مرتبہ جاری ہوا، اور ہر بار نئی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اس میں سادہ اور سلیس زبان استعمال کی گئی۔ پیرایہ بیان بھی اس قدر دلنشین اختیار کیا گیا تھا کہ مدعی قائل ہو کر رہ جاتا تھا۔ سرسید کے مخالفین بہت تھے، جو ان کے ہر اصلاحی اقدام پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس لئے وہ بھی سرسید کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے۔ لیکن غیر شعوری طور پر "تہذیب الاخلاق" کے مضامین کی پیروی کر جاتے تھے۔ وہ لوگ بھی وہی اسلوب اختیار کرتے تھے، جو سرسید کا تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ زبان میں سادگی اور سلاست اور عبارت میں روانی اور دلکشی پیدا ہو گئی۔

تبصرہ

گزشتہ صفحات میں سرسید کی جن اردو تالیفات و تصنیفات کا احاطہ کیا گیا ہے، ان میں تین باتیں زیادہ نمایاں ہیں۔ سیاست، مذہب اور تعلیم۔ ان کی ساری تحریریں زندگی کے ان تین شعبوں میں منقسم ہیں۔ باقی جو ہیں، وہ ذیلی ہیں، اور ان ہی تین شعبوں کے گرد گھومتی ہیں۔ برصغیر کے باشندوں کا ایک غیر قوم سے سابقہ پڑنے سے جو الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں، سرسید کی تمام عمر ان ہی کو سلجھانے میں گزرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کام میں وہ مذہب کو نیا لباس پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عملاً اس میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے ادب میں مقصدیت کا غلبہ ہے۔ ان کے ہاں زندگی برائے ادب نہیں، بلکہ ادب برائے زندگی، اور دونوں میں جو بین فرق ہے، وہ سب پر عیاں ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے جو ادب پیدا کیا وہ دوسرے درجے کا نہیں، بلکہ اول درجے کا ہے۔ وہ تو بلکہ ادب کے میدان میں پیش امام نظر آتے ہیں، اور اس عہد کے دوسرے تمام اہل قلم ان کے مقتدی۔ ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت اور ایسی مقناطیسی قوت تھی کہ بہت سے ارباب علم و فن ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ جیسے شمع کی روشنی میں پروانے۔ وہ سب مل کر سرسید کو اور ان کے مشن کو کامیاب بنانے میں مدد کرتے تھے۔

سرسید کا احسان اردو نثر پر بہت زیادہ ہے۔ ان سے پہلے اردو نثر کی جو حالت اور کیفیت تھی، وہ ہم گزشتہ ابواب میں دیکھ چکے ہیں۔ صاحب علم اکثر مقفیٰ و مسجع عبارت لکھتے تھے۔ فارسی، اور عربی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ البتہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تالیف اور ترجمہ ہوئیں، ان میں سادہ بول چال کی زبان لکھی گئی۔ یہ کالج کے انگریز ناظموں کی ہدایت کا نتیجہ ہے۔ جدید نثر کا آغاز اسی کالج

سے ہوا- چند سال کے بعد کالج بند ہو گیا- اس لئے اردو نثر پر اس کی کارگزاریوں کا اثر بہت حد تک محدود ہو کر رہ گیا- اس کے علاوہ اس میں بیشتر قصے کہانیوں کی کتابیں ترجمہ ہوئی تھیں' جن میں دو چار زیادہ مشہور ہوئیں- تاریخ' مذہب وغیرہ کے موضوعات پر بھی کچھ کتابیں ترجمہ و تالیف ہوئیں- لیکن ان کا زیادہ رواج نہ ہوا' اور بہت جلد ناپید ہو گئیں-

"اردو زبان میں ابھی تک وہ توانائی پیدا نہیں ہوئی تھی' جو ایک زبان کے ادب کے لئے لازم ہے- سر سید احمد خان نے اس کے قالب میں ایک نئی روح پھونکی' اور اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا- بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق انہوں نے "زبان کو پستی سے نکالا" انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی- سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا- سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی- جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے- خود کتابیں لکھیں' اور دوسروں سے لکھوائیں- اخبار "سائنٹفک سوسائٹی" علی گڑھ (انسٹی ٹیوٹ گزٹ) جاری کر کے اپنے انداز تحریر' بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا- تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا..... ان کی اور ان کے رفقا کی سعی عمل سے علی گڑھ اردو ادب اور روشن خیالی کا ایسا مرکز بن گیا تھا' جس کی فضیلت اور برتری سب نے تسلیم کی ہے- یہ اردو زبان کے فروغ اور رواج کا زمانہ تھا' اور اردو ادب کی تاریخ میں اس کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا جائے گا-"(۴)

سر سید نے اردو نثر کو پرانی روش سے ہٹا کر' ایک نئی شاہراہ پر ڈال دیا- انہوں نے خود بھی سادہ طرز تحریر اختیار کیا اور اپنی تصنیفات و تالیفات اور سب سے بڑھ کر اپنے پرچوں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے دوسرے رفقائے کار کے مذاق کو ہموار کیا' اور انہیں ایسا اسلوب تحریر اپنانے پر آمادہ کیا' جو زندگی کے تقاضوں سے قریب تر ہوں' اور لوگ بہ آسانی مطلب اور مفہوم کو سمجھ سکیں- یہ بہت بڑا کام تھا' جو سر سید جیسا اولو العزم اور قومیت کے جذبے سے سرشار آدمی ہی کر سکتا تھا- سر سید نے اردو ادب کو کیا دیا' اور اس کی کیا خدمات انجام دیں' یہ ان ہی کی زبانی سن لیجئے- وہ لکھتے ہیں :

> "جہاں تک ہم سے ہو سکا' ہم نے اردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی- مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا- جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی' الفاظ کی درستی' بول چال کی صفائی پر کوشش کی- رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے' اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے' اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا' پرہیز کیا- تک بندی سے' جو اس زمانے میں مقفی عبارت کہلاتی

تھی، ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی، اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آ گئی ہے۔ اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسندیدہ طریقہ ادائے مضمون کا بالکل اٹھتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لفظوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے، جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ اور سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان پاس موجود نہیں، جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں، اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں، ان کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں ان پر ہو چکی ہیں، اور جو امور ان کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں، ان سے آگاہی ہو۔"(۵)

کچھ عرصہ بعد پھر لکھتے ہیں:

"اردو زبان کا علم ادب جو بد خیالات اور موٹے و بھدے الفاظ کا مجمع ہو رہا ہے۔ اس میں بھی جہاں تک ہم سے ہو سکا اصلاح چاہی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس میں کچھ کیا۔ مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں ان باتوں پر بقدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمدردی، قومی عزت، سلف آفرینی اپنے۔آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہ کیا، تو ان لفظوں کو تو ضرور اردو زبان کے علم و ادب میں داخل کیا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اردو علم ادب کا ترقی پانا، بھی ہماری مرادیں تھیں، جن کو ہم نے بھر پایا۔(۶)

سرسید نے بلاشبہ اردو علم و ادب کی بڑی خدمت کی۔ اردو نثر میں متانت، سادگی اور سنجیدگی انہوں نے ہی پیدا کی۔ اس میں اس وقت ادبی اور علمی صلاحیت پائی جاتی ہے، وہ ان ہی کے قلم کا اعجاز ہے۔ قوم پر ان کا بڑا احسان ہے۔ ان کی تحریروں سے اس میں بیداری اور روشن خیالی پیدا ہوئی۔

سر سید کی ساری عمر لکھنے پڑھنے اور تصنیف و تالیف میں گزری۔ وہ ان تھک لکھتے رہے۔ لیکن جب وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ آئے اور کالج کا کام سنبھالا' تو ان کا سارا وقت صبح سے شام تک لکھنے ہی میں گزرتا تھا۔ ان کو دوسری سیاسی اور تعلیمی معروفیات کے علاوہ اتنے گوناگوں موضوعات پر لکھنا پڑتا تھا کہ ان کو اتنا بھی وقت نہ ملتا تھا۔ کہ جو کچھ لکھا اس پر نظر ثانی کریں۔ اس لئے بعض اوقات ان کی تحریریں پھس پھس ہو جاتی تھیں' جو ادب عالیہ میں شامل نہیں ہو سکتیں۔ لیکن بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق "جو شخص دن رات لکھتا رہے اور اس قدر مختلف شعبوں اور موضوعات پر لکھے' اور جسے ایک مضمون لکھنے یا لکھانے کے بعد دوبارہ دیکھنے یا نظر ثانی کی فرصت نہ ملے' اس سے یہ توقع کرنا کہ اس کی ہر تحریر ادب کا اعلیٰ نمونہ ہو' عبث ہے۔(۷)

سر سید ادائے مطلب کی سادگی اور صفائی کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ بعض اوقات مفہوم کو عام فہم بنانے کی خاطر حسن بیان کو قربان کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے بھی بعض جگہ ان کی عبارت ذرا بے جان معلوم ہوتی ہے۔

سر سید نے لندن میں ہی کسی لائق انگریز کے ذریعہ سے "خطبات احمدیہ" کا

حواشی

۱۔ انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کیا تھا۔

۲۔ یعنی اگر عدل نہ کر سکو۔

۳۔ سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا' صفحہ ۱۰۔

۴۔ چند ہم عصر' صفحہ ۲۴۰۔

۵۔ چند ہم عصر' صفحہ ۲۴۲-۲۴۳۔

۶۔ چند ہم عصر' صفحہ ۲۴۴۔

۷۔ چند ہم عصر' صفحہ ۲۴۵۔

عہد سرسید کے دیگر ممتاز نثر نگار

تمہید

سرسید کا عہد اردو علم و ادب کا عہد شباب ہے۔ اس عہد میں اتنے اہل قلم پیدا ہوئے کہ سب کا یہاں احاطہ کرنا دشوار ہے۔ اس لئے ہم اس عہد کے صرف ان نثر نگاروں کا ذکر کریں گے، جو اس عہد کے نمائندے کہلاتے یا کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں، جو سرسید کے رفقائے کار تھے، اور ان کے مشن کے حامی تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے، جنہوں نے انفرادی طور پر کام کر کے اردو ادب میں ممتاز حیثیت حاصل کی۔ مگر ان پر بھی کسی نہ کسی طرح سرسید کا اثر رہا ہے۔

مولوی چراغ علی

حالات زندگی۔۔۔ مولوی چراغ علی سرسید کے خاص رفقائے کار میں سے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۵ جون ۱۸۹۵ء کو انتقال کیا۔ ان کے آباؤ اجداد سرینگر، کشمیر کے رہنے والے تھے۔ بعد میں میرٹھ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

مولوی چراغ علی اپنے ہی بل بوتے پر کھڑے ہوئے، اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ و ثروت اور لیاقت و فضیلت حاصل کی۔ ان کی تعلیم بہت معمولی درجے کی ہوئی تھی۔ لیکن لگاتار محنت اور مطالعہ کی بدولت انہوں نے وہ استعداد بہم پہنچائی، جو اوروں کو باقاعدہ اعلیٰ تعلیم سے بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ابتدا ایک معمولی منشی کی حیثیت سے بیس روپیہ تنخواہ پر نوکر ہوئے۔ غالباً ۱۸۷۴ء میں ان کا تبادلہ لکھنؤ ہو گیا۔ سرسید سے وہاں ان کی ملاقات ہوئی، اور آپس میں اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ مولوی چراغ علی مذہبی آدمی تھے۔ اور اسلام کی فضیلت اور حقانیت غیر مسلموں کے سامنے جتانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اس موضوع پر وہ اس سے قبل کئی ایک کتابیں اور مضامین لکھ چکے تھے۔ سرسید نے ان کو اپنا ہم خیال پا کر ان کی طرف دوستی کا ہاتھ

بڑھایا- ۱۸۷۶ء میں سر سید نے ان سے کچھ ترجمے کا کام کرایا' جو حیدر آباد سے آیا ہوا تھا- ۱۸۷۷ء میں ان کو حیدر آباد سر سالار جنگ کے پاس بھیج دیا- وہاں ان کو مددگار معتمد مال گزاری کی حیثیت سے مقرر کیا گیا- بعد میں ترقی کرتے کرتے معتمد مال و فنانس ہو گئے- انہوں نے اپنے فرائض اس حسن و خوبی سے انجام دیئے کہ اس کے صلے میں نواب اعظم یار جنگ بہادر کا خطاب ملا-

ادبی زندگی— مولوی چراغ علی نے کتابیں تو بہت لکھیں' لیکن ان میں سے اکثر انگریزی میں ہیں- اس لئے ہمارے دائرہ بحث سے باہر ہیں- اردو میں صرف ان کے چند رسائل ہیں- جو مسودے کی صورت میں رہ گئے- ان چھوٹے بڑے ۴۵ رسالوں میں سے مولوی عبداللہ خان نے صرف مندرجہ ذیل پانچ رسالے مرتب کر کے ۱۹۱۸ء میں کتب خانہ آصفیہ' حیدر آباد سے شائع کئے-

۱- تہذیب الکلام فی حقیقت الاسلام

۲- مجموعہ روایات استرقاق-

۳- تدبیر الاسلام فی تحریر الامتہ و الغلام-

۴- تحقیق مسئلہ تعدد ازواج-

۵- تعلیقات-

مولوی چراغ علی سر سید سے بہت متاثر ہیں- اس لئے قدرتی طور پر ان کا طریقہ استدلال بھی وہی ہے' جو سر سید کا ہے- مسئلے کے ہر پہلو پر عقلی و نقلی دلائل سے بحث کرتے ہیں- تحریر میں متانت و قوت موجود ہے- رسائل چراغ میں سے "تدبیر الاسلام فی تحریر الامتہ والغلام" کی عبارت کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

> "آزاد اور خود مختار مخلوقات کا غلام بنانا ایک ایسی بدنامی اور ارباب دانش کی نظر میں حقارت و ذلت ہے' جس کو ہر ایک شخص جو ادنیٰ سی بصیرت رکھتا ہو' اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے اور اس میں کچھ شک ہی نہیں کہ خدا نے ہر ایک شخص کو آفرینش کی راہ سے ایک سی حیثیت عقلی و جسمانی کا پیدا کیا ہے' اور تمام مخلوقات فطرت کی راہ سے باہم مساوی ہیں- پس اگر فطرت میں آزادی ہے تو سب کے سب آزاد ہونے چاہیں' یا اس کے بالعکس- ورنہ دراصل قدرتی فرق اور فطرتی تمیز آزاد اور غلام میں نہیں پائی جاتی-"

نواب محسن الملک

حالات زندگی: نواب محسن الملک ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا۔ اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں یہ مذہب ترک کر کے اپنے سنی ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ انہوں نے محض اپنی قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر ترقی کی۔ دس روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ملازمت شروع کی، اور تین ہزار پر ریٹائر ہوئے۔ وہ اولاً ایک گمنام شخص تھے۔ مگر بعد میں ان کی شہرت ملک سے باہر بھی پہنچی۔ پہلے وہ کلکٹری میں ایک بہت ہی معمولی عہدے پر بھرتی ہوئے لیکن رفتہ رفتہ ان کا جوہر کھلتا گیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ سرشتہ دار ہوگئے۔ ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار بنا دیے گئے۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کے مقابلہ کے امتحان میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ اس بنا پر ۱۸۶۷ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ ۱۸۷۴ء میں حیدر آباد کے وزیراعظم سر سالار جنگ نے ریاست حیدر آباد کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں، جہاں ان کی تنخواہ بارہ سو مقرر ہوئی۔ چند روز بعد پندرہ سو ہوگئی، اور کمشنر بندوبست ہوئے۔ اسی زمانے میں ان کو نواب منیر نواب جنگ بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۸۷۶ء میں ریونیو سیکرٹری ہوئے۔ کچھ دن کے بعد فنانشل اور پولیٹکل سیکرٹری بنائے گئے، اور تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ محسن الدولہ محسن الملک کا خطاب بھی ملا۔

سرسید کے عقائد اور خیالات سے وہ شروع میں اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ بعد میں جب انہوں نے اس مصلح عظیم کو بہت قریب سے دیکھا، اور ان کی ظاہری اور باطنی خوبیوں پر ان کی نظر پڑی تو بے حد گرویدہ ہوگئے۔ حیدر آباد سے پنشن لے کر علی گڑھ آکر سرسید کے ساتھ رہنے لگے۔ ۱۸۹۹ء میں وہ علی گڑھ کالج کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس حیثیت سے انہوں نے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیئے۔

ادبی زندگی:

اردو نثر میں نواب محسن الملک کی مندرجہ ذیل کتابیں یادگار ہیں:

(۱) قانون مال (۲) قانون فوجداری (۳) مضامین تہذیب الاخلاق (۴) مجموعہ لیکچرز (۵) تقلید عمل بالحدیث (۶) کتاب المحبت والشوق (۷) مسلمانوں کی تہذیب (۸) مکاتیب (۹) آیات بینات۔
ان کتابوں میں "قانون مال" اور "قانون فوجداری" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، قانون سے تعلق رکھتی ہیں۔

ان کی قابل قدر تالیف ان کا مجموعہ مضامین "تہذیب الاخلاق" ہے۔ سرسید نے "تہذیب

الاخلاق" ۱۸۷۰ء میں جاری کیا تھا۔ اس میں نواب محسن الملک نے بھی مختلف موضوعات مثلا اخلاقی، تعلیمی، تاریخی اور اصلاحی مضامین لکھے۔ ان کا یہ مجموعہ ان ہی مضامین پر مشتمل ہے۔ نواب محسن الملک نے ایک لحاظ سے سرسید ہی کے خیالات اور عقائد کو بیان کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں بھی سرسید کی تحریروں کی طرح جوش اور خلوص پایا جاتا ہے۔ انداز تحریر بھی تقریباً وہی ہے، جو سرسید کا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ہلکی سی قدامت کی بو آنے لگتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے قصہ کہا، تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں صرف یہ کہہ کر "جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم و فنون جدید کا باغ ہے، جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ پھر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے، اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے، جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو سرچشمہ پر آگیا ہے، جہالت ہے، وہ ندی نالے، گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی، نیکی نما تعصب، علم نما نادانی، جھوٹا زہد، جھوٹی شیخی، جاہلانہ تقریر، عامیانہ غلامی، ضد انگیز حرارت، وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے، جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے، جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے، چپ ہو رہا۔"

نواب محسن الملک کے مجموعہ لیکچرز بھی پڑھنے کی چیز ہے۔ ان کی تقریریں نہایت پرجوش اور موثر ہوتی تھیں۔ ایک لیکچر سے ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو:

"حضرات کتنے ایسے عالم اس وقت ہم میں ہیں، جو ان باتوں کو سن کر غصے میں نہ آئیں گے، اور ان باتوں کو نیچریانہ کلام سمجھ کر اس سے متنفر نہ ہوں گے، اور یہ سن کر کہ صنعت و حرفت کا سکھانا، اور اس کی ہدایت کرنا اصل عبادت ہے، کہنے والے کو نیچری اور کافر نہ کہیں گے، جب کہ ہادیان طریقت کا یہ حال ہو، اور وہ خود سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہوں، تو قوم اور امت کیونکر منزل مقصود پر پہنچ سکتی ہے۔"

"تقلید عمل بالحدیث "کتاب المحبت والشوق" کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ "مسلمانوں کی تہذیب" نواب محسن الملک کا ایک اصلاحی اور اخلاقی مضمون ہے۔ اس میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب پہلے کیسی تھی، اب کیسی ہے اور آئندہ کیسی ہوگئی۔ انداز تحریر بڑا

عالمانہ اور محققانہ ہے۔ عبارت کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"طبیعیات جاننے والا مسلمانوں میں کوئی نہیں رہا۔ ہاں چند مسائل کا بیان اس زمانے کے عالم اس طرح پر کرتے ہیں کہ عناصر چار ہیں۔ خاک' باد' آب' آتش۔ یہ چاروں بسیط ہیں۔ خاک کے اور آب اور آب کے اوپر باد اور باد کے اوپر آگ ہے' اور بہت بڑا ناری کرہ ہے۔ آسمان کی حرکت سے مشتعل رہتا ہے۔ مگر چونکہ قطبین کی طرف حرکت کم ہے' اس لیے وہاں مستعمل بھی کم ہے' اور اس سبب سے کہ اس کی شکل اہلیلجی ہوگئی ہے۔ جب شاگرد پوچھتا ہے کہ اہلیلجی کی کیا شکل ہے' تو استاد اپنی سرمہ دانی کو دکھاتے ہیں کہ ایسی بیچ سے موٹی' دونوں طرف سے پتلی۔ بس اس زمانے میں عالموں کی یہ طبیعیات رہ گئی ہے' جس پر ہر کوئی ہنستا ہے۔"

"مکاتیب" میں سے سرسید کے نام ایک مکتوب کا اقتباس درج ذیل ہے:

"--- پس باوجود ان تمام باتوں کے اس مجلس کا ترقی نہ کرنا' بلکہ روز بروز اس میں تنزل ہونا ایک حیرت انگیز معاملہ ہے۔ مگر میرے نزدیک کوئی اور بڑا قوی سبب اس کا سوائے اس کے نہیں ہے کہ وقت سے پیشتر مجلس کے تمام مقام اور مجلس کی کارروائی سے لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی۔ جب بہت ہی تھوڑا وقت رہ جاتا ہے تب لوگوں کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں مقام پر ان کا اجلاس ہوگا' اور چونکہ دوسرے لوگ اس کی اشاعت میں اور اس میں شریک ہونے کے لیے ترغیب دینے کی تدبیریں نہیں کرتے' اس لئے سوائے چند پرانے ارکان اور چند مدرسے کے طلبہ اور چند وزیٹر کے باہر سے نئے نئے لوگ نہیں آتے اوز بوجہ اس کے کہ ریزولیوشن بہت کم پیش کئے جاتے ہیں' اور ان پر تنگی وقت سے بحث کی نوبت نہیں آتی' لوگوں کے دل سرد ہوتے' اور ان کے ولولے اور جوش ٹھنڈے پڑتے جاتے ہیں۔"

آیات بینات نواب محسن الملک کی خالص مذہبی کتاب ہے۔ اس کی تین جلدیں ہیں۔ پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں مرزا پور کے مشن پریس سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔ یہ کتاب سرسید سے تعلقات قائم ہونے سے پہلے لکھی گئی۔ بعد میں انہوں نے سرسید کے مشن سے متاثر ہو کر اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کر دی۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"پس ہم لوگوں کو فقط اسلام کے نام پر خوش ہونا اور صرف توحید اور نبوت کے اقرار پر اپنے کو ناجی سمجھنا نہ چاہئے۔ بلکہ ہر عقیدے کی تحقیق کرنا اور ہر اعتقادی مسئلہ

کی تطبیق کتاب اللہ اور کتاب الرسول سے دینا ضروری ہے اور یہ ممکن نہیں کہ جو شخص اپنے سچے اور صاف دل سے صرف اپنی نجات کی امید پر خدا کی کتاب کو دیکھے اور تعصب اور عناد کو دخل نہ دے۔" وہ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکے اور ایسے حق کے طالب کو خدا گمراہی میں پڑا رکھے۔ ہاں جو کوئی پہلے سے سچائی کا طالب نہ ہو' اور مذہبی تعصب میں گرفتار ہو' اور سوائے مجادلے اور مکابرے کے اسے اور کچھ منظور نہ ہو' اور اپنے آبائی دین و مذہب کو تقلیداً" سچ جانتا ہو' وہ بے شک اپنی گمراہی میں پڑا رہے گا۔ اور اپنے دل کو باطل عقیدوں سے کبھی پاک و صاف نہ کر سکے گا۔"

مولانا محمد حسین آزاد

سرسید کے عہد کے ایک بہت بڑے قابل فخر فن کار مولانا محمد حسین آزاد ہیں۔ ان کا فن اپنی مثال آپ ہے۔ وہ اردو ادب میں ایک ایسی منفرد حیثیت کے مالک ہیں' جس کی نظیر نہ ان سے پہلے تھی' نہ ان کے بعد آج تک پیدا ہوئی۔

حالات زندگی:

مولانا محمد حسین آزاد بقول مولانا حامد حسن قادری: غالباً ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال جنوری ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ والد کا نام مولوی محمد باقر تھا' جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے ہاتھ قید ہو کر مارے گئے۔ آزاد کی تعلیم دلی کالج میں ہوئی' جہاں مولوی نذیر احمد' مولوی ذکاء اللہ ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ بھی پڑھتے تھے' جنھوں نے بعد میں ادبی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ یہ سب ان کے رفیق تھے۔ استاد ذوق سے آزاد کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اس بنا پر وہ ذوق کے شاگرد ہوئے' اور ان کے ساتھ دلی کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہوا تو یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ آزاد کی زندگی بڑی مصیبتوں میں گزری۔ ان کے دل کو والد کے انتقال سے اس قدر شدید چوٹ آئی کہ پریشان ہو کر گھر سے نکل گئے اور ادھر ادھر سرگرداں پھرتے رہے۔ ان کو دنیا میں کسی شے سے لگاؤ نہ تھا' سوائے ایک متاع عزیز کے--- استاد ذوق کی نظموں کا بستہ' جس کو وہ اپنی جان سے عزیز رکھتے اور ہمیشہ بغل میں دبائے پھرتے تھے۔

ہنگامہ ذرا فرو ہوا تو آزاد اہل و عیال کو لے کر لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ لیکن وہاں بھی زمانے نے ساتھ نہ دیا۔ لاچار ۱۸۶۴ء میں قسمت آزمائی کے لیے لاہور پہنچے۔ کوشش کر کے سررشتہ تعلیم صوبہ پنجاب میں پندرہ روپیہ ماہوار پر نوکر ہو گئے۔ میجر فلر ڈائریکٹر تعلیمات تھے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب کے ذریعے آزاد کی ان تک رسائی ہوئی۔ میجر فلر علم دوست آدمی تھے' آزاد کی بڑی قدر کی۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور سے "اتالیق پنجاب" کے نام سے ایک سرکاری اخبار نکلتا تھا' جس کے ایڈیٹر ماسٹر پیارے لال آشوب تھے۔ کرنل صاحب

نے مولانا آزاد کو ۷۵ روپیہ تنخواہ پر اس کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا- اس سے ان کے برے دن ختم ہوئے- کچھ دن بعد "اتالیق پنجاب" بند ہوگیا' تو اس کی جگہ "پنجاب میگزین" نکلنے لگا- آزاد اس کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے- آزاد کے والد بھی ایک جرنلسٹ تھے' جنہوں نے ۱۸۳۷ء میں دہلی سے "اردو اخبار" جاری کیا تھا- اس لحاظ سے یہ پیشہ گویا انہیں ورثے میں ملا تھا-

مولانا آزاد نے پنڈت من پھول کے ساتھ سفارتی نمائندہ بن کر ۱۸۶۵ء میں کابل و بخارا کا سفر کیا- ایران بھی گئے- ۱۸۸۳ء میں دوبارہ ایران گئے- فارسی زبان پر ان کو عبور تو تھا ہی- ایران کے سفر سے اس میں اور جلا ہوئی- اسی بنا پر انہوں نے بعد میں فارسی زبان کی کچھ درسی کتابیں مرتب کیں- ایک عرصے تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی' فارسی کے پروفیسر بھی رہ چکے تھے- ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے پچاس سالہ جشن تاجپوشی کے موقع پر شمس العلما کا خطاب دیا گیا- ۱۸۸۹ء میں ان کے دماغی توازن میں فرق آگیا- اس کے بعد وہ اور بیس سال زندہ رہے' لیکن دماغی خلل میں کوئی کمی نہیں آئی- اس لحاظ سے ان کی ادبی زندگی کا زمانہ ۱۸۶۴ء سے لے کر ۱۸۸۹ء تک صرف پچیس سال رہ جاتا ہے-

ادبی زندگی

آزاد کی ادبی زندگی کا آغاز اس زمانے سے ہوا' جب کہ وہ سابق صوبہ پنجاب میں سررشتہ تعلیم میں ملازم ہوئے' اور انہوں نے کرنل ہالرائڈ کی فرمائش پر اسکولوں کے لیے "اردو ریڈرین"' "قواعد اردو" اور "قصص ہند" کے نام سے کچھ تاریخی کہانیاں مرتب کیں- لیکن آزاد کی شہرت دوام کا باعث ان کی یہ ابتدائی کتابیں نہیں ہیں' بلکہ ان کی بعد کی مایہ ناز تصنیفات (۱) آب حیات (۲) نیرنگ خیال (۳) دربار اکبری (۴) سخندان فارس اور (۵) نگارستان فارس ہیں-

آب حیات:

"آب حیات" مولانا آزاد کا شاہ کار اور ان کی بہترین تصنیف ہے- یہ اصل میں شعرائے اردو کا تذکرہ ہے' جس میں مشہور شعرا کے بعض جگہ مختصر' بعض جگہ تفصیلی حالات درج ہیں- تنقید بھی ہے' مگر کہیں جانبدارانہ اور کہیں غیر جانبدارانہ- اس میں اردو زبان کی تاریخ اور ان تغیرات کا ذکر بھی ہے' جو اس زبان میں وقتاً" فوقتاً" پیدا ہوتے رہے- آزاد کی "آب حیات" سے پہلے بھی شعرائے اردو کے تذکرے لکھے جا چکے تھے' مگر وہ اکثر فارسی زبان میں تھے' اور ان میں معلومات اس قدر تشنہ تھیں کہ شعرا اور ان کے کلام پر مناسب روشنی نہیں پڑتی تھی- آزاد

نے "آب حیات" لکھ کر اس کمی کو پورا کیا۔ انہوں نے اس کتاب میں معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے، جس سے بعد کے لکھنے والوں کو بہت مدد ملی۔ یہ صحیح ہے کہ آزاد نے اس میں ایسا اسلوب اختیار کیا، جو اس قسم کی تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کے لیے قطعاً ناموزوں ہے، اور اس سے ان کی تحقیق و تنقید میں فسانے کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن آزاد اس پر مجبور تھے۔ ان کی افتاد طبع ہی کچھ ایسی تھی کہ اس اسلوب کے علاوہ اور کوئی اسلوب انہیں پسند نہ تھا۔ زمانہ کیا کہے گا، اس کی انہوں نے مطلق پروا نہ کی، اور نہ شاید ان میں اس کا شعور تھا۔ وہ اپنا کام کر گئے، اب لوگ جو مرضی رائے قائم کرتے رہیں۔ ہمارے خیال میں آزاد آزاد نہ ہوتے اگر یہ اسلوب نگارش اختیار نہ کرتے۔ یہی اسلوب خاص انہیں حیات جاوید بخشنے کا باعث ہوا۔ آزاد نے اس میں جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ جدید تحقیقات کے مطابق اکثر غلط ہیں۔ لوگوں نے اس پر سخت تنقید کی ہے لیکن ان کا طرز اور اسلوب اپنی جگہ پر قائم ہے۔ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے اور تاریخ ادب اردو پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لیے جہاں تک تحقیق و تنقید کا تعلق ہے، "آب حیات" کی حیثیت صرف تاریخی ہو کر رہ گئی ہے لیکن لوگ مولانا آزاد کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی "آب حیات" پر بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ کوئی اچھی رائے قائم کرتا ہے، کوئی بری۔

آزاد نے "آب حیات" میں اپنے استاد ذوق کا حال سب سے زیادہ پھیلا کر لکھا اور جوش عقیدت میں ان کی بے حد تعریف و توصیف کی ہے، جو ذوق سلیم کو ناگوار گزرتی ہے۔ ذوق کے مقابلے میں مرزا غالب کے کمالات فن سے بے پروائی برتی، بلکہ کہیں کہیں ان پر چوٹیں کیں۔ "آب حیات" کے پہلے ایڈیشن میں مومن کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ سب ان کے تذکرے کے نقائص ہیں، جن کی وجہ سے کتاب کی قدر و قیمت موضوع کے لحاظ سے گھٹ جاتی ہے۔ لیکن آزاد کا مرتبہ صرف اس سبب سے بہت بڑھا ہوا ہے کہ ان کا انداز بیان بڑا دلکش ہے۔ ان کی عبارت میں جاذبیت ہے، رعنائی ہے، اور شوخی ہے۔ پڑھنے میں الجھن نہیں ہوتی۔ "آب حیات عام طور پر دستیاب ہوتی ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

شاہ حاتم کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> دستور دنیا کا یہ ہے کہ بیٹا باپ کے نام سے اور شاگرد اپنے نامی استاد کے نشان سے روشناس ہوتا ہے۔ مگر اس حاتم کو نصیبے کا بھی حاتم کہنا چاہیے، جو اس نام سے نشان دیا جائے کہ وہ استاد سردار کا تھا۔ خوشا نصیب اس باپ کے جس کی نسل کمال سے وہ فرزند پیدا ہو کہ خانوادہ کمال کے لیے باعث فخر شمار کیا جائے۔ ان کا تخلص

حاتم اور شیخ ظہور الدین نام تھا۔ والد کا نام فتح الدین تھا۔ خود کہا کرتے تھے کہ ظہور (۱۱۱۱ء) میرے تولد کی تاریخ ہے۔ رہنے والے خاص شاہ جہاں آباد کے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ بزرگ ان کے کہاں سے آئے تھے۔ کسی تذکرہ سے ان کی علمیت تحصیلی کا حال معلوم نہیں ہوتا ہے۔ نہ کچھ ان کے کلام سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر اس قدر استعداد ضرور رکھتے تھے کہ ان کی انشا کی پردازی میں خلل نہیں آنے دیتی' اور یہ جوہر اس عہد کے شریف خاندانوں کے لیے عام تھا۔"

اوپر کی عبارت میں یہ افسانوی رنگ ہے۔ یہی رنگ ان کی پوری کتاب میں کہیں ذرا گہرا ہوگیا ہے' اور کہیں ہلکا۔

نیرنگ خیال:

"نیرنگ خیال" میں آزاد نے وہ نیرنگیاں دکھائی ہیں کہ یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اس میں رمزیہ و تمثیلی مضامین شامل ہیں۔ ان سے پہلے یہ اسلوب نگارش کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ رمزیہ اور تمثیلی انداز ہی میں انہوں نے مختلف قسم کے سنجیدہ مضامین مثلاً مذہب' اخلاق' تحقیق' نقد و تبصرہ لکھے ہیں۔ اس طرز میں ان مضامین کا نباہنا آسان نہیں۔

"نیرنگ خیال" کے عنوان سے ان رمزیہ اور تمثیلی مضامین کے لکھنے کے لیے کرنل ہالرائڈ نے' جو اس زمانے میں ڈائریکٹر تعلیمات تھے' آزاد کو آمادہ کیا تھا۔ انگریزی میں اس قسم کی کتابیں سوئفٹ اور جان بنین وغیرہ نے لکھی تھیں۔ کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو وہ سب نمونے دکھا کر شاید کچھ اشارے بتا دیے تھے۔ آزاد نے باوجود' انگریزی نہ جاننے کے ان اشاروں کی مدد سے انگریزی کتابوں سے استفادہ کیا' اور اردو ادب میں ایک نیا طرز رائج کیا لیکن ہمارے خیال میں آزاد کے اس قسم کے مضامین لکھنے میں انگریزی ادب کا اتنا اثر نہیں' جتنا کہ ان کی ذاتی اپج اور صلاحیت کا۔ ان کی جدت طراز طبیعت اور خیال آفرین دماغ اس قسم کے پیرایہ بیان کے لیے بہت موزوں تھا۔ "نیرنگ خیال" کی عبارت کا ایک مختصر نمونہ ملاحظہ ہو۔ ایک مضمون "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ" ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

> "حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں' جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی ملا کر کھلاتے ہیں۔ اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کو نصیحتیں کی ہیں' تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔ واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی' سلطان آسمانی کی بیٹی تھی۔ چونکہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا' اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انہوں

نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا' تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور مجبوریوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزت دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اور اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے' تو ان کی سنگت میں وہ بھی آ جاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا' اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزل دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا' اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔"

دربار اکبری:

آزاد کی تیسری کتاب "دربار اکبری" ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

"اس کتاب کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ مگر اس کے تاریخی حقائق و واقعات تاریخ کے طالب علم کے لیے مفید مطلب نہیں ہیں۔ افسانوی انداز کی وجہ سے کتاب غیر معتبر ہو گئی ہے لیکن اس میں ایک ادبی شان موجود ہے اور ہر جگہ دلچسپی قائم رہتی ہے۔ اس میں اکبر بادشاہ کے ذاتی' درباری' اور سلطنت کے خاص خاص ارکان' وزرا' علما اور امرا کے حالات بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں انہوں نے ملا عبدالقادر بدایونی کی مشہور کتاب "منتخب التواریخ" سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ لیکن اس استفادہ کے ساتھ انہوں نے ملا بدایونی پر جگہ جگہ اپنے انداز خاص میں اعتراضات بھی کیئے ہیں۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"جب اکبر کو یقین ہو گیا کہ خان زمان کا بھی کام تمام ہوا' تو گھوڑے سے اتر کر خاک پر پیشانی کو رکھ دیا' اور سجدہ شکر بجا لایا--- خان زمان! بل بے تری ہیبت' اور واہ رے تیرا دبدبہ! مرد ہو تو ایسا ہو! آزاد کو تیرے مرنے کا افسوس نہیں۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔ تیری لاش اس سے بھی سوا خراب و خوار ہوتی' مگر آقا کی جان نثاری میں ہوتی' تو آب زر سے لکھی جاتی۔ خدا حاسدوں کا منہ کالا کرے' جنہوں نے دونوں بھائیوں کی سنہری سرخروئی کو روسیاہی کر دیا۔ آزاد بھی ایسے ہی لیاقت بد اصالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے۔ پھر بھی شکر ہے کہ روسیاہی سے

محفوظ رکھا۔ یہ نااہل خود کچھ نہیں کر سکتے اوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ اور مورچے باندھتے ہیں' موقع پاتے ہیں' تو افسروں سے لڑتے ہیں۔ خیر آزاد بھی پروا نہیں کرتا۔ اپنے تیئں خدا کے اور انہیں زمانے کے حوالے کر دیتا ہے۔"

سخن دان فارس:

آزاد کی کتاب "سخن دان فارس" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں فارسی زبان کی اصل اور اس کی ساخت پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے وہ لیکچرز شامل ہیں جو انہوں نے کالج کے طلبہ کے سامنے دیے تھے۔ ان میں سے پہلا لیکچر ۹ فروری' ۱۸۷۲ء کا ہے۔ لیکچروں کا یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ دوسرے حصے میں فارسی زبان کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں فارسی اور سنسکرت زبانوں کو متحد الاصل بات کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایران کے رسوم و رواج کا مقابلہ برصغیر کے رسوم و رواج سے کیا گیا۔ اگرچہ آزاد کی یہ کتاب علم لسانیات پر ہے' لیکن ان کی شوخی طبع اور رنگینی تحریر اس میں بھی بخوبی پائی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

> "میرے دوستو! یہ انشا پرداز منہ زور گھوڑوں کے شہسوار تھے کہ بے مطلبی کے میدانوں میں بے ارادہ کسی منزل کے خواہ مخواہ گھوڑے مارے چلے جاتے تھے اور حق پوچھو تو یہ بھی کمال ہے۔ زرا سی بات کو بلکہ بے بنیاد معاملے کو مثلاً بادشاہ کی مدح کہ وہ بہت اچھا ہے' یا باغ کا حال کہ خوب شاداب ہے' یا بازاری دکانداروں کی تعریف کو اس قدر لمبا اور چوڑا بغیر دودھ کے ابال اٹھانا ہے' اور یہ انہی کا کام تھا مگر بے حاصل۔
>
> ایک تیز قلم مصور نے نظر کے زور سے اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتی پر فورٹ ولیم کی تصویر کھینچی اوراس میں کوئی جزا اس کی عمارت کا باقی نہ چھوڑا۔ یا کسی نازک دستکار نے چنے کی دال کا جنگی جہاز تراشا' اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اصل جہاز کا دیکھو تو موجود پاؤ۔ بے شک دونوں نے بڑا کمال کیا۔ مگر اس قلعہ کے ایوان میں کونسا بادشاہ ملک رانی کرے' اور جہاز میں کونسا لشکر سمندر پار اترے۔"

نگارستان فارس:

مولانا آزاد کی اور ایک کتاب "نگارستان فارس" ہے۔ اس میں انہوں نے ایران اور برصغیر کے ۳۶ فارسی شعرا کے مختصر حالات بیان کئے ہیں۔ شعرا کے کلام کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ رام بابو سیکسینہ لکھتے ہیں: "اس کی زبان بہت صاف سادہ اور مثل "آب حیات کے پرلطف نہیں ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ یہ ان کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہو۔"

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ اردو نثر میں آزاد کی اور کتابیں ہیں' جو ان کی وفات کے بعد ان کے ورثا نے قلمی مسودوں سے مرتب کر کے شائع کی ہیں اور جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ تذکرۂ علما' اس میں چالیس مشاہیر کے حالات درج ہیں۔

۲۔ سیاک و نماک اس میں آزاد کی وہ تحریریں شامل ہیں' جو انہوں نے حالت جنون میں قلم بند کی تھیں۔

۳۔ کائنات عرب اس میں عرب کا جغرافیہ اور وہاں کا حال لکھا گیا ہے۔

۴۔ لغت آزاد: اس میں اردو الفاظ کے فارسی مترادف دیئے گئے ہیں۔

۵۔ ڈرامائے اکبر: اس میں جہانگیر اور نور جہاں کا قصہ درج ہے۔

۶۔ سیر ایران: آزاد نے دو مرتبہ ایران کا سفر کیا تھا۔ یہ کتاب ان ہی سفروں کی یادگار ہے۔

۷۔ فلسفہ الہیات: یہ بھی آزاد کی حالت جنوں کی یادگار ہے۔

۸۔ جانورستان: اس میں حیوانات کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

۹۔ مکتوبات آزاد: یہ آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

تبصرہ

آزاد نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے' لیکن سب میں ان کا رنگ کم و بیش ایک ہی ہے۔ وہ عبارت میں دلکشی پیدا کرنے کے لیے ہر جگہ صنائع بدائع اور تشبیہات و استعارات کا استعمال بہت کرتے ہیں۔ اس لیے نہ تو ان کی اہمیت ایک مورخ کی حیثیت سے ہونی چاہئے' اور نہ ایک ماہر علم لسانیات کی حیثیت سے' اور نہ کسی دوسرے موضوع کے اہل قلم ہونے کی حیثیت سے آزاد ایک بہت بڑے صاحب طرز ادیب ہیں۔ ان کی ہر تحریر میں ادبی شان بہت نمایاں طور سے نظر آتی ہے۔ دوسری ساری باتیں ان کی ادبیت کے دبدبے اور شان و شوکت کے نیچے دب

کر رہ جاتی ہیں۔ کوئی ان کی تصنیفات میں تاریخی حقائق یا لسانی مسائل ڈھونڈنا چاہے' اور کسی موضوع کے بارے میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ اخذ کرنا چاہے' تو بہت مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آزاد کو محراب ادب کے علاوہ اور کہیں ڈھونڈنا عبث ہے۔

آزاد کی تحریریں زمانے کے تقاضے کے مطابق سادہ اور صاف تو ہیں' اور ان میں قافیہ کی پابندی بھی نہیں ہے لیکن سب سے نرالی ہیں۔ مولانا حامد حسن قادری کی رائے میں آزاد کی نثر پر شیخ سعدی کی گلستان کا اثر زیادہ ہے۔ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ گلستان کی فارسی باوجود حد درجہ سادہ اور سلیس ہونے کے کوئی اس کی تقلید میں کامیاب نہ ہوسکا۔ سعدی کی عبارت سہل ممتنع ہے۔ آزاد کا بھی یہی حال ہے۔ وہ اپنے طرز میں منفرد مقام رکھتے ہیں کہ ان سے پہلے کسی نے ایسی اردو لکھی تھی' نہ ان کے بعد کوئی انہی جیسی عبارت لکھ سکا۔

یہ تعجب ہے کہ سرسید کے انقلابی دور میں ہوتے ہوئے بھی' آزاد پر اس دور کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ جہاں دوسرے اہل قلم سرسید کے قومی جذبات سے سرشار ہو کر ان ہی کے گن الاپتے ہیں اور ان ہی کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں' وہاں آزاد بالکل ایک جداگانہ شخصیت لے کر ابھرتے ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ

حالات زندگی:

مولوی ذکاء اللہ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ثنا اللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بارہ سال کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں اس کالج میں مولانا آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد بھی تعلیم پا رہے تھے۔ ان سے مراسم پیدا کئے۔ ان کو ریاضی سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے کالج میں اعلیٰ صلاحیت اور قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ ہر کلاس میں اول آتے تھے اور وظیفے کے مستحق قرار پاتے تھے۔ دو مرتبہ تمغے بھی حاصل کئے۔ فارغ التحصیل ہو کر دہلی کالج ہی میں ریاضی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آگرہ کالج چلے گئے' جہاں نیک نامی کے ساتھ سات سال تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اردو و فارسی کے استاد تھے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ اس عہدہ پر وہ گیارہ سال تک رہے۔ ۱۸۶۶ء میں نارمل اسکول' دہلی کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ پھر تین سال کے بعد میور سنٹرل کالج' الہ آباد میں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ ۱۵ سال تک اس کالج میں اپنے فرائض انجام دے کر ۱۸۸۵ء میں ریٹائر ہوئے۔(۱)

ان کا انتقال ۱۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو دہلی میں ہوا۔

ادبی زندگی:

مولوی ذکاء اللہ کو چونکہ ریاضی سے خاص دلچسپی تھی' اس لیے انہوں نے اس موضوع پر کافی کتابیں لکھیں' جو اسکولوں کے نصاب میں داخل کی گئیں اور جن کے صلے میں گورنمنٹ کی طرف سے انہیں پندرہ سو روپے کا انعام بھی ملا اور شمس العلما اور خان بہادر کے خطابات دیے گئے۔ انہوں نے ریاضیات تاریخ و جغرافیہ' طبیعات و ہیت' سیاست' اخلاق اور علم و ادب پر کل ۱۴۳ کتابیں لکھیں۔ ان میں سے بعض تو ایسی ضخیم ہیں کہ بقول ڈپٹی نذیر احمد: "ان کے حجم کو دیکھ کر

حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ایسی بڑی کتاب لکھنے کے لیے کیسے فرصت پاتا تھا۔ (۴)

مولوی ذکا اللہ کی تصنیف "تاریخ ہندوستان" ۱۸ حصوں پر مشتمل ہے اور جس کی کل ضخامت ۷۱۴۹ صفحات ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کتابیں سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ، "کرزن نامہ" سوانح عمری مولوی سمیع اللہ، "تاریخ عہد انگلشیہ" "آئین قیصری" ایسے موضوعات پر ہیں، جن پر ان سے پہلے کسی نے نہیں لکھا تھا۔

مستقل تصانیف کے علاوہ مولوی ذکاء اللہ مختلف رسالوں مثلاً "تہذیب الاخلاق" انسٹی ٹیوٹ گزٹ "علی گڑھ" "مخزن، لاہور، "زمانہ" کانپور، "کانپور، "رسالہ حسن" حیدر آباد وغیرہ میں برابر مضامین لکھتے رہتے تھے۔

مولوی ذکاء اللہ نے اتنا لکھا کہ ایک فرد سے کیا ایک انجمن سے بھی اتنا کام نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان کی یہ بدقسمتی ہے کہ ان کی ان تصانیف کو قبولیت عام حاصل نہ ہو سکی، اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ گم نام ہو گئیں۔ لے دے کے چند مضامین ہوں گے، جو کبھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ کی نثر کے دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں، تاکہ ان کے انداز تحریر کا اندازہ ہو سکے :

تاریخ ہندوستان :

"سلطان خرم نے کوہستان کی تنگناؤں میں تھانے بٹھا دیئے تھے کہ جہاں رانا کی خبر پائیں، وہاں فوراً اس کے پکڑنے کو لشکر روانہ ہو۔ محمد شاہ کو کلنگ کے بتخانوں کی تخریب اور راجپوتوں کی تادیب کے لیے روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی تاراج شروع کی اور بہت آدمیوں کو مارا اور قید کیا۔ رائے سندر داس سردھی کی طرف گیا۔ وہاں رانا کے اہل و عیال کا نشان اس کو بتایا تھا۔ مگر اس کے پہنچنے سے قبل چرتان رانا اہل و عیال کو دوسری جگہ لے گیا تھا۔ اس سرزمین میں رائے سندر داس نے قتل و غارت اور اسیر کرنے اور منازل ہنود کے خراب کرنے میں کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی۔ بت خانوں پر راجپوت بڑے دلیرانہ لڑے اور آخر کو جوہر کر کے مع اہل و عیال مرے۔ اس رائے نے بادشاہ کے حقوق کا پاس کیا اور اپنے آئین و کیش کا کچھ خیال نہیں کیا۔ بتوں کو جلایا اور بت خانوں کو ڈھایا۔

مضامین ذکاء اللہ :

"تو اپنے نفس کو وہ ادب دکھا کہ بے ادب اسے دیکھ کر باادب ہو جائیں۔ جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے، وہ بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے، جیسے آہوئے وحشی،

جو گھر میں دانہ کھاتا ہے' وہ اور آہوں کو پکڑ لاتا ہے- جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے' اس کا فکر استاد ہو جاتا ہے- بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے- تو نالہ و گل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر کہ سب کو مطبوع ہو' نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں- بے خود جس کو مزاح کہتے ہیں' وہ خرد مندوں کے نزدیک نبرد سلاح ہے- اگر تمہاری داڑھی کوؤں کے پیروں کی سی سیاہ ہو' تو بڈھوں کی بگلا کی سفید داڑھی کی ہنسی نہ آڑاؤ' اگر تم سخن عارض اور گل عذار ہو تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر اسے نہ چڑاؤ- کیونکہ کوئی بدصورت دنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا- ایک چینی جس کا رنگ سرخ و سفید تھا' ایک زنگی پر ہنسا' تو زنگی نے جواب دیا کہ میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لیے زیب ہے' اور تیرا ایک نکتہ میرے لیے عیب ہے-"

اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ذکاء اللہ کی اردو نثر کا طرز کیسا ہے- زبان صاف اور سلیس ہے' اور زمانے کے جدید تقاضوں کے مطابق ہے' لیکن بقول مولانا حامد حسن قادری: "طبیعت میں اختراع و ایجاد کا مادہ بہت کم تھا- اس لیے ان کی تحریر میں بجز صفائی و روانی اور تفصیل و تجزیہ کے زبان و طرز بیان کا کوئی لطف نہیں' بلکہ ان کی زبان میں محاورہ دہلی کا بھی مزہ نہیں- ان کو غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی عادت تھی- اس لئے علمی' تاریخی' سیاسی' اخلاقی ہر قسم کے مضامین کو پوری وضاحت سے ساتھ لکھا ہے- لیکن صورت و الم' غصہ و نفرت' شوخی و ظرافت کے کسی موقع پر ان کے الفاظ سے ان کا جوش طبیعت بہت کم مترشح ہوتا ہے-"(۳) ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ کر رہے ہیں اور لغت سے تلاش کر کے الفاظ لکھ رہے ہیں- حالانکہ وہ تحریریں اکثر ان کی طبع زاد ہی ہوتی تھیں-

مولوی ذکاء اللہ سرسید کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور سرسید کے مشن سے کافی متاثر تھے- ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ایک مضمون میں ان کو "سرسید احمد خان کے گویا پٹھو تھے" کہہ کر طعنہ دیا ہے لیکن یہ طعنہ شاید ان کے سرسید سے ہم خیال ہونے تک محدود ہے- جہاں تک طرز تحریر کا تعلق ہے' اس میں وہ "پٹھو" نہیں' بلکہ ایک قبیلے کے تھے' ایک قبیلے کے ہونے کی وجہ سے جو کچھ مناسبت ان کی آپس میں ہونی چاہئے' وہ ہے- مولوی ذکاء اللہ کی اردو نثر سرسید کی اردو نثر سے بہت قریب ہے-

سید علی بلگرامی

حالات زندگی : سید علی بلگرامی ۱۰ نومبر ۱۸۵۱ء کو بلگرام کے ایک اعلیٰ اور شریف خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد شہر واسطہ سے' جو بغداد اور بصرہ کے درمیان میں واقع ہے' برصغیر آئے اور اودھ میں سکونت اختیار کی۔ یہاں ان کے خاندان کے کئی بزرگ ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے جد امجد مولوی سید کرامت حسین خان بہادر وائسرے کے دربار میں شاہ اودھ کی طرف سے قائم مقام تھے۔ ان کے چچا سید اعظم الدین خان لارڈ ولیم بنٹینگ کے مصاحب اور اورینٹل انٹرپریٹر تھے۔ بعد میں سندھ میں پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے۔ انکے والد سید زین الدین خان بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری اور ڈپٹی مجسٹریٹی کے عہدوں پر فائز رہے۔ (۴)

سید علی بلگرامی اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ آٹھ سال کی عمر سے چودہ سال کے سن تک عربی کی تعلیم حاصل کی۔ پندرہ سال کے ہوئے' تو انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ یہ سنہ ۱۸۶۶ء کا ذکر ہے۔ دو سال کے بعد کنگ کالج' لکھنؤ میں داخل ہوئے' اور ۱۸۷۳ء میں پٹنہ کالج سے بی اے پاس کیا۔ پھر تین سال تک قانون کا مطالعہ کیا۔ چوتھے سال نیو سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ کر کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد طامسن اسکالر شپ پا کر رودکی انجینئرنگ کالج میں داخل ہوئے۔ کوئی چھ مہینے بعد حیدر آباد دکن کے وزیر نواب مختار الملک سرسالار جنگ بہادر اول نے انہیں ان کی قابلیت اور صلاحیت کو دیکھ کر ریاست میں بلا لیا اور اپنے پرنسپل اسٹاف میں داخل کیا۔ نواب سرسالار جنگ لندن جانے لگے تو ان کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ وہاں لے جا کر انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے شاہی مدرسہ معدنیات میں داخل کر دیا۔ اس میں انہوں نے اپنی فطری ذہانت اور صلاحیت کی بدولت تین سال کے بجائے دو سال میں ایسوسی ایٹ کا امتحان پاس کیا' اور مرچی سن تمغہ حاصل کیا۔ انگلینڈ سے واپسی کے وقت انہوں نے دوسرے یورپی ممالک مثلاً فرانس' اسپین اور جرمنی کا بھی سفر کیا۔ حیدر آباد واپس ہوئے تو انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر ہوئے۔ بعد میں وہ سیکرٹری تعمیرات و ریلوے و معدنیات ہوگئے' اس عہدے پر ریٹائر ہونے تک برقرار رہے۔ ۱۸۹۱ء میں انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۳ء میں انہیں حکومت کی طرف سے شمس العلما کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان میں جا کر مقیم ہوگئے۔ وہاں ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے ریڈر مقرر ہوئے۔ اسی سال انڈیا آفس کے کتب خانے میں عربی' فارسی کے قلمی نسخوں کی فہرست کے مرتب کرنے پر مامور ہوئے۔(۵)

سید علی بلگرامی ۳ مئی ۱۹۱۱ء کو ہر دوئی میں یکایک حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب فوت ہوئے۔

ادبی زندگی: سید علی بلگرامی نے باوجود اس قدر قابل ہونے کے اردو ادب کی کوئی زیادہ نمایاں خدمات انجام نہیں دیں۔ بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق' ان کے علم کے مقابلے میں ان کا عمل بہت ہی کم تھا۔ جو کچھ بھی۔انہوں نے کام کیا وہ صرف ترجمے کی شکل میں ہے۔ ان کی کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ میڈیکل جورس پروڈنس' یہ ڈاکٹر ہیر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس پر انہیں گورنمنٹ کی طرف سے چھ ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

۲۔ رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ: اس میں انہوں نے اس امر کا کھوج لگانے کی کوشش کی کہ فارسی کی یہ مشہور کتاب اصل میں کس نے اور کہاں لکھی' پھر کہاں کہاں پہنچی اور اس کے کس کس نے ترجمے کئے۔

۳۔ غار ہائے الورا کا ایک گائڈ۔

۴۔ حیدر آباد کی اقتصادی و طبقات ارضی معدنیات۔

۵۔ تمدن عرب۔ یہ ڈاکٹر گلستاولی بان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔

۶۔ تمدن ہند۔ یہ موسیولیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

سید علی بلگرامی کی مندرجہ بالا کتابوں میں سے صرف آخرالذکر دو کتابیں شائع ہوئیں۔ "تمدن عرب" جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے' فرانسیسی مورخ ڈاکٹر گستاولی بان کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ لی بان کی وہ کتاب اپنے زمانے میں بہترین' مکمل و مستند کتاب سمجھی جاتی تھی۔ سید علی بلگرامی نے اس کا بڑا عمدہ ترجمہ کیا۔ وہ کتاب ۱۸۹۸ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> "ملک کا انتظام چار صیغوں میں منقسم تھا' جو فی الواقع ہمارے موجودہ وزارتوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اول صیغہ حرب' دوم صیغہ مال گزاری' کا کام محصولات کا قرار دینا تھا' سوم صیغہ شخصی' جو محصولات کے وصول کرنے والوں کو مقرر کیا کرتا تھا۔ چہارم صیغہ انتظامی' جس کا کام مداخل و مخارج کی نگرانی کرنا تھا۔ خلیفہ کے کل احکام لکھے جاتے تھے' اور اس غرض سے دفتر میں رکھے جاتے تھے کہ خلفائے مابعد ان کی طرف با آسانی رجوع کر سکیں۔ اس ساری کار کی کنجی ایک وزیر کے ہاتھ میں رہتی' جو بطور مدارالمہام ہوا کرتا تھا' اور اکثر خلفا کل امورات ملکی کو اس کے اختیار میں چھوڑ دیا کرتے تھے۔

شہروں کی کوتوالی کا انتظام ویسی ہی عمدگی کے ساتھ تھا' جیسا ڈاک اور مداخل و مخارج کا۔ تاجروں کی مجلس قائم کر دی گئی تھیں' جس کا فرض یہ تھا کہ معاملات تجارتی کی جانچ اور فریب و دغا بازی کا انتخاب کریں۔"

"تمدن ہند" بھی ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"ہند کے تعلقات یونانیوں کے ساتھ بلخ کی یونانی حکومتوں کے ذریعہ سے مدت تک باقی رہے۔ جیساکہ مگستھینز کی سفارت سے ثابت ہوتا ہے۔ اس یونانی سفیر کا سلوکس نیکو ٹارشام کے حاکم نے تقریباً تین سو سال قبل پاٹلی پتر کو بھیجا تھا' اور یہ پہلا موقع تھا جب کہ یورپیوں نے ہند کے اندرونی حصے میں نفوذ کیا۔ اس زمانے کی تاریخ کے لیے صرف ہمارے پاس اسی یونانی سفیر کے بیانات رہ گئے ہیں۔ ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مگستھینز کی سفارت سے سیلوکس کی غرض یہ تھی کہ عربوں نے جو تجارت یورپ سے قائم کی ہے' اس کا راستہ بدل کر پلموره اور انطاکیہ سے ہو کر مصر کو کر دیا جائے۔ یہ وہ تجارت تھی' جس نے مصر کے خاندان بطلیموس کو دولت مند بنا دیا تھا' اور آگے چل کر قاہرہ کے خلفائے اسلام نے بھی اسی تجارت کی بدولت بہت کچھ مال و دولت حاصل کیا۔ بلخ کی یونانی حکومت کے تعلقات ہندوستان کے ساتھ مدت تک قائم رہے' جیساکہ ہمیں شمال و مشرقی ہند کی عمارات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔"

ترجمہ کی زبان پر کوئی رائے قائم کرنا بیکار ہے۔ اس لئے کہ یہ تحریر طبع زاد نہ ہونے کے سبب اس میں کسی کا اثر ہوسکتا ہے' اور نہ اس سے دوسروں پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ ترجمہ ایک خاص ضرورت کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ جب کسی قوم کی زبان میں علوم و فنون کی طبع زاد بنیادی کتابوں کا فقدان ہو' تو لامحالہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے ایسی کتابیں ترجمہ کرنی پڑتی ہیں۔ اس میں زبان و بیان کی خوبی پیدا نہیں ہوسکتی۔ ترجمہ کرنے والے میں اگر صلاحیت موجود ہے' اور اسے اپنی زبان پر قدرت تامہ حاصل ہو' تو صرف اتنا ہوسکتا ہے کہ ترجمہ اصل سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اور ترجمہ کا کمال بھی یہی ہے۔ سید علی بلگرامی اس لحاظ سے اپنے ترجمے میں کافی کامیاب ہیں۔

حواشی

۱۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۲۴۶ - ۴۴۷۔
۲۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۴۴۸۔
۳۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۵۴۴ - ۵۲۵
۴۔ چند ہم عصر' ۷۱ - ۷۳۔
۵۔ چند ہم عصر' صفحہ ۷۵ - ۷۶۔

ڈپٹی نذیر احمد

حالات زندگی:

مولوی نذیر احمد جو ادبی دنیا میں ڈپٹی نذیر احمد کے نام سے مشہور ہیں۔ ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو بجنور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ ابتدائی تعلیم کچھ تو اپنے والد سے اور کچھ مکتب میں حاصل کی۔ پھر مولوی نصراللہ خان، ڈپٹی کلکٹر، بجنور سے پانچ سال تک عربی نحو، منطق اور فلسفہ پڑھا۔ جب ان کی عمر چودہ برس کی ہوئی، تو والد کے ساتھ دہلی آئے اور مدرسہ مسجد اورنگ آبادی میں بھرتی ہوئے۔ یہاں ان کو کافی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ لیکن طلب علم کے شوق میں سب کچھ بلاچون و چرا برداشت کیا۔

کچھ دن کے بعد یکایک ان کی قسمت کھل گئی، اور بہتر ماحول میں اعلیٰ تعلیم پانے کا موقع مل گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک دن وہ دہلی کالج کی طرف نکل گئے۔ دیکھا تو وہاں لڑکوں کا بڑا ہجوم تھا۔ وہ بھی بھیڑ بھاڑ میں گھس گئے۔ معلوم ہوا، لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدر الدین آئے ہوئے ہیں۔ ان کو شوق ہوا کہ اندر جا کر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ قد چھوٹا تھا۔ اس لیے آسانی تھی۔ لوگوں کی ٹانگوں کے بیچ میں سے ہوتے ہوئے کمرہ کے دروازے تک پہنچ گئے۔ مفتی صدر الدین ایک ایک کر کے لڑکوں کا امتحان لے رہے تھے۔ کالج کے پرنسپل انگریز تھے۔ وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ باہر آنے کے لیے اٹھے، تو چپراسیوں نے رستہ صاف کرانا شروع کیا۔ اس افراتفری میں ان کا پاؤں پھسل گیا اور وہ فرش پر گر پڑے۔ پرنسپل صاحب بھاگتے ہوئے آئے، اور ان کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔ پوچھا تم کیا پڑھتے ہو۔ کہا "معلقات"۔ پرنسپل صاحب کو بڑا تعجب ہوا کہ اتنا چھوٹا لڑکا اور کہتا ہے کہ معلقات پڑھتا ہے(۶) چنانچہ وہ ان کو مفتی صدر الدین کے پاس لے گئے اور کہا دیکھئے تو سہی یہ کیا بولتا ہے۔ انہوں نے ان کو آزمایا۔ ان کی ذہانت اور لیاقت سے بڑے متاثر ہوئے۔ پرنسپل صاحب سے سفارش کی کہ کالج میں داخل کر لیا جائے۔ (۷)

ڈپٹی نذیر احمد کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ کسی بہانے سے ان کو دہلی کالج میں داخل ہو کر

اعلیٰ تعلیم پانے کا موقع ملا۔ ورنہ وہ کیا ہوتے۔ اس کا جواب وہ خود دیتے ہیں: "اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا، تو میں بتاؤں کیا ہوتا! مولوی ہوتا--- تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔" (۸)

ڈپٹی نذیر احمد آٹھ سال تک تعلیم پا کر ۱۹۵۴ء میں اس کالج سے نکلے اور ملازمت کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ کنجاہ ضلع گجرات، صوبہ پنجاب میں چالیس روپیہ ماہوار پر مدرس ہوئے۔ دو سال کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور آگئے لیکن قسمت نے وہاں یاوری نہ کی، تو استعفا دے کر دہلی چلے گئے۔ اس اثنا میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوگیا۔ وہ بھی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ حسن اتفاق سے انہوں نے ایک انگریز خاتون کی جان بچائی تھی، جس کے صلے میں ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ان کو ڈپٹی انسپکٹر مدارس، الہ آباد مقرر کیا گیا۔ انہوں نے کالج میں والد کی اجازت نہ ملنے کی بنا پر انگریزی نہیں پڑھی تھی۔ الہ آباد جا کر انگریزی سیکھنی شروع کی اور تھوڑے ہی عرصے میں کافی دستگاہ حاصل کر لی۔ ۱۸۶۳ء میں ان کو ڈپٹی کلکٹر مقرر کر دیا گیا۔ اسی بنا پر ان کا نام ڈپٹی نذیر احمد پڑ گیا۔

۱۸۷۷ء میں نواب سرسالار جنگ نے ان کو حیدر آباد دکن بلا لیا، جہاں وہ نواب محسن الملک کے پاس ٹھہرے۔ ۸۵۰ روپیہ تنخواہ پر گئے تھے۔ ترقی کرتے کرتے بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوگئے اور سترہ سو روپیہ تنخواہ ہوگئی۔ انہوں نے حیدر آباد کے قیام کے زمانے ہی میں قرآن مجید حفظ کیا ۱۸۸۳ء میں سیاسی مصلحت کی بنا پر وہ پنشن لے کر دہلی چلے آئے، اور تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہوگئے۔ ۱۸۹۷ء میں ان کو ادبی خدمات کے صلے میں "شمس العلما کا خطاب ملا۔ اس کے بعد ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونی ورسٹی نے ان کو ایل ایل ڈی کی ڈگری پیش کی۔ پھر ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی او ایل کی اعزازی ڈگری سے نوازا (۹)

ان کا انتقال ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو بروز جمعہ دہلی میں ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیف و تالیف کا آغاز خود ان کی زبانی یوں ہوتا ہے:

"میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں۔ ڈھونڈا، تلاش کیا، کہیں پتا نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لیے "مراۃ العروس" چھوٹی کے لیے "منتخب الحکایات" بشیر کے لیے "چند پند" یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں، تب پڑھانی شروع کیں۔ بلکہ ہر ایک کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دئے مگر وہ

بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی' وہ آدھے صفحے لیے' اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی' وہ ورق کے لیے مستعجل تھا۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان تیار ہوا۔"

ڈپٹی نذیر احمد نے مختلف موضوعات مثلاً ناول' مذہب' اخلاق' منطق' علم ہیئت' قواعد وغیرہ پر قلم اٹھایا اور بے تحاشا لکھتے گئے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست بڑی طویل ہے۔ ہم ذیل میں ہر موضوع کی کتابوں پر الگ الگ مختصر طور پر بحث کرتے ہیں۔

ناول

۱۔ **مراۃ العروس:** یہ نذیر احمد کا پہلا مکمل ناول ہے۔ اس میں دہلی کے شریف خاندانوں کی معاشرت کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ یہ زنانہ ناول ہے (اور نذیر احمد کے تمام ناول ہی زنانہ ہیں)۔ یہ ناول اس قدر مقبول ہوا کہ بقول نذیر احمد: "دو سوا دو برس میں اس کی کوئی آٹھ نو' بلکہ دس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں' اور ہر طرف سے طلب اور ہر طرف سے مانگ چلی آ رہی ہے۔" اس کی پہلی اشاعت ۱۸۶۹ء میں ہوئی تھی۔ اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"لڑکوں اور لڑکیوں کو ضرور سوچنا چاہئے کہ ماں باپ سے الگ ہوئے پیچھے ان کی زندگی کیونکر گزرے گی۔ دنیا میں بہت بھاری بوجھ مردوں کے سر پر ہے۔ دنیا میں کھانا کپڑا اور روزمرہ کے خرچ کی سب چیزیں روپیہ سے حاصل ہوتی ہیں اور یہ سب کھڑاک روپیہ کا ہے۔ عورتوں کو بڑی خوشی کی بات ہے کہ اکثر کمانے اور روپیہ پیدا کرنے کی محنت سے محفوظ رہتی ہیں۔ دیکھو مرد کیسی کیسی سخت محنت کرتے ہیں۔ کوئی بھاری بوجھ سر پر اٹھاتا ہے' کوئی لکڑی ڈھوتا ہے۔ سنار' لوہار' ٹھٹیرا' کسیرا' کندلہ گر' زرکوب' دبکیہ' تارکش' ملمع ساز' جڑیا' سلمہ ستارے والا' بنیہ بدرساز' مینا ساز' قلعی گر' صیقل گر' سادہ کار' آئینہ ساز' زردوز' منہیار' نعلبند' نگینہ ساز' کامدانی والا' سان گر' نیاریا' ڈھلیا' بڑھئی' خرادی' ناریل والا' کنگھی ساز' بنس پھوڑ' کاغذی' جلاہا' رفوگر' رنگریز' چھیپی' درزی' دستار بند' علاقہ بند' نیچہ بند' موچی' مہرکن' سنگتراش' حکاک' معمار' دیگر' کمہار' حلوائی' تیلی' تنبولی' رنگساز' گندھی وغیرہ جتنے پیشے ہیں' سب کے کاموں میں برابر درجے کی تکلیف ہے' اور یہ تمام تکلیف روپیہ کمانے کے واسطے مرد سہتے اور اٹھاتے ہیں' لیکن اس بات سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ عورتوں سے سوائے کھانے اور سو رہنے کے کوئی کام دنیا کا متعلق نہیں ہے' بلکہ خانہ داری کے تمام کام عورتیں کرتی ہیں۔ مرد اپنی کمائی عورتوں کے آگے لا کر رکھ دیتے ہیں اور عورتیں اپنی عقل سے اس کو اپنے بندوبست اور سلیقے کے ساتھ اٹھاتی

ہیں کہ آرام کے سوائے عزت اور نام پر حرف نہیں آنے پاتا۔"

۲۔ بنات النعش: یہ گویا بقول مصنف: "مراۃ العروس" کا ہی دوسرا حصہ ہے۔ وہی بولی ہے' وہی طرز ہے۔ "مراۃ العروس" سے تعلیم اخلاق و خانہ داری مقصود تھی۔ اس میں وہ بھی ہے' اور ضمناً" اور معلومات علمی بھی۔ نذیر احمد نے بنات النعش میں اخلاق اور امور خانہ داری کی باتوں کے علاوہ حساب' تاریخ' جغرافیہ' علم ہیئت' جسمانی ریاضت' حفظان صحت وغیرہ کے بارے میں بھی مفید معلومات فراہم کر دیں۔ یہ ناول ۱۸۷۳ء میں طبع اور شائع ہوا۔ اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

> "جب اس کے بیاہ کی تاریخ قریب پہنچی تو ہر چند گھر والوں نے اس کو مکتب جانے سے روکا' مگر اس کو مکتب سے کچھ ایسا انس ہو گیا تھا کہ ایک لمحہ مکتب سے جدا رہنا اس کو شاق تھا۔ حسب دستور مکتب میں آتی رہی' یہاں تک مائیوں بیٹھنے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔ تب ناچار سلطانہ بیگم خود استانی اصغری خانم کے پاس گئیں۔ سلام و دعا اور مزاج پرسی کے بعد سلطانہ بیگم بولیں۔ استانی جی' تم میں ایسا جی پڑا تھا کہ ہر روز کہتی تھی آج جاؤں کل جاؤں' لیکن تمہاری اس لونڈی کے بیاہ برات کی فکر میں ایک دم کی چھٹی نہیں ملتی۔ سینے میں نہیں' پروتی میں نہیں' مگر کام ہے کہ سمٹنے میں ہی نہیں آتا۔ آخر آج میں زبردستی نکل کھڑی ہوئی۔ سو کام کا حرج کیا' اور میں نے کہا کہ چلوں ذرا کھڑے کھڑے استانی جی سے تو مل آوں۔"

اس میں مکالمے کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

حسن آرا: خیر اب وہ زمین کا گول ہونا ثابت کیجئے۔ کیا آپ اس بات کو ٹالنا چاہتی ہیں؟

محمودہ: ہاں تو' یہ انگنائی پچاس گز لمبی ہے۔ اس سرے سے اس سرے تک پینتیس یعنی پانچ کم دو بیسی پھیرے کرو تو ایک میل ہو' اور دو میل کا ایک کوس ہوتا ہے۔

حسن آرا: افوہ اتنا بڑا میل' اور اتنا بڑا کوس ہوتا ہے؟

محمودہ: اب قطب صاحب کی لاٹ کو فرمایئے کہ کتنے کوس لمبی ہے۔

حسن آرا: میں تو جانتی ہوں کہ اس حساب سے پوری میل بھی لمبی نہ ہوگی۔

محمودہ: بیشک میل کیا' میل کا دسواں حصہ بھی نہیں' اور زمین بتاؤں' میلوں کے حساب کتنی بڑی ہے۔ چوبیس ہزار میل' اس کا دور ہے۔ مردوں میں بارہ کوس کی منزل ہے۔ یعنی مرد لوگ جو سفر کرتے ہیں' تو بارہ کوس روز چلے جاتے ہیں' اور واقع میں آرام کے ساتھ سفر کیا جائے تو بارہ کوس دن بھر چلنے کو بہت ہے۔ اس حساب سے اگر کوئی آدمی ناک کی سیدھ چلنا شروع کرے' تو

پانچ برس میں جہاں سے چلا تھا' وہیں آ کر کھڑا ہو گا' اور اس کا صرف ایک پھیرا پورا ہو گا۔

۳۔ **توبتہ النصوح:** ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں "توبتہ النصوح" بہترین ہے' اور سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس ناول کا موضوع دینداری کی تعلیم ہے۔ مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں : "اس کا قصہ' واقعات کا تسلسل' کردار اشخاص کی موزونیت' مکالمات کا تناسب و برجستگی' سب کچھ نہایت خوبصورت و دلکش ہے۔ یہ ناول "۱۸۷۷ء میں شائع ہوا عبارت کا نمونہ یہ ہے:

> "کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا' ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی' لیکن مرزا جیسے نکھٹے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی' تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی اس کا نانا' وہ بھی حقیقی نہیں' ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو عالی جاہ سرکار' دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار' تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی' اس پر خود اس کی رشوت ستانی' بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دہلی کے روداروں میں ہوگیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہوگئی۔ جمعدار نے باوجود کہ دور کی قرابت تھی' حسبتہ" للہ اس کا تکفل اپنے ذمہ لے لیا۔ جمعدار اپنی حین حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کی یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی' لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے' پوتے' نواسے کثرت سے تھے' انہوں نے بے اعتنائی کی اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر کے مرے تھے' مگر ان کے ورثا نے بہ ہزار دقت محل سرائے کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا اور سات روپیہ مہینہ کی کرایہ کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔"

۴۔ **رویائے صادقہ :** ڈپٹی نذیر احمد کا یہ ناول' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' خواب کے پیرایہ میں ہے۔ ایک لڑکی سچے خواب دیکھا کرتی ہے' جو دیکھتی ہے' وہی پیش آتا ہے۔ لوگ اس پر کوئی غیبی اثر سمجھتے ہیں۔ آخر اس کی ایک جگہ شادی ہو جاتی ہے۔ وہاں بھی وہ ایک طویل خواب دیکھتی' جو مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ نذیر احمد کے قصے لکھنے کا مقصد ہی گویا یہ خواب بیان کرنا ہے۔ سوال و جواب کے انداز میں ہے۔ اس میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام عقل کے بالکل مطابق ہے۔ اس میں شکوک و شبہات کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ناول واقعات کے اعتبار سے بالکل سادہ ہے۔ کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ (۴) اس کی عبارت کا نمونہ

حسب ذیل ہے:

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم' کیا دھوکا ہوا ہے- ہم مدت تک اسی خیال میں رہے کہ صادقہ اور یوسفی دو سگی بہنیں تھیں- اب تحقیق ہوا کہ ایک ہی عورت کے دو نام ہیں' اور اصلی ایک بھی نہیں- اس کو میکے ہی میں لوگ صادقہ کہنے لگے تھے- اس واسطے کہ اس نے ساری عمر نہ کبھی جھوٹا خواب دیکھا' اور نہ اپنے جی سے بنا کر کوئی خواب بیان کیا- بیاہی گئی تو سسرال کی طرف سے یوسفی بیگم کا خطاب ملا- اس لیے کہ کثرت سے خواب دیکھتے دیکھتے اس کو تعبیر میں ایسا ملکہ ہوگیا تھا کہ اس کی رائے تیر بہدف ہوتی تھی- یوں تو کوئی ایسا بندہ بشر نہیں' جو سوتے میں خواب نہ دیکھتا ہو' بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ آدمی کا دماغ ایک لمحہ بھی بیکار نہیں رہ سکتا- وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا ہے- جیسا جاگتے میں ویسا سوتے میں- اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں کو خواب یاد نہیں رہتا' مگر پھر بھی وہ جتنی دیر سوتے ہیں' خواب ہی دیکھتے رہتے ہیں--- لوگوں نے بہت کچھ عقلیں دوڑائیں' مگر کسی کو ٹھیک پتہ نہیں ملا کہ خواب ہے کیا چیز' اور اس کی تعبیر کے اصول کیا ہیں- ہم بھی مدتوں اس خبط میں گرفتار رہے- جب سے صادقہ کا حال سنا یہ خیال ہی چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ خواب بھی اسرار الٰہی میں سے ہے-"

۵- **ابن الوقت :** مولوی نذیر احمد پرانی وضع قطع کے زبردست قائل تھے- ان کے نزدیک ہمارے مذہب کی روایات کے مقابلے میں مغربی تہذیب کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی- جو لوگ مغرب کے اثر سے اپنے مذہب کی روایات کو پس پشت ڈال کر نئی دنیا کی طرف جا رہے تھے' ان کو وہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے- انہوں نے اگرچہ دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی' لیکن انگریزی کا اثر ان پر مطلق نہ پڑا تھا- اعلیٰ تعلیم سے ان میں روشن خیالی ضرور پیدا ہوئی' لیکن ان کی زندگی پر رجعت پسندی کا عنصر غالب تھا- ان کا ناول "ابن الوقت" ان ہی حالات کی پیداوار ہے- اس کتاب میں انہوں نے انگریزی معاشرت کی کورانہ تقلید کے برے نتائج پر بحث کی ہے- "ابن الوقت" اس ناول کا مرکزی کردار ہے' جو ایک فرضی انگریز "مسٹر نوبل" کے زیر اثر اسلامی معاشرت چھوڑ کر انگریزی طرز زندگی اختیار کرتا ہے-

نذیر احمد نے اگرچہ "الحقوق و الفرائض" میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ "ابن الوقت" سے مراد خود ان کی ذات ہے' لیکن لوگوں نے اسے "کتمان حقیقت" سے تعبیر کیا ہے- عام خیال یہ ہے کہ یہ سرسید پر تنقید ہے- "ابن الوقت" کا فرضی نام سرسید ہی کے لئے وضع کیا

گیا' چنانچہ اسی بنا پر سرسید کے صاحبزادے سید محمود نے مولوی نذیر احمد سے شکایت کی کہ "آپ نے یہ کتاب لکھ کر میرے والد کو بدنام کیا ہے۔" انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے انگریزی وضع اختیار کرنے والوں کو گالیاں دی ہیں۔ اب جو چاہے' اپنے اوپر لے لے۔" یہ ناول ۱۸۸۸ء میں طبع ہوا۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"معلوم ہے کہ ابن الوقت ابتدائے تبدیل وضع سے گھربار چھوڑ کر باہر چھاؤنی میں جا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنے نوکر چاکر تھے کہ ان کی کوٹھی کا احاطہ بجائے خود ایک چھوٹا سا محلّہ تھا' لیکن اس کی زندگی ویسی ہی اداس تھی' جیسی ایک بیچلر کی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔ وہ نوکروں کے حق میں بڑا سیر چشم تھا۔ اس کے یہاں نوکروں کی ایسی بھاری تنخواہیں تھیں کہ دلی کی اتنی بڑی چھاؤنی میں بس دو چار ہی جگہ اور ہوں گی۔ اس لیے کہ اس کے تمام نوکر سلیقہ مند اور مستعد تھے اور حقیقت امر ہے کہ انہی نوکروں نے انگریزی سوسائٹی میں بات بھی بنا رکھی تھی' مگر نوکر کیسے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں' پھر بھی مالک کی تائید کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ انگریزی زندگی ایسے بکھیڑے کی زندگی تھی کہ ابن الوقت کو جتنا وقت کچہری اور ملاقات سے بچتا تھا' صفائی کی نگرانی اور ہر چیز کی خبر گیری کے لیے بہ مشکل وفا کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نوکر انگریزی مذاق سے خوب واقف ہے' مگر ابن الوقت سے خود صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے ایسی خراش تراش ایجاد کرنے لگا تھا کہ خواہی نہ خواہی اس کو دیکھنا پڑتا تھا۔

۶۔ **ایامیٰ:** اس میں مولوی نذیر احمد نے بیوہ عورتوں کی شادی پر زور دیا ہے۔

۷۔ **محصنات یا فسانہ مبتلا:** اس میں مصنف نے تعدد ازواج کے مسئلے پر بحث کی ہے۔

تبصرہ

مولوی نذیر احمد نے یوں تو مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں' جس کا بیان آگے آئے گا لیکن ان کی شہرت دوام کی ضامن وہ کتابیں نہیں' بلکہ وہ اصلاحی اور معاشرتی ناول ہیں' جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے ان ناولوں کو جدید اصولوں کے معیار پر نہیں جانچا جاسکتا۔ فنی لحاظ سے یہ ناول جدید نقادوں کی نگاہ میں بہت ناقص ہوں گے' لیکن ان کی اہمیت اولاً تو اپنے صنف میں اولیت کا درجہ رکھنے کی وجہ سے ہے' دوسرے ان کی مقصدیت کی بنا پر ہے۔ یہ ناول ایک

خاص مقصد کے پیش نظر لکھے گئے ہیں۔ ان کے لکھنے کی غرض و غایت اصلاح معاشرت تھی۔ معاشرہ میں عورتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ پوری قوم کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہوسکتی' جب تک کہ طبقہ نسوان کی اصلاح کے لیے قدم نہ اٹھایا جائے۔ سرسید نے اگر پوری قوم کی اصلاح کا کام مجموعی طور پر اپنے ذمہ لیا تھا' تو ان کے رفیق کار مولوی نذیر احمد نے عورتوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ مولوی نذیر احمد کو ناول نویسی کا فن معلوم نہ تھا' اور نہ ان کو اس کے جاننے کی ضرورت تھی۔ آج کوئی ان کے ناولوں پر خواہ کتنے ہی اعتراضات کرے' مگر انکے ناولوں کی اعلیٰ قدرو قیمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ ناول لکھتے وقت مولوی نذیر احمد کو تو خیال بھی نہ تھا کہ وہ کوئی صنف ادب تخلیق کر رہے ہیں' اور آگے چل کر ان کی قدر و قیمت کیا ہوگی۔ انہوں نے تو جیساکہ پہلے لکھا جا چکا ہے' دلچسپ قصے اپنی لڑکیوں کے لیے لکھے تھے' تاکہ ان کے ذریعے سے ان کی تعلیم و تربیت ہو سکے۔

سرسید کے رفقائے کار میں ایک تو آزاد صاحب طرز ادیب گزرے' دوسرے مولوی نذیر احمد صاحب طرز ادیب ہیں۔ وہ اپنے طرز میں ایک خاص انداز کے مالک ہیں۔ ان کی دو چار سطریں کہیں سے بھی اٹھا کر رکھ دیجئے' فوراً پتا چل جائے گا کہ یہ مولوی نذیر احمد کی عبارت ہے۔ وہ دلی میں پلے بڑھے تھے' تعلیم بھی وہیں پائی تھی۔ شادی بھی دلی کے ایک شریف خاندان میں کی تھی' جس کی بنا پر ان کی زبان میں ایک خاص خصوصیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس پر ان کی فطری شوخی' بانکپن' اور ظرافت نے بھی ان کی زبان کو ایک درجہ بخشا۔ دلی میں جو محاورے رائج تھے اور شریف خاندانوں کی عورتوں میں جو زبان بولی جاتی تھی' اسے انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنایا اور اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ آج کل وہ محاورے اور زبان آہستہ آہستہ مٹتی جا رہی ہے۔ کیا پتا' ایک زمانہ ایسا بھی آئے' جب ان محاوروں اور اس زبان کے سمجھنے والے بھی باقی نہ رہیں۔

نذیر احمد نے اپنے قصوں میں جو زبان اختیار کی ہے' وہ ان کے لیے بالکل موزوں ہے۔ کہیں کہیں عربی کے مشکل الفاظ نظر آتے ہیں' جو عربی نہ جاننے والوں کو ذرا ناگوار گزرتے ہیں لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مولوی نذیر احمد ایک عربی دان تھے۔ عربی میں ہی انہوں نے تعلیم پائی تھی۔ اس لیے عربی کا استعمال ان کے لیے ناگزیر تھا۔ ان کی ان کہانیوں میں پند و موعظت کا عنصر بھی غالب ہے۔ جس پر اکثر نکتہ چینی کی جاتی ہے اور یہ ان کی تحریر کی بہت بڑی خامی بتائی جاتی ہے' لیکن مولوی نذیر احمد کی شخصیت کو اگر سامنے رکھا جائے تو اعتراض کی چنداں گنجائش نہیں رہتی۔ ان کی شخصیت لازمی طور پر عالمانہ تھی۔ وہ ایک جلیل القدر واعظ تھے' یہ ان کے لیے

ناممکن تھا کہ اپنی تحریروں میں پند و موعظت کا انداز ترک کرتے۔ وہ غیر شعوری طور پر وہ سب کچھ لکھ جاتے تھے، جو آج کی تحریروں کا بڑا عیب بتایا جاتا ہے۔ ہماری نگاہ میں ان کی وہ تحریریں عیب سہی، لیکن وہ خود ہرگز ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ کہانیاں لکھنے سے ان کا جو اصلی مقصد تھا وہ ان کے خیال میں ان پند و موعظت کے عنصر کے بغیر پورا نہ ہو سکتا تھا اور شاید نذیر احمد کی یہ امتیازی شان پیدا نہ ہوتی۔

مولوی نذیر احمد اردو ادب کے اولین ناول نویس ہیں۔ آج اگرچہ یہ فن کافی ترقی کر گیا لیکن مولوی نذیر احمد اس کے موجد ہیں۔ ان کے ان ناولوں کو اگر ابتدائی نقوش کہہ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں، اور ظاہر ہے، نقش اول ہونے کی حیثیت سے ان میں کچھ خامیاں رہ جانا فطری امر ہے۔

نذیر احمد کے ناول آج سے کوئی سو سال پہلے لکھے گئے تھے لیکن اب بھی وہ اس قدر مقبول ہیں کہ آئے دن ان کے نئے نئے ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جو لوگ اپنی بہو بیٹیوں کے اخلاق اور کردار کی اصلاح چاہتے ہیں، وہ نذیر احمد کی یہی کہانیاں خرید کر لے جاتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کا جو مقصد اصلی تھا وہ یہی تھا۔ اس لحاظ سے وہ ایک کامیاب ناول نگار ہیں۔

مذہب و اخلاق

۱۔ ترجمہ قرآن مجید: مولوی نذیر احمد کا زنانہ اصلاحی ناولوں کے بعد سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ اردو میں قرآن مجید کے ترجمے ان سے پہلے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے کئے تھے لیکن ان ترجموں کی زبان اس قدر پرانی ہو چکی ہے کہ موجودہ زمانے کے مذاق کے مطابق نہیں رہی۔ اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی اہل قلم قرآن مجید کا ترجمہ جدید رنگ میں کرے تاکہ ہر خاص و عام با آسانی قرآن کریم کے مطالب سے آگاہ ہو سکے۔ مولوی نذیر احمد نے اس کمی کو پورا کیا۔ ان کا ترجمہ نرا ترجمہ ہی نہیں، بلکہ بعض جگہ موقع و محل کے مطابق تشریحی الفاظ بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ "فائدے" کے عنوان سے کہیں کہیں تفسیر بھی کی گئی ہے، جس سے افادیت میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے ترجمے کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"اے ہمارے پروردگار، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو (اس کے وبال میں) نہ پکڑ، اور اے ہمارے پروردگار جو لوگ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں، جس طرح ان پر تو نے (ان کے گناہوں کی پاداش میں) احکام سخت کا بار ڈالا تھا، ویسا بار ہم پر نہ ڈال، اور اے ہمارے پروردگار، اتنا بوجھ جس (کے اٹھانے) کی ہم کو طاقت نہیں، ہم سے نہ اٹھوا، اور ہمارے قصوروں سے درگزر اور ہمارے گناہوں کو معاف

کر اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا حامی و مددگار ہے۔ تو ان لوگوں کے مقابلے میں جو کافر ہیں، ہماری مدد کر۔"

۲۔ **الحقوق و الفرائض** : مولوی نذیر احمد کی یہ اہم کتاب تین جلدوں میں ہے۔ اس میں قرآن مجید کے مفہوم و مطالب پر تشریحی مضامین ہیں۔ عقائد، عبادات، معاملات اور معاشرت کے متعلق خاص اسلامی نقطہ نگاہ سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں مولوی نذیر احمد نے اپنے بیان کی تائید میں حدیث شریف سے حوالے بھی درج کئے ہیں۔ وہ پہلے قرآن مجید کی کسی آیت کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد "من المترجم" کے عنوان سے اپنا تشریحی مضمون لکھتے ہیں۔ سنہ تصنیف ۱۹۰۶ء ہے۔ عبادات کا نمونہ حسب ذیل ہے :

"**من المترجم** : ہم اپنی جگہ اسی خیال میں ہیں کہ یہ کتاب احکام شریعت اسلامی کے فتاوے کا کام دے۔ بڑی چھوٹی کوئی بات اس سے رہ نہ جائے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کھانے پینے کی حرام چیزوں پر ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بڑی بھول ہوئی کہ حقے پان تمباکو کی نسبت کچھ نہیں لکھا، حالانکہ یہ چیزیں ہم مسلمانوں میں اس کثرت سے چل پڑی ہیں کہ اب ان ہی کی تواضع مدارات رہ گئی ہے اور غالباً دو تہائی سے زیادہ ہی زیادہ مرد و زن اس بلا میں مبتلا ہیں۔ حقیقت میں تو حقہ پان تمباکو ماکولات اور مشروبات کی قسم کے ہیں نہیں اور اسی وجہ سے ہم نے کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں کے بیان میں ان کے حال سے تعرض نہیں کیا۔ مگر بولنے میں حقے، پان، تمباکو کو کھانے پینے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کثرت استعمال اور تعبیر کے لحاظ سے ہم نے ان کا جداگانہ باب قائم کیا۔ فرضی حکایتوں میں سے ایک حکایت ہے کہ ایک چوہے کو کہیں سے ہلدی کی ایک گرہ مل گئی۔ وہ برخود غلط اسی گرہ کے برتے پر اپنے تئیں پنساری سمجھنے لگا۔ یہی حال آدمی کا ہے۔ خصوصاً ان وقتوں کے متزلزل العقیدہ مسلمانوں کا کہ تاوقتیکہ عقل اجازت نہ دے، معاذ اللہ خدا رسول کسی کے کہنے کا یقین نہیں کرتے۔ تو یہ گویا وہی برخود غلط چوہے ہیں، اور عقل ان کی ہلدی کی گرہ۔"

۳۔ **الاجتہاد** : مولوی نذیر احمد کی یہ آخری زمانے کی تصنیف ہے۔ وہ اس کی تالیف کا سبب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے یہ خیال آیا کہ میں کیوں مسلمان ہوں؟ یہ خیال کچھ ایسے پیچھے پڑا کہ ہرچند میں اس کو ٹالنا چاہتا تھا، ٹلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ یہاں تک کہ کئی

سال متواتر میں اسی خیال میں غلطاں پیچاں رہا۔ خیال نے ایسی وسعت پکڑی کہ تھا تو میں ایک، مگر ایسا معلوم ہوا کہ ایک سے دو ہو گیا ہوں۔ ایک حیثیت سے سائل اور دوسری حیثیت سے مجیب، میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا خیال کبھی دوسرے مسلمانوں کو بھی آتا ہے یا نہیں، مگر آنا چاہئے، بلکہ مسلمانوں کی خصوصیت نہیں، میں تو کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص کو جو مذہب کی ضرورت کو سمجھ کر خاص مذہب کا معتقد ہو کبھی نہ کبھی اپنے نفس سے پوچھنا چاہئے کہ وہ کیوں مثلاً ہندو، عیسائی، یہودی یا کیا یا کیا ہے۔ یہ خیال کرنے سے قوی امید ہے کہ وہ حق کو دریافت کرے گا۔"

۳۔ **امہات الامت:** اس کتاب میں حضرت نبی کریمؐ کی ازواج مطہرات کے حالات اور تعدد ازواج کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ اس سے مولوی نذیر احمد کا مقصد معترضین اسلام کا جواب دینا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کا وہ مقصد نیک اور پاک تھا۔ سر سید بھی ان سے پہلے اس قسم کا جواب لکھ چکے تھے لیکن انہوں نے اپنی عام طرز کے مطابق ایسی زبان استعمال کی جس سے ازواج مطہرات سے گستاخی اور بے ادبی ظاہر ہوتی تھی۔ کتاب شائع ہوتے ہی عام پبلک خصوصاً علمائے کرام کی طرف سے اعتراضات اور احتجاج کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سب نے مطالبہ کیا کہ اس کتاب کی تمام جلدیں ان کے حوالے کی جائیں، پھر جلا دی جائیں۔ مولوی نذیر احمد پہلے راضی نہیں ہوئے لیکن بعد میں اصرار زیادہ ہوا تو مجبور ہوئے۔ تمام جلدیں لوگوں کے حوالے کر دیں، جو کانپور کے ایک جلسہ عام کے سامنے جلا دی گئیں۔ مصنف کو رنج تو بہت ہوا، مگر کیا کر سکتے تھے، چپ ہو کر رہ گئے۔ ایک عرصے کے بعد اس میں سے قابل اعتراض باتیں حذف کر کے ان کے صاحب زادے مولوی بشیر الدین نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کیا۔ عبارت کا مختصر نمونہ دیکھئے:

"لوگ یہ بیان کرنے میں جو اعتراض مدنظر رکھتے ہوں، ہمارا دل تو گواہی دیتا ہے اور ہمارا دل کیا گواہی دیتا ہے، ہر ایک مصنف کا دل گواہی دے گا کہ پیغمبر صاحب نے بی بی کی، اسلام کا مفاد مدنظر رکھ کر کیسی نفسانی خواہش اور کیسا حسن و جمال اور کیسی دولت ان کو اسلام کے آگے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ ہم اس کی ضرورت تو سمجھتے نہیں کہ مناکحت کو خلاف شان پیغمبری سمجھ کر پیغمبر صاحب میں فقدان قوت کے قائل ہوں۔ ایسا سمجھنا ان کے کمال انسانیت کو بٹا لگانا ہے۔ پس سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ پیغمبر صاحب کی مناکحت میں اس قوت کو بھی دخل ضرور تھا۔ مگر اسلام کی دین کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام بشری خواہشیں، بشری اغراض مغلوب تھیں، مگر نکاح

میں اول اور اقدام اسلام' اور اسلام کی روکھن میں دوسری اغراض اور یہی وجہ ہے تکثیر ازواج کی بھی ہوئی کہ دامادی کے دباؤ سے سارے سسرالی قبیلے کو جھکنا پڑتا ہے' اور اسی کی اسلام کی اشاعت کے لئے بڑی ضرورت تھی۔"

۴۔ **ادعیتہ القرآن:** اس کتاب میں قرآن مجید کی تمام دعائیں ایک جگہ جمع کر کے ان پر مفید حاشیئے لکھے ہیں۔

۵۔ ان کتابوں کے علاوہ اخلاق کے موضوع پر مولوی نذیر احمد نے (۱) منتخب الحکایات (۲) چند پند اور (۳) موعظہ حسنہ کے نام سے تین کتابیں اور لکھیں۔

۶۔ منطق پر "مبادی الحکمت کے نام سے ایک رسالہ لکھا' جس میں علم منطق کی تعلیم کا جدید طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور وجہ درسی کتابوں سے مختلف ہے۔ اس میں مثالیں بھی نئی تلاش کر کے دی گئی ہیں' جن سے دلچسپی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ سنہ تالیف ۱۸۷۱ء ہے۔

علم ہیئت پر "سموات" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ سنہ تالیف ۱۸۷۶ء ہے۔

ان کے علاوہ عربی قواعد پر "ماینفک فی الصرف" اور "صرف صغیر" کے نام سے بھی دو کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

"رسم الخط" "نصاب خسرو" اور "فسانہ غدر" ان کی دیگر چھوٹی چھوٹی تصنیفات ہیں۔

۷۔ **مجموعہ لکچر:** اخیر میں ان کے مجموعہ لکچر کا بھی ذکر یہاں ضروری ہے' جو ادبی شان کا حامل ہے۔ مولوی نذیر احمد کو قدرت نے غیر معمولی قوت بیان عطا کی تھی' جس کی بدولت انہوں نے تصنیف و تالیف کے علاوہ قومی کاموں میں بھی حصہ لیا۔ آواز' لب و لہجہ اور انداز بیان ایسا پایا تھا کہ جلسے میں تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو لوگ مسحور ہو جاتے تھے۔ سامعین کو ہنسانا' رلانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چندے کے لیے اپیل کرتے تو حاضرین کی جیبیں خالی کرا لیتے تھے ۔ سرسید کو قومی کاموں کے لیے چندہ فراہم کرنے کی ضرورت رہتی تھی۔ اس سلسلے میں وہ اکثر مولوی نذیر احمد کی غیر معمولی استعداد سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ اپنی تقریر پہلے سے چھپوا لیتے تھے لیکن جلسے میں کھڑے ہونے کے بعد تحریر کے پابند نہیں ہوتے تھے۔ یوں ہی بے تحاشا بولے جاتے تھے۔ سامعین مبہوت ہر کر ان کی تقریر سنتے تھے۔

"مولوی نذیر احمد اپنی تقریر میں عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور محاورے' عربی کے فقرے' اشعار اور آیتیں جابجا استعمال کرتے تھے۔ پھر بھی ان کے طرز ادا' جوش بیان اور فصاحت زبان کے سبب تقریر کی دلکشی میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔"

ان کے لکچر کا ایک اقتباس یہ ہے:

ہم یہ کہتے کہ تو موجود ہیں کہ مسکین این ندارد آن ندارد' مگر کرنے کے نام میرے دیکھتے میں تو اتنا ہوا کہ سید احمد خان کے غل شور مچانے سے قومی مرثیہ خوانوں کا ایک گروہ پیدا ہوگیا- جب تک لکھنؤ میں نوابی رہی' مرثیہ خوانی کا بڑا زور شور تھا' اور اسی طرز کو انیس اور دبیر نے حقیقت میں معجز بیانی کی حد تک پہنچا دیا- نہ کسی نے ان جیسا کہا' اور نہ کوئی ان جیسا کہہ سکے گا- اب جو نئی قسم کے مرثیہ خوان چلے تو اس کے موجد ہوئے' ہمارے مولوی الطاف حسین صاحب حالی- انہوں نے ایک بڑی دھوم کا مسدس لکھ کر کچھ ایسا بگل پھونکا کہ جہاں جہاں موزوں طبع تھے سب لگے ان ہی کی لے میں گانے اور گنگنانے' گنگنانے والوں میں یہ آپ کا نیازمند بھی ہے کہ شعر تو نہیں کہہ سکتا' مگر تک سے تک ملا لیا کرتا ہے- میں نہیں سمجھتا کہ مولوی الطاف حسین نے مسدس' اس غرض سے کہا تھا کہ ایشیائی شاعری میں ایک طرز جدید داخل کریں' بلکہ ان کی غرض اصلی یہ تھی کہ سوئی ہوئی قوم جاگے' اور دیکھے کہ تباہی کا سیلاب ان کے سروں پر آپہنچا' مگر قوم نے جاگنا تو درکنار کروٹ تک بھی نہ لی' اور ان کے مسدس کا ایک کھیل بنا کھڑا کیا-"

تبصرہ

مولوی نذیر احمد نے جیساکہ پہلے لکھا جا چکا ہے' مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا' لیکن ذاتی اپج اور شوخی طبع کی بنا پر اپنا ایک خاص طرز قائم کر لیا- اس طرز کو بعض لوگوں نے "عامیانہ" اور "سوقیانہ" کہا ہے' لیکن بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: اسے "عوامی" کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے- مولوی نذیر احمد نے اپنی تصنیفات میں جو زبان استعمال کی اور جو طرز بیان اختیار کیا وہ عوام کی زبان سے زیادہ قریب ہے- سرسید کے بعد مولوی نذیر احمد پہلے شخص ہیں' جنہوں نے اپنی تصنیفات کی بنیاد "ماورائی اشیا" پر نہیں' بلکہ ہماری عام زندگی پر رکھی ہے- ان کی نگارشات کا فوارہ عام لوگوں کی زندگی کے چشمے سے نکلا ہے- وہ ہر جگہ زندگی کے روز و شب' غم و آلام' اور ہماہمی میں شریک معلوم ہوتے ہیں- انہوں نے قصے کہانیاں لکھیں' لیکن ان کے کردار جن' پری یا دیو قرار نہیں پائے' بلکہ اسی دھرتی کی حسن آرا' محمودہ یا سلطانہ بیگم قرار پائیں- یہ ہمارے ادب کو زندگی سے قریب تر لانے کی ایک کامیاب کوشش ہے' لیکن باجود ان تمام باتوں سے مولوی نذیر احمد کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی خاص افتاد طبع کی بنا پر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ

مضامین میں کوئی فرق قائم نہیں رکھا۔ ہر موضوع اور مضمون کے لیے ایک ہی زبان اور ایک ہی انداز بیان اختیار کیا۔ ان کا "عوامی طرز" قابل ستائش ضرور ہے، لیکن وہ ہر جگہ تو نہیں آ سکتا۔ یہ طرز ان کے اصلاحی اور زنانہ ناولوں کے لیے تو بالکل ٹھیک تھا لیکن قرآن مجید کے ترجمہ "الحقوق و الفرائض" "الاجتہاد" اور "امہات الامتہ" جیسی کتابوں کے لیے ہرگز موزوں نہ تھا۔ اس طرز کی وجہ سے ان کی "امہات الامتہ" کا کیا حشر ہوا، انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

تاہم یہ کہنا اور ماننا پڑے گا کہ مولوی نذیر احمد ایک بہت بڑے صاحب طرز ادیب تھے۔ اردو ادب کی تاریخ بھی ان کے ذکر سے خالی نہیں ہو سکتی۔

حواشی

۱۔ تلخیص الاردو، صفحہ ۱۹۳۔
۲۔ داستان تاریخ اردو، صفحہ ۴۶۴۔
۳۔ داستان تاریخ اردو، صفحہ ۵۴۰-۵۴۱۔
۴۔ داستان تاریخ اردو، صفحہ ۵۸۰۔

مولانا الطاف حسین حالی

حالات زندگی:

مولانا الطاف حسین حالی قصر ادب کے بڑے معماروں میں ایک ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں ہوئی۔ ان کے آبا و اجداد تیرہویں صدی عیسوی میں غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ہرات سے برصغیر آئے۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش محکمہ نمک میں ملازم تھے۔ جب وہ نو برس کے ہوئے تو والد کا انتقال ہوگیا۔ بھائی بہنوں کی سرپرستی میں اولاً قرآن مجید حفظ کیا تعلیم کا شوق تو بہت تھا لیکن باقاعدہ حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ سید جعفر علی سے جو پانی پت میں مقیم تھے، فارسی کی دو چار ابتدائی کتابیں پڑھیں اور فارسی ادب سے ایک طرح کی مناسبت حاصل کی، پھر مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی صرف و نحو پڑھی۔ تعلیم کا سلسلہ ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ۱۸۵۴ء میں جب کہ ان کی عمر صرف سترہ سال کی تھی، بھائی بہن نے شادی پر مجبور کیا۔ اس سے تعلیم کا دروازہ ان کے لیے بظاہر مسدود ہوگیا۔ تعلیم کا شوق غالب تھا، اور سسرال والے بھی آسودہ حال تھے، اس لیے وہ خود ان کے الفاظ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دہلی چلے گئے اور قریب ڈیڑھ برس وہاں رہ کر مولوی نوازش علی سے صرف و نحو اور منطق کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ ۱۸۵۵ء میں عزیز و اقارب نے ان کو تعلیم چھڑا کر دلی سے پانی پت بلا لیا۔ ۱۸۵۶ء میں حصار کے کلکٹر کے دفتر میں قلیل تنخواہ پر ملازمت کر لی۔ ۱۸۵۷ء میں عالمگیر ہنگامہ برپا ہوا اور حصار میں بعض واردات پیش آئیں تو یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد تقریباً چار سال تک بیکار رہے۔ اس عرصے میں وہ بغیر کسی ضابطے کے پانی پت کے مشہور فاضل مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی سے منطق، فلسفہ، حدیث اور تفسیر کی کتابیں پڑھتے رہے۔

۱۸۷۲ء میں مولانا حالی روزگار کی تلاش میں لاہور گئے۔ وہاں ان کو گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک ملازمت مل گئی، جس میں ان کو سرشتہ تعلیم کی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں

کی عبارت دیکھنا اور درست کرنا پڑتی تھی' اس کام میں انہیں انگریزی ادب سے ایک قسم کی بالواسطہ واقفیت ہوگئی' اور انگریزی خیالات اور طرز ادا سے ایک گونہ مناسبت پیدا ہوگئی۔ انگریزی ادب میں جو خوبیاں انہیں نظر آئیں' وہ اس قدر دلفریب تھیں کہ وہ اپنے مشرقی ادب کی پرانی قدروں سے بیزار ہوگئے۔ ان کو فکر لاحق ہوا کہ کس طرح اپنے ادب میں انگریزی ادب کی ان خوبیوں کو سمویا جائے' چنانچہ یہیں سے وہ ادبی زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ یہ ان کا اصلاحی اقدام تھا' جو بعد کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔

مولانا حالی گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں کوئی چار سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ چیف کالج' لاہور میں بھی کوئی آٹھ مہینے تک استاد کی حیثیت سے پڑھاتے رہے۔ لاہور کی آب و ہوا انہیں موافق نہ آئی۔ اس لیے تبدیل ہو کر دلی چلے آئے' جہاں انہیں اینگلو عربک اسکول میں جگہ مل گئی۔

دلی میں مولانا حالی کی سرسید سے ملاقات ہوئی' جن کی فرمائش پر انہوں نے "مسدس" لکھا۔ ۱۸۸۷ء کا ذکر ہے' نواب سر آسمان جاہ' مدارالمہام سرکار عالی نظام علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ مولانا حالی بھی اس زمانے میں علی گڑھ گئے ہوئے تھے۔ سرسید نے نواب صاحب سے ان کا تعارف کرایا' جنہوں نے از راہ قدردانی مولانا حالی کے لیے پچھتر روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۱۸۹۱ء میں جب کہ مولانا حالی ایک وفد کے ساتھ حیدر آباد گئے' تو اس وظیفے میں اور پچیس روپیہ کا اضافہ کر کے سو روپیہ ماہوار کر دیا گیا' وظیفہ ملنے کے بعد جب ان کو معاش کے سلسلے میں ذرا اطمینان ہوگیا تو اینگلو عربک اسکول کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر کے پانی پت چلے گئے اور وہاں تصنیف و تالیف کے کام میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ ادبی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ کی طرف سے ان کو ۱۹۰۴ء میں شمس العلما کا اعزازی خطاب ملا۔

مولانا حالی کا انتقال ان کے وطن پانی پت میں ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ہوا۔

ادبی زندگی

۱۔ **تریاق مسموم** : مولانا حالی نے اردو نثر میں اپنی اولین تصنیف کے بارے میں خود لکھا ہے : "سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب "تریاق مسموم" نیٹو کرسچین کی کتاب کے جواب میں' جو میرا ہم وطن تھا' اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا' لکھی تھی' جس کو اسی زمانے میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔(۱) یہ کتاب نایاب ہے۔

۲۔ **طبقات الارض** : اپنی دوسری تالیف کے بارے میں رقم طراز ہیں : "اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا' جو جیولوجی میں تھی' اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی

تھی، اردو میں ترجمہ کیا، اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا، چنانچہ ڈاکٹر لائٹرز کے زمانے میں یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی، جب کہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا، دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی، اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔(۲)
اردو میں اس ترجمے کا نام انہوں نے "طبقات الارض" رکھا۔ پنجاب یونیورسٹی نے اس کو ۱۸۶۸ء میں چھپا کر شائع کیا۔ اب وہ کتاب نایاب ہے۔

۳۔ **مجالس النساء :** مولانا حالی کی اردو نثر میں تیسری قابل ذکر کتاب "مجالس النسا" ہے، جو انہوں نے ۱۸۷۴ء میں لکھی تھی۔ اس کے بارے میں مولانا رقم طراز ہیں: "لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ "مجالس النسا" لکھی تھی، جس پر کرنل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپیہ کا انعام دلوایا تھا، اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی، اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو:(۳)

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ یہ مولانا حالی کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ شاید مولوی نذیر احمد کے زنانہ ناولوں کو دیکھ کر انہیں اس کے لکھنے کا خیال پیدا ہوا ہو لیکن اس میں وہ بات کہاں جو مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں ہے۔ بہرحال، اس کی عبارت کا ایک مختصر نمونہ ملاحظہ ہو:

> "تم اپنے جی میں کہو گی تو سہی بڑھاپے میں عورت کی عقل جاتی رہی ہے، پر مجھ سے جو پوچھو تو ہے یوں کہ خدا بیٹیوں کا بدلہ لیتا ہے۔ ماں باپ نے یہ سمجھا تھا کہ بیٹوں کی کمائی میں تو ہمارا ساجھا ہے، اور بیٹیوں سے ہم کو کچھ کہنا نہیں۔ آؤ جہاں تک ہوسکے بیٹوں کو پڑھائیں، جو کل کو ہمارے کو بھی کام آئے۔ خدا کو یہ بات ناپسند آئی۔ اس نے بیٹوں کو بیٹیوں سے بھی بدتر کر دیا۔ وہ تو عورت ہو کے ان پڑھ رہی تھیں، یہ مرد ہو کے جاہل رہے۔"

۴۔ **حیات سعدی :** اس کے بعد مولانا حالی کی مایہ ناز تصنیف "حیات سعدی" کا ذکر آتا ہے، جو انہوں نے ۱۸۸۲ء کے لگ بھگ لکھی تھی۔(۴) اس میں مولانا نے بڑی تحقیق اور جستجو سے شیخ سعدی کے حالات جمع کئے ہیں۔ پھر ان کی تصانیف پر نظر ڈالی ہے اور دوسروں سے مقابلہ کر کے ان کا مقام متعین کیا ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> "جس زمانے میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا، اگرچہ اس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہوچکا تھا، مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد

دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا' اور اس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لیے سنبھال لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور ارباب حرفت و صنعت مدینہ السلام بغداد میں جمع تھے' عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے' اور بڑے بڑے امرا اور فرماں روا بارگاہ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصر خلافت کے آستانے پر ایک پتھر بہ منزلہ حجر اسود کے پڑا ہوا تھا' جس کو امرا اور راعیان سلطنت قصر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے۔ تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی' وہاں ایک مدت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالا خانے کرایہ داروں سے رک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جلال شیخ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر اسی آنکھ سے اس دارالخلافہ کا بے چراغ ہونا' جو چھ سو برس بوسہ گاہ ملوک و سلاطین رہا تھا' اور اس خاندان کی بربادی' جس کا سایہ اقتدار یورپ اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا' اور خلیفہ اور اس کی اولاد اور ہزارہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بیدریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لیے صفحہ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے' جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے' اور وہ ظلم و ستم بھی اس کی آنکھوں کے روبرو گزرے تھے' جو ہلاکو خان کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کئے۔ ان حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لیے ایک عمدہ سبق تھا جس نے اس کے دل میں قوم کی دلسوزی' بادشاہوں کی اصلاح' رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اسی خیال کی بدولت اس نے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیر اندیشی میں صرف کی' مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اس وقت لکھا ہے' جب کوئی شخص اس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اس کا ماتمدار اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا۔"

۵۔ **مقدمہ شعر و شاعری:** یہ مولانا حالی کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ یہ مقدمہ اولاً ان کے دیوان کا ایک جز تھا لیکن چونکہ یہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے' اس لئے ۱۹۲۰ء میں اس کو الگ شائع کیا گیا۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۸۹۳ء ہے۔ اس میں پہلے شاعری کی تعریف اور شاعر کے لوازمات اور خصائص پر بحث کی گئی ہے' اس کے بعد اردو شاعری اور شاعروں پر تنقید و تبصرہ

ہے۔ یہ مولانا حالی کی معرکتہ الارا تصنیف ہے۔ اردو تنقید میں اس سے پہلے کسی نے باقاعدہ تنقید نہیں لکھی تھی۔ اس لحاظ سے اس میں مولانا حالی کو اولیت حاصل ہے۔ یہ گویا اردو شاعر اور شاعری کی اصلاح کا پہلا اقدام ہے۔ شعر کے محاسن و معائب پر بحث کر کے بتایا گیا ہے کہ اردو شاعروں کو اپنی شاعری میں کن چیزوں کا زیادہ لحاظ رکھنا چاہیے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو نیچرل شاعری کا لفظ کچھ لوگوں کی زبان پر جاری ہے' اس کی کسی قدر شرح کی جائے۔ بعض حضرات تو نیچرل شاعری اس شاعری کو سمجھتے ہیں جو نیچریوں سے منسوب ہو' یا جس میں نیچریوں کے مذہبی خیالات کا بیان ہو۔ بعضے یہ خیال کرتے ہیں کہ نیچرل شاعری وہ ہے' جس میں خاص مسلمانوں کی یا مطلقاً کسی قوم کی ترقی یا تنزل کا ذکر کیا جائے مگر نیچرل شاعری سے یہ دونوں معنے کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔ نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے' جو لفظاً" و معنیً" دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی تراکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو' جس میں وہ شعر کہا گیا' کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے' نیچر یا سیکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا' اسی قدر ان نیچرل سمجھا جائے گا۔ معنے نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں' یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا' وہ ان نیچرل سمجھا جائے گا۔"

۶۔ **یادگار غالب:** مولانا حالی کو اردو کے بے مثل و بے نظیر شاعر غالب سے بڑی عقیدت تھی۔ اردو شاعری میں غالب کا جو اعلیٰ مقام ہے' اس کی وجہ سے اس عظیم ہستی سے ہر اہل ذوق کو عقیدت ہے' لیکن غالب کے اس مقام کو دنیا کے سامنے روشن اور اجاگر کرنے کے لیے سب سے پہلے مولانا حالی نے قلم اٹھایا۔ وہ صحیح معنوں میں اس کام کے اہل تھے' اور انہوں نے اپنا حق پورا پورا ادا کیا۔ مولانا حالی نے غالب سے اصلاح سخن لی تھی' اور دہلی میں رہ کر کئی سال تک کسب فیض بھی کیا تھا' جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ اس لئے غالب پر لکھنے کے لیے مولانا حالی سے بہتر

کوئی آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ زمانہ مابعد میں غالب پر جو کچھ لکھا گیا' وہ بہت حد تک حالی کی "یاد گار غالب" کا رہین منت ہے۔ مولانا حالی کو اس کتاب میں غالب کی ذات اور شخصیت پر زیادہ روشنی ڈالنا مقصد تھا۔ اس لئے ان کے کلام پر جیساکہ چاہئے تھی' بحث نہیں کی۔ انہوں نے غالب کے کلام پر صرف اسی قدر بحث کی ہے جس سے اس شاعر عظیم کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہو لیکن اس کے باوجود اس کتاب کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ "یاد گار غالب" غالب کی بھی یادگار ہے' اور حالی کی بھی۔ اس کا سنہ تالیف ۱۸۹۷ء ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"منشی نبی بخش حقیر تخلص جو ایک زمانے میں کول میں سرشتہ دار تھے' اور جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سنی گئی ہے' کہیں وہ دلی میں آئے ہیں' اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے ہیں۔ ان کی نسبت ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں' جس کا ماحصل یہ ہے کہ "خدا نے میری بے کسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا' جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درمان اپنے ساتھ لایا' اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی' جس کی روشنی میں' میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی' دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ بیگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے "حالانکہ میں شعر کہنا جانتا ہوں' مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا' یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے' آدھا یوسفؑ کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو' کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں' اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو' گو زمانہ اور آسمان میرا کیا ہی مخالف ہو' میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں' اور اس نعمت پر دنیا سے قانع۔"

۷۔ **حیات جاوید:** سرسید احمد خان کی سیاسی' مذہبی اور ادبی شخصیت سے کون واقف نہیں' برصغیر کی ان معدودے چند عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں' جن کو خدا نے از غایت عنایت دنیا کے اس خطے کے بدقسمت اور مصیبت کے مارے باشندوں کی نجات اور فلاح و بہبود کے لیے بھیجا تھا۔ انہوں نے اردو علم و ادب کی ترقی اور اصلاح کے لیے جو کچھ کیا' یہ صرف ان ہی کا کام تھا۔ ان کی ذات بابرکت سے اردو علم و ادب کے پاک سرچشمہ سے بہت سے نئے سوتے

پھوٹے' اور ان کی پر عظمت شخصیت کے زیر اثر ایسے لائق اور قابل اہل قلم پیدا ہوئے' جنہوں نے اردو علم و ادب کی فرسودگی اور کہنگی سے بیزاری کا اظہار کر کے اس میں اصلاحات لانے کے لیے مختلف تدابیر کیں۔ سرسید کی شخصیت اور عملی زندگی دوسروں کے لیے سبق آموز اور دل افروز ہے۔ اس لیے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ تمام تفصیلات کے ساتھ ان کی سوانح لکھی جائے۔ ان کے رفقائے کار میں سے مولانا حالی نے اس ضرورت کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا اور سرسید کو زندہ جاوید بنانے کی خاطر "حیات جاوید" لکھ کر خود بھی زندہ جاوید ہوگئے۔ سرسید جیسی بلند پایہ ہستی پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مولانا حالی کو خدا نے بہت صلاحیت عطا کی تھی۔ انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا' اور حق تو یہ ہے کہ انہوں نے "رفیق" ہونے کا حق ادا کر دیا۔ مولانا حالی سرسید کے مداحوں میں سے تھے۔ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے سرسید کی سرگرمیاں ان کے نزدیک بڑی قابل قدر تھیں۔ اس لیے انہیں اگر سرسید کے ہم خیال' ہم عقیدہ یا زیادہ صاف الفاظ میں "لبیک" کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ سرسید میں بعض خامیاں بھی تھیں' اور کہیں کہیں انہوں نے ان کی طرف ہلکے اشارے بھی کئے ہیں' لیکن بیشتر جگہ انہوں نے ان خامیوں کی توضیح و تعبیر کر کے اچھے معنی پہنانے کی کوشش کی ہے۔ اسی بنا پر ان کے ہمعصر مولانا شبلی نے "حیات جاوید" کو سرسید کی "مدلل مداحی" بتایا ہے' تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا حالی کی نیک نیتی میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ ایک شریف الطبع انسان تھے۔ شریفانہ زبان اور شریفانہ انداز بیان میں سرسید کے بارے میں انہوں نے جو دیکھا' سنا اور پڑھا' اس میں اگر کچھ خامیاں رہ بھی گئیں ہیں' تو حالی کو مورد الزام نہ ٹھہرانا چاہئے۔ یا بقول رام بابو سکسینہ: "اس زمانے کی تصانیف کو اتنی سختی کے ساتھ جانچنا مناسب نہیں ہے۔

"حیات جاوید" کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"اسلام کی حقیقت کا یقین اور بانی اسلام کی محبت اور عقیدت سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ ان پر غالب رہا' مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔ وہ انہیں سنت و بدعت و تقلید و عدم تقلید کے جھگڑوں میں الجھے رہے' اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف انہیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے' جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو اور یا خاص شخص کو پہنچتا ہے' مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں نے ان کی آنکھیں کھولیں' اور خود اس یقین نے جو اسلام کی حقیقت کی نسبت ان کی گھٹی میں پڑا تھا' ان کو اسلام کی حقیقت اور اس کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچا دیا۔ جو باتیں دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف

معلوم ہوئیں' ان کو چھوڑا اور جو اس کے مطابق پائیں' ان کو پکڑا' اور زید و عمرو کی مخالفت کا خوف یک قلم دل سے اٹھا دیا۔ ہر ایک معاملے میں خود مذہب کو نہ زید و عمرو کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا' اس کو بلاواسطہ مذہب ہی سے پوچھا' اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا' اس کو سر پر رکھا۔"

۸۔ مضامین حالی: مندرجہ بالا مستقل تصنیفات کے علاوہ مولانا حالی وقتاً" فوقتاً" اردو کے مختلف ادبی رسالوں میں مضامین و مقالات لکھتے رہے' جو کافی دقیع اور ادبی شان کے حامل ہیں۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۱ء تک "تہذیب الاخلاق"' "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"' "کالج میگزین"' "معارف" (د) علی گڑھ "روئداد العلما" وغیرہ میں جو مضامین نکلے تھے' ان کو جمع کر کے "مضامین حالی" کے نام سے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد پھر انجمن ترقی اردو نے "مقالات حالی" کے نام سے دو حصوں میں مولانا حالی کے تمام مضامین و مقالات کو شائع کیا۔

مولانا حالی کے مجموعہ مقالات میں ہر قسم کے مضامین تمثیلی' مذہبی' اخلاقی' اصلاحی' تحقیقی' تنقیدی وغیرہ شامل ہیں۔ بہت سی کتابوں پر ریویو بھی ہیں' جو ان کی وسعت نظر اور فراخ دلی کے آئینہ دار ہیں۔ مولانا حالی طبعاً" ایک صلح پسند اور امن جو انسان تھے' اس لیے ان کے مضامین میں ہر جگہ ایک مفاہمتی انداز پایا جاتا ہے۔ تبصرہ ہو یا تنقید' ان کی روش تحریر بہت نرم اور پاکیزہ ہے۔ اپنے ہمعصر ادیبوں اور شاعروں سے نوک جھوک' شکوہ شکایت اور کینہ پروری سے وہ بالکل بے داغ ہیں۔ ان کا انداز ہمیشہ جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے' بڑا شریفانہ ہے' جو ان کی کریم النفسی کی دلیل ہے۔ اس معاملے میں ان کی مثال شاید ہی ملے۔ وہ ہر ادیب کی دل کھول کر داد کمال دیتے ہیں' چاہے' حریف ان کے کتنے ہی رشک کیوں نہ کرتے ہوں۔ مولانا ذکاء اللہ کی "تاریخ ہندوستان" مولانا آزاد کی "آب حیات" اور نیرنگ خیال' مولانا شبلی کی "سیرۃ النعمان"' مولوی سید احمد کی "فرہنگ آصفیہ" وغیرہ کتابوں پر جو تبصرے انہوں نے لکھے' سب میں مولانا کی کشادہ دلی اور وسعت مشرب پائی جاتی ہے۔ مولانا شبلی کی "سیرۃ النعمان" پر تبصرہ لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہیں' ہم کو یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ مصنف کی رائے جزئیات مسائل میں فی نفسہ کیسی ہے' کیونکہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے' نہ ریویو لکھنے والے کا' بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ کتاب کا عنوان بیان کیا ہے؟ تہذیب کیسی ہے؟ طریق استدلال مذاق وقت کے موافق ہے یا نہیں؟ اور کتاب لکھنے کی جو

غایت مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہئے' یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے' وہ اس سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں؟"

مولانا حالی کے تمثیلی مضامین میں سے ایک مضمون کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"زبان گویا' اے میرے بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیریں بیاں! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے کہ تیرنے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک مزا ہے؟ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے' جس کی سحر کارانہ جادو کا اتار' کبھی تو ایک افعی جان گداز ہے' جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیر کا جی لبھاتی تھی' اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے' جو جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی' اور کہیں اپنی تیزی سے دلوں کو فگار۔

اے زبان! تو دیکھنے میں ایک پارہ گوشت کے سوا کچھ نہیں' مگر طاقت تیری نمونہ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ' اس طاقت کو رائیگاں نہ کھو' اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے' اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے' اور روح کی ایلچی' دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیئے نہ چڑھا۔ اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے' اور تیری خدمت ممتاز' کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز' علم ایک خزانہ غیبی ہے' اور دل اس کا خزانچی' حوصلہ اس کا قفل ہے' اور تو اس کی کنجی' دیکھ' اس قفل کو بے اجازت نہ کھول' اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے' اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ مذہب عالی تجھ سے چھن جائے گا' اور تیری بساط وہی ایک گوشت کا چھچھڑا رہ جائے گی۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے' اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے؟ نہیں ہرگز نہیں! اگر تو سچی زبان ہے' تو زبان ہے' ورنہ زبوں ہے' بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے' تو شہد فائق ہے' ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور اوران کے دلوں میں جگہ پائے گی' ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔"

۹۔ **مکتوبات حالی:** مولانا حالی کی تصنیفات و تالیف کے سلسلے میں "مکتوبات حالی" کا بھی ذکر

ضروری ہے۔ ان کے خطوط ۱۹۲۵ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئے۔ مولانا حالی جیساکہ پہلے بھی کئی مرتبہ ذکر آیا ہے، بہت ہی صاف دل اور پاک طبیعت کے انسان تھے۔ ان کے یہ خطوط بھی ان اوصاف حمیدہ کے آئینہ دار ہیں۔ ان خطوط کے بارے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق "مقدمہ مکتوبات" میں لکھتے ہیں :

"خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا انداز ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوسکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب عالیہ سے بلکہ اکثرت اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے، اسی طرح قلم سے ٹپ پڑتا ہے۔ نہیں، بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے اور اگر وہ دل ایسا ہو، جو سراسر درد سے لبریز ہو، جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو، تو بتاؤ کہ اس دل کی تراوش کیسی ہوگی، اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو، تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔"

ایک خط کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ وہ اپنی پوتی کو لکھتے ہیں :

"تمہارا خط عین انتظار میں پہنچا۔ اس کو پڑھ کر سب کا جی بے انتہا خوش ہوا اور تمہاری پھوپھی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ تم نے اتنی دور جا کر اپنی محبت سب کے دل میں بہت بڑھا دی ہے۔ تمہاری دادی ہر وقت تمہاری صحت و سلامتی کی دعا کرتی رہتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہاں رہنے سے تمہاری صحت اچھی ہو جائے گی۔ کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کے آؤ کہ یہاں تمہیں کوئی پہچان نہ سکے، اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی ہوں۔"

ایک خط بھائی فیاض حسین کے مکان کے پتے سے دادی بہو کے نام بھی بھیجا اور اس میں یہ لکھا کہ مجھے چلتے وقت آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہے، روانگی کے دن میرا ارادہ آپ کے پاس آنے کا تھا، مگر اتنی فرصت کسی نے نہ لینے دی۔"

اس خط میں مولانا حالی کی دلی محبت اور ہمدردی کے ساتھ ساتھ ذرا سی ظرافت کی چاشنی بھی مل جاتی ہے، اور مولانا خط ختم کرتے کرتے اپنی پوتی کو بڑی شفقت کے ساتھ اخلاق کی بھی تعلیم دے رہے ہیں۔

تبصرہ

مولانا حالی ایک بلند پایہ شاعر بھی ہیں' اور عظیم المرتبت نثر نگار بھی۔ بحیثیت شاعر اردو ادب میں ان کی کیا پوزیشن ہے' اس پر ہم اس کتاب کے حصہ نظم میں بحث کریں گے۔ اس وقت ہماری بحث صرف ان کی اردو نثر تک محدود ہے۔

مولانا حالی اس زمانہ اور ان بدلتے ہوئے حالات کی پیداوار ہیں' جب کہ ہماری سیاسی اور معاشرتی زندگی ایک نئی کروٹ لے رہی تھی' اور ہر طرف سے بڑی تیزی کے ساتھ "آگے بڑھو" "آگے بڑھو" کی صدائیں آ رہی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا' جب برصغیر میں صدیوں کی پرانی شہنشاہیت کی جگہ ایک نئی ترقی یافتہ قوم بڑی شان و شوکت کے ساتھ فاتحانہ انداز میں اپنا اقتدار قائم کر چکی تھی' اور یہاں کی زندگی اور معاشرہ کا قدیم نظام درہم برہم ہوچکا تھا۔ یہ وہ وقت تھا' جب کہ مصلح قوم سرسید احمد خان اپنی دور اندیشی سے نئی زندگی سے اپنا ربط ضبط قائم کرنے میں مصروف تھے۔ مولانا حالی میں یہ صلاحیت تو موجود تھی کہ درماندہ قوم کو پیغام حیات سنائیں' اور خفتہ و خوابیدہ زندگی کو بیداری کے لیے اکسائیں' مگر کسی کی راہنمائی اور رہبری کی ضرورت تھی۔ سرسید نے ان کی دستگیری کی اور اپنی صلاحیت کو بروئے عمل لانے کی صلاح دی۔ ان کے کہنے پر انہوں نے "مسدس لکھ کر قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد وہ قومیت کے جذبے سے سرشار ہو کر مسلسل لکھتے رہے۔ ادب ہماری زندگی کا بڑا اہم جز ہے۔ مولانا حالی نے سب سے زیادہ اس میں اصلاح لانے پر زور دیا۔ انہوں نے "مقدمہ شعر و شاعری" لکھ کر ہمارے شعری سرمایہ کو پاک کرنے کے راستے بتائے' اور آسان' سلیس اور عام فہم زبان میں مضامین لکھ کر اردو نثر کو نئی جان بخشی۔ یہ کام سرسید اور ان کے دوسرے رفقائے کار بھی انجام دے رہے تھے' لیکن مولانا حالی کی روش ذرا جداگانہ تھی۔ ان کا عمل دوسرے رفقائے کار کی سرگرمیوں کے مقابلے میں سرسید کے مشن سے زیادہ قریب تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد' مولانا شبلی وغیرہ نے سرسید کے مشن کو کامیاب بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت کو قائم رکھا' لیکن مولانا حالی ان کے مقابلے میں سرسید کے پروگرام سے سو فی صدی ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مولانا حالی پر سرسید کا اثر جتنا زیادہ رہا' ان کے ہم عصروں میں سے کسی پر بھی اتنا نہ تھا۔ مولانا حالی کی تمام تحریریں اس کی شاہد ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا حالی اردو ادب میں ایک انفرادی شان اور ایک جدا گانہ شخصیت قائم نہ کر سکے۔ اردو نثر میں ان کا طرز سرسید کے طرز سے بہت زیادہ قریب ہے۔ سرسید کی پرانی تحریریں چھوڑ کر بعد کی نگارشات حالی کی نثر سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے لیے اور ان کا

لب و لہجہ سرسید کے مقابلے میں ذرا نرم اور ذرا مدھم ہے۔ سرسید کا جوش بیان ان میں اتنا نہیں پایا جاتا۔ بقول مولانا حامد حسن قادری: "مولانا حالی واقعی مولانا تھے۔ صاحب دل' درویش مزاج' خاموش' متین۔ ان کے علم و فضل میں وسعت اور ذہن و فکر میں روشنی تھی' لیکن دل اور مزاج میں گرمی اور تیزی نہ تھی۔ انہوں نے غورو فکر کے ساتھ اردو زبان و ادب کا جائزہ لے کر' اس کی خامیوں کو دیکھ کر' ضرورتوں کو سمجھ کر' دوسری زبانوں سے مقابلہ کرکے جدید موضوعات کی کتابیں لکھ دیں' لیکن وہ اپنی تحریر و اسلوب کے لیے کوئی روش خاص پیدا نہ کرسکے۔ صاحب طرز بننے کے معنی ہیں' تقلید چھوڑ کر موجد بننا' موجودہ روش سے بغاوت کرنا اور اپنی راہ الگ نکالنا۔(٦)

مولانا حالی میں ان باتوں کی کمی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریر میں سرسید کی تقلید سے پوری طرح آزاد نہیں ہیں۔ وہ لکھتے لکھتے سرسید کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ: "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" حالی اور سرسید میں بعض باتوں میں مماثلت اور مشابہت رہنے کے باوجود بہت سی باتیں بھی ہیں' جو سرسید میں موجود نہیں ہیں۔

سرسید کے اسلوب تحریر کی مندرجہ ذیل تین خصوصیات حالی کے اسلوب میں پائی جاتی ہیں:

۱۔ سادگی۔

۲۔ منطقیت۔

۳۔ اظہار خیال میں بے تکلفی۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: ان تین امور میں وہ سب رفقا کے مقابلے میں سرسید سے زیادہ قریب ہیں' تاہم دونوں کے اسلوب کا باہمی فرق' باہمی مماثلت و مشابہت کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔ سرسید کے بیان کی سادگی بے رنگ اور کرخت سادگی ہے' مگر حالی کا بیان سادہ ہونے کے باوجود لطافت اور نفاست کا عنصر اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ سرسید کی تحریر میں منطقیت کا زور زیادہ ہے۔ حالی کے ہاں اس کی گرفت اتنی مضبوط نہیں ہے۔ ان کے ہاں شاعرانہ رمزیت اور ابہام کے لطیف عناصر موجود ہیں۔ سرسید میں ان چیزوں کا فقدان ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ سرسید کے بیان میں "بدویت" اور کھردرا پن پایا جاتا ہے۔ حالی کی تحریر میں یہ بات نہیں ہے۔ سرسید بعض اوقات الفاظ کے انتخاب میں اس قدر بے نیاز معلوم ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مولانا حالی اس معاملے میں بہت محتاط ہیں۔ لفظوں کی آرائش و زیبائش پہ ان کی نظر رہتی ہے۔ (۷)

مولانا حالی اپنی فطری سادگی اور متانت کی وجہ سے ایک صاحب طرز ادیب قرار نہیں پاسکے'

لیکن اس کے باوجود ان کی زبان کا اثر مابعد کے لوگوں پر پڑا ہے۔ بہت سے لوگ حالی کی سادگی' متانت اور رکھ رکھاؤ کو بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' بلکہ بعض لوگ اس پر مصر ہیں۔ مولانا صاحب طرز ادیب ہیں لیکن ہم مولانا حامد حسن قادری سے اتفاق کرتے ہیں' جب وہ لکھتے ہیں : "مولانا حالی کی تحریروں میں موضوع و مضمون کی جدت و بیان کی جدت و بیان کی صداقت' زبان کی صحت' اسلوب کی صفائی' دلائل کی قوت' تمثیلات کی برجستگی سب کچھ ہے' اور اکثر بے عیب ہے' بلکہ بعض جگہ نادر و جدید بھی ہے' لیکن ان کی عبارت پڑھنے سے ادبی مسرت حاصل نہیں ہوتی' انشاء پردازی کا نشاط و اہتزاز پیدا نہیں ہوتا۔(۸) مولانا حالی کی طرز نگارش تاریخ نگاری یا بیانیہ مضامین کے لیے زیادہ موزوں ہے' جہاں صرف دعا نگاری یا واقعہ نگاری سے زیادہ واسطہ ہوتا ہے۔ جذبات و واردات قلبی کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ اس میں لطافت اور حسن بیان کی اتنی اہمیت ہے۔

حواشی

۱۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۶۱۷۔

۲۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۶۱۷۔

۳۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۶۱۷۔

۴۔ حیات سعدی کے سنہ تصنیف کے بارے میں اختلاف ہے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ مولانا حالی نے یہ ۱۸۸۲ء میں لکھی' البتہ ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۶۱۷۔

۶۔ یہ اعظم گڑھ کے "معارف" کے علاوہ ہے' جو مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے علی گڑھ سے جاری کیا تھا۔

۷۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۶۳۷- ۶۳۸

۸۔ ماخوذ از سرسید احمد خان اور ان کے رفقا' صفحہ ۱۱۰۔

مولانا شبلی نعمانی

حالات زندگی : مولانا شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانے میں بمقام بندول، ضلع اعظم گڑھ پیدا ہوئے۔ خاندانی سلسلہ سراج الدین نامی ایک نومسلم راجپوت سے ملتا ہے۔ خاندان عزت و نیک نامی اور علم و دینداری میں ممتاز تھا۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مولوی شکر اللہ سے حاصل کی۔ پھر غازی پور جاکر مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی سے کسب فیض کیا۔ مولانا فاروق وہاں مدرسہ چشمہ رحمت میں صدر مدرس تھے۔ عربی، فارسی اور علوم عقلیہ کے بڑے جید عالم تھے۔ انہوں نے مولانا شبلی کی ذہانت اور صلاحیت دیکھ کر ان کی طرف خاص توجہ دی۔

مولانا شبلی نعمانی غازی پور میں تعلیم مکمل کر کے مزید تعلیم کے لیے رام پور اور مولانا ارشاد حسین سے فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد رام پور سے لاہور پہنچے، اور مولانا فیض الحسن، پروفیسر ادبیات عربی، اورینٹل کالج سے عربی پڑھی۔ چھ مہینے کے بعد لاہور سے سہارنپور کا سفر کیا اور مولانا احمد علی محدث سے حدیث پڑھی۔ مولانا شبلی اپنی تعلیم کے سلسلے میں خود لکھتے ہیں :

"میں اس خصوصیت میں منفرد تھا کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصول فقہ کے لیے ان ہی علما کے پاس سفر کر کے گیا، جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے۔"

مولانا شبلی نے ۱۸۷۶ء میں ۱۹ سال کی عمر میں اپنے بعض اعزہ کے ساتھ حرمین شریفین کا سفر کیا۔ حجاز سے واپس آکر کتب بینی اور شعر و شاعری کا چرچا کرنے لگے۔

مولانا شبلی نے والد کے اصرار پر وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ وکالت شروع کی، مگر اس پیشہ کی جو خرابیاں ہیں، ان سے بددل ہو کر وہ پیشہ چھوڑ دیا۔ وکالت میں کذب و افترا کے بغیر کام نہیں چلتا۔ مولانا شبلی جیسے عالم متبحر کو وہ کیسے گوارا ہوتا۔ وکالت چھوڑ کر انہوں نے امین دیوانی کی ملازمت اختیار کرلی۔ اس میں دورے کا کام ہوتا تھا۔ مولانا روزے کی حالت میں گرمی

کے موسم میں گھوڑے پر سوار ہو کر گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اس لیے چند ہی روز میں اس نوکری سے بھی دل برگشتہ ہوگئے' اور استعفیٰ دے کر گھر بیٹھ گئے۔ اب سوائے پڑھنے لکھنے کے کام کے اور کوئی کام نہ رہا۔

اکتوبر ۱۸۸۲ء میں مولانا شبلی اپنے والد کو ساتھ لے کر اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے ملنے علی گڑھ گئے۔ سرسید کے بارے میں عربی میں ایک قصیدہ لکھا' جس سے ممدوح بہت متاثر ہوئے۔ سال ڈیڑھ سال بعد جنوری ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج میں اسسٹنٹ عربک پروفیسر کی ایک جگہ خالی ہوئی تو مولانا شبلی نے اپنے پرانے استاد مولانا فیض الحسن کی سفارش کے ساتھ ایک درخواست بھیج دی۔ خود بھی جا کر خان بہادر عبدالکریم' ڈپٹی کلکٹر اور سمیع اللہ خان کے توسط سے سرسید سے ملے۔ درخواست منظور ہوگئی' اور ان کو چالیس روپیہ تنخواہ پر مقرر کر لیا گیا۔ بعد میں ترقی کر کے عربی کے پروفیسر ہوگئے' اور تنخواہ بھی سو روپیہ ہوگئی۔ مولانا شبلی نے علی گڑھ میں کچھ دن تو ادھر ادھر قیام کیا' لیکن جب سرسید سے ان کا ربط ضبط بڑھا' اور دونوں ایک دوسرے کی قابلیت سے متاثر ہوئے' تو سرسید نے ان کو ایک بنگلے میں' جو ان کی کوٹھی سے قریب تھا' جگہ دے دی۔ (۱)

علی گڑھ کالج کے زمانہ قیام میں مولانا شبلی کے پروفیسر آرنلڈ سے بھی مراسم پیدا ہوئے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے فیض حاصل کیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے مولانا شبلی سے عربی پڑھی اور مولانا شبلی نے ان سے فرنچ اور شاید انگریزی سیکھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت متاثر تھے۔ پروفیسر آرنلڈ کو مولانا شبلی کی بدولت مشرقی علوم کی تہہ تک پہنچنے کا موقع ملا' اور مولانا شبلی کو پروفیسر آرنلڈ کی وساطت سے مغرب کے جدید علوم اور خیالات سے آگاہی ہوئی۔

مولانا شبلی کو "الفاروق" کی تدوین کے سلسلے میں ایک عرصے سے اسلامی ممالک کے کتب خانوں سے استفادہ کرنے کا شوق تھا' کچھ آب و ہوا کی تبدیلی کا بھی خیال تھا۔ ۱۸۹۲ء میں پروفیسر آرنلڈ اپنے وطن ولایت جانے لگے' تو وہ بھی ان کے ہمراہ ہوگئے۔ مولانا نے مصر' شام' روم اور قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ قسطنطنیہ کے زمانہ قیام میں وہ مولانا عثمان پاشا سے ملے' جن کے ذریعے سے انہیں سلطان عبدالحمید خان شہنشاہ ترکی سے تمغہ مجیدی ملا۔ اس علمی سفر سے مولانا علی گڑھ واپس آئے۔ تو سرسید کی تحریک پر انہیں حکومت برطانیہ سے شمس العلما کا اعزازی خطاب ملا۔

مولانا شبلی علی گڑھ میں مئی ۱۸۹۸ء تک رہے۔ اس کے بعد چھ مہینے کی رخصت لی اور اعظم گڑھ آ کر رہنے لگے۔ پھر استعفیٰ دے دیا' وہ علی گڑھ سے کچھ بددل ہوگئے تھے۔ اسی سال تبدیلی آب و ہوا کے لیے وہ کشمیر گئے' لیکن وہاں جا کر علیل ہوگئے۔ اس زمانہ علالت میں انہوں

نے "الفاروق" مکمل کی۔ صحت یاب ہوئے تو مولوی سید علی بلگرامی نے انہیں حیدر آباد بلا کر "نظامت علم و فنون" کا عہدہ دلوایا۔ حیدر آباد میں وہ چار سال رہے، اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۸۹۴ء میں مولوی عبدالغفور، ڈپٹی کلکٹر کی سرکردگی میں چند علما نے مل کر "ندوہ العلما" کے نام سے ایک انجمن بنائی، جس کا مقصد یہ تھا کہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم میں اصلاح کی جائے۔ علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کرنے کے بعد مولانا شبلی اس انجمن سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں ان کی رائے کے مطابق ایک مدرسہ بھی جاری کر دیا گیا تھا۔ حیدر آباد سے واپس آئے تو مولانا اس انجمن کے ناظم ہوگئے۔ انہوں نے اس کی بڑی خدمت کی، اور اس کو ٹوٹنے سے بچا لیا لیکن دوسرے علما چونکہ مولانا کے مذہبی خیالات سے مطمئن نہ تھے، اس لیے بددل ہو کر ۱۹۱۳ء میں اس سے علیحدہ ہوگئے۔ ندوہ کے زمانہ قیام میں ان کے ساتھ ایک المناک حادثہ پیش آیا۔ وہ کچھ دنوں کے لیے اعظم گڑھ آئے ہوئے تھے۔ اتفاقیہ بندوق چل جانے سے ان کا پاؤں زخمی ہوگیا، جس کے سبب ان کی ٹانگ کاٹنی پڑی۔

ندوۃ العلما سے کنارہ کشی اختیار کر لی، تو وہ لکھنؤ سے اعظم گڑھ آ گئے، اور شہرہ آفاق علمی ادارہ دارالمصنفین قائم کیا۔ اس انجمن کے لیے انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اپنا مکان، باغ، کتب خانہ سب اس کی نذر ہوگئے لیکن مولانا اس کی تکمیل و ترقی تک زندہ نہ رہ سکے۔ ان کے قابل شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقا نے اس کو ایک اعلیٰ درجے کا ادارہ بنایا۔ اس ادارے نے اسلام اور اسلامیات پر اتنا عظیم الشان لٹریچر پیدا کیا کہ شاید ہی اور کسی ادارے نے کیا ہو، یہ مولانا شبلی کی نیک نیتی اور بے لوث قربانیوں کا نتیجہ ہے۔

مولانا شبلی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں ہوا۔

ادبی زندگی: سرسید کے رفقائے کار میں مولانا شبلی کا درجہ بہت بلند ہے۔ ان کی زندگی اسلامی رنگ میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ خود سرسید بھی اس معاملے میں ان سے پیچھے تھے۔ مولانا شبلی سرسید کی صحبت میں آکر قومیت کے جذبے سے سرشار تو ہوئے، لیکن انہوں نے اپنی شخصیت کو سرسید کی شخصیت سے الگ رکھا۔ بعض دوسرے رفقائے کار کی طرح وہ فنا فی السید نہیں ہوئے۔ یہی ان کی خاص خصوصیت ہے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں بھی کم و بیش یہی رنگ قائم ہے اور ان میں مولانا شبلی کے اپنے خط و خال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ذیل میں ان کی تصنیفات و تالیفات کا جائزہ مختصر طور پر لیا جاتا ہے:

۱۔ المامون: یہ مولانا شبلی کی پہلی مستقل تصنیف ہے۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کے لیے اپنا یہ لائحہ عمل بنایا کہ "نامور فرمان روایان اسلام کی سوانح عمریاں مرتب کریں، اور انگریزیت

کی تقلید میں اس سلسلے کا نام انہوں نے "رائل ہیروز آف اسلام" رکھا۔ (۲) "المامون" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب انہوں نے علی گڑھ کالج کے زمانہ ملازمت میں لکھی ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ سے چھپ کر شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ چند ہی مہینے میں اس کی تمام جلدیں فروخت ہوگئیں۔ اس لیے اس سال دوبارہ چھاپی گئی۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں خلافت عباسیہ کے قیام کا حال اور مامون الرشید خلیفہ ششم کے زمانے تک کی خانہ جنگیاں بیان کی گئی ہیں، اور دوسرے حصے میں انتظام سلطنت اور اس کی جزئیات بہت تلاش و تحقیق کے بعد جمع کی گئی ہیں۔ المامون کی خصلت، اس کی سوشل حالت اور اس کی پرائیویٹ زندگی اور مشغلوں پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے (۳) "المامون" کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"اس سال ایک عجیب تقریب سے طاہر کو اپنے کارہائے نمایاں کا مناسب صلہ ملا، یعنی وہ مشرقی حکومت پر، جس کی حدود دارالخلافہ بغداد سے شروع ہو کر سندھ تک منتہی ہوتی ہے، نائب السلطنت مقرر ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک رات طاہر ماموں کی بزم عیش میں حاضر ہوا۔ مامون بادہ نوشی کے مزے لے رہا تھا۔ بے تکلفی میں اس نے دو پیالے طاہر کو بھی مرحمت کیے، اور اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی۔ طاہر نے باادب عرض کیا کہ میرا منصب اس عزت کا مستحق نہیں ہے۔ ماموں نے کہا، یہ قیدیں دربار عام کے لیے مخصوص ہیں۔ بے تکلفی کے جلسوں میں اس قسم کے قواعد کی پابندی ضروری نہیں۔ طاہر آداب بجا لا کر بیٹھ گیا۔ مامون نے اس کی طرف نگاہ کی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ طاہر نے عرض کی کہ اب کیا آرزو باقی رہی ہے، جس کا حضور رنج کرسکتے ہیں۔ مامون نے کہا کچھ ایسی بات ہے، جس کے پوشیدہ رکھنے میں تکلیف، اور ظاہر کرنے میں ذلت ہے۔ طاہر اس وقت تو چپ ہو رہا، مگر دل میں خلش پیدا ہوئی کہ آخر کیا بات ہے۔ حسین جو ماموں کا ساقی اور قدیم خاص تھا، طاہر نے اسے دو لاکھ درہم نذر بھیجے اور درخواست کی کہ اس دن کے واقعے کا سبب دریافت کرو، جس نے موقع پا کر پوچھا۔ ماموں نے کہا اگر یہ بات آگے بڑھی تو سر اڑا دوں گا۔ سچ یہ ہے کہ جب طاہر میرے سامنے آتا ہے تو بھائی امین کا ذلت و بے کسی سے مارا جانا یاد آ جاتا ہے۔ میرے ہاتھ سے ضرور کسی دن طاہر کو گزند پہنچے گا۔ طاہر کو یہ بات معلوم ہوئی تو احمد بن ابی خالد الاحول کے پاس گیا (حسن بن سہیل کے بعد وزیر مقرر ہوا تھا) اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں، اور میرے ساتھ بھلائی کرنی فائدے سے خالی نہیں۔ میں صرف تم سے اتنا چاہتا ہوں کہ مامون کی آنکھ سے دور رہوں۔ احمد بن خالد نے اس کا ذمہ لیا اور دوسرے دن صبح کے وقت ماموں کے پاس حاضر ہوا۔"

"المامون" کے طرز بیان کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں:

"اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے' مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو' دونوں کو برباد کرتا ہے۔

ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے' اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے' اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے (۵) تاہم مولانا حامد حسن قادری سے اس بات پر اتفاق ہے کہ "مولانا کی بعد کی تصانیف کے مقابلے میں اس کتاب کا اسلوب زیادہ پختہ اور منجھا ہوا نہیں ہے۔" "المامون" ان کی پہلی تصنیف تھی۔ اس لیے زبان و بیان کی زیادہ پختگی کی توقع بھی عبث ہے۔

۲۔ سیرت النعمان: مولانا شبلی کی دوسری تصنیف "سیرت النعمان" ہے یہ امام ابوحنیفہ کی سوانح عمری ہے۔ ۱۵ دسمبر ۱۸۹۳ء کو علی گڑھ میں اس کو ختم کیا۔ مولانا مذہباً" حنفی تھے' اور وہ بھی کٹر حنفی۔ اس لیے امام ابوحنیفہ سے ان کی جو عقیدت تھی' وہ ظاہر ہے "سیرت النعمان" ان کی اسی بے پناہ عقیدت کا مظہر ہے۔ "المامون" کی طرح اس کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک میں امام صاحب کے ذاتی حالات اور فضائل بیان کئے گئے ہیں' اور دوسرے میں ان کے اصول فقہ اور علم کلام سے بحث کی گئی ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا' امام ابوحنیفہ سے عداوت رکھتا تھا۔ ایک دن امام صاحب حسب الطلب دربار میں گئے۔ ربیع بھی حاضر تھا۔ منصور سے کہا کہ حضور یہ شخص امیرالمومنین کے بزرگوار (عبداللہ بن عباس) کی مخالفت کرتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے' اور دو ایک روز کے بعد انشاء اللہ کہہ لے تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائے گا' اور قسم کا پورا کرنا کچھ ضرور نہ ہوگا۔ ابوحنیفہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انشاء اللہ کا لفظ قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزو قسم سمجھا جائے گا' ورنہ لغو اور بے اثر ہے۔ امام صاحب نے کہا' امیرالمومنین' ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کا کچھ اثر نہیں۔ منصور نے کہا کیونکہ امام صاحب نے کہا' ان کا گمان ہے کہ جو لوگ دربار میں آپ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرتے ہیں' اور قسم کھاتے ہیں' گھر پر جاکر انشاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں' جس سے قسم بے اثر ہو جاتی ہے' اور ان پر شرعاً" کوئی مواخذہ نہیں

رہتا۔ منصور ہنس پڑا اور ربیع سے کہا کہ تم ابو حنیفہ کو نہ چھیڑا کرو' ان پر تمہارا داؤ نہیں چل سکتا۔ امام صاحب دربار سے نکلے' تو ربیع نے کہا' آج تو آپ میری جان ہی لے چکے تھے۔ فرمایا' یہ تو تمہارا ارادہ تھا۔ میں نے صرف مدافعت کی۔"

۱۔ **الفاروق:** مولانا شبلی نے "الفاروق" کی تالیف مستقل طور پر ۱۸ اگست' ۱۸۹۴ء میں شروع کی' اور پورے چار سال کے بعد کشمیر کے سفر میں ۱۵ جولائی ۱۸۹۸ء میں پایہ تکمیل کو پہنچائی۔ مولانا نے اپنی اس قسم کی تالیفات کے لیے ایک خاص طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ یعنی ان کے دو دو حصے کئے "الفاروق" میں بھی ایسا ہی کیا۔ ایک حصے میں حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی کے واقعات اور فتوحات ملکی کے حالات اور دوسرے میں ملکی انتظامات اور ذاتی کمالات بیان کئے گئے۔ دوسرا حصہ ہی اصل میں ان کی اس قسم کی کتابوں کی جان ہوتا ہے۔ "الفاروق کے دوسرے حصے کے بارے میں خود رقم طراز ہیں: "یہی دوسرا حصہ مصنف کی سعی و محنت کا تماشا گاہ ہے۔ (۶) مولانا شبلی کی "الفاروق لاجواب کتاب ہے۔ اردو میں کیا' کسی زبان میں بھی اس پائے کی کتاب موجود نہ تھی۔ اس کے بعد اردو میں دوسرے علما نے حضرت عمر فاروق پر چھوٹی بڑی کئی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ لیکن سب مولانا شبلی کے زلہ خوار معلوم ہوتے ہیں۔ حالات و واقعات کی سچائی سے قطع نظر زبان و بیان کے لحاظ سے اس میں جو خوبیاں ہیں' وہ اور کسی کتاب میں نہیں ہیں۔ مولانا شبلی کو شہرت دوام بخشنے میں "الفاروق" کا کافی حصہ ہے۔ اس کی عبارت کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> "اب بہادروں کو حوصلہ آزمائی کا موقع ملا' اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گرج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی' چنانچہ اسی مناسبت سے اس معرکے کو "لیلتہ الہدیر" کہتے ہیں۔ ایرانیوں نے فوج نئے سرے سے ترتیب دی۔ قلب میں اور دائیں بائیں تیرہ تیرہ صفیں قائم کیں۔ مسلمانوں نے بھی تمام فوج کو سمیٹ کر یک جا کیا اور آگے پیچھے تین پرے جمائے۔ سب سے آگے سواروں کا رسالہ۔ ان کے بعد پیدل فوجیں اور سب سے پیچھے تیر انداز۔ سعد نے حکم دیا تھا کہ تیسری تکبیر پر حملہ کیا جائے لیکن ایرانیوں نے جب تیر برسانے شروع کئے تو قعقاع سے ضبط نہ ہو سکا' اور اپنے رکاب کی فوج لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ فوجی اصول کے لحاظ سے یہ حرکت نافرمانی میں داخل تھی' تاہم لڑائی کا ڈھنگ اور قعقاع کا جوش دیکھ کر سعد کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اللھم اغفر لہ وانصرہ یعنی اے خدا' قعقاع کو معاف کرنا اور اس کا مددگار رہنا۔ قعقاع کو دیکھ کر بنو اسد اور بنو اسد کی دیکھا دیکھی نخع' بحیلہ' کندہ

سب ٹوٹ پڑے۔ سعد ہر قبیلے کے حملے پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اس کو معاف کرتا اور یاور رہتا۔ اول اول سواروں کے رسالے نے حملہ کیا لیکن ایرانی فوجیں، جو دیوار کی طرح جمی کھڑی تھیں، اس ثابت قدمی سے لڑیں کہ گھوڑے آگے نہ بڑھ سکے۔ یہ دیکھ کر سب گھوڑوں پر سے کود پڑے اور پیادہ حملہ آور ہوئے۔"

۴۔ **سفر نامہ روم و مصر و شام:** یہ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، مولانا شبلی کے سفر روم و مصر و شام کی سرگزشت ہے۔ یہ سفر انہوں نے ۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء کو اختیار کیا تھا اور چھ مہینے میں ختم کیا تھا۔ اثنائے سفر میں، جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، پروفیسر آرنلڈ بھی ساتھ تھے، لیکن وہ مولانا کو راستہ میں ہی چھوڑ کر ولایت جانے کے لیے آگے بڑھ گئے۔ یہ کتاب مولانا کا کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں ہے۔ اس میں ایک طالب العلمانہ تلاش اور جستجو پائی جاتی ہے۔ سفر بھی بجائے خود ایک طالب العلمانہ سفر تھا۔ اس میں مولانا نے ہر چیز ایک طالب علم کی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس میں دوسری جزوی باتوں کے علاوہ قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس، قاہرہ وغیرہ سے متعلق اجمالی حالت، ان کے قابل دید مقامات، مشہور عمارات، سررشتہ تعلیم، دارالعلوم اور مدارس، بورڈنگ اور طلبہ کی تربیت، تعلیم نسواں، مصنفین اور تصنیفات، کتب خانے، اخبارات اور رسالے، مشہور پاشاؤں اور ارباب کمال کی ملاقات، ترکوں اور عربوں کے اخلاق و عادات تو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے(۷) اس کی عبارت کا ایک مختصر نمونہ ملاحظہ ہو:

"عدن سے چونکہ دلچسپی کے نئے سامان پیدا ہوگئے تھے، اس لیے ہم بڑے لطف سے سفر کر رہے تھے لیکن دوسرے ہی دن ایک پرخطر واقعہ پیش آیا، جس نے تھوڑی دیر کے لیے مجھ کو سخت پریشان رکھا۔ مئی کی صبح کو میں سونے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے، اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بیکار ہوگیا تھا، اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے! بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے، تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے، اور ایسے قابل قدر وقت کو رائیگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے۔ ان کے استقلال

اور جرات سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا۔ آٹھ گھنٹے کے بعد انجن درست ہوا اور بدستور چلنے لگا۔"

۵۔ **الغزالی:** یہ کتاب مولانا نے حیدر آباد کے زمانہ قیام میں دسمبر ۱۹۰۱ء میں ختم کی۔ عالم اسلام میں امام غزالیؒ کی جو عظمت' بزرگی اور شہرت ہے' وہ سب کو معلوم ہے۔ انہوں نے اپنی گراں بہا تصنیفات کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے' وہ عدیم النظیر ہے۔ اس لیے مشاہیر اسلام کی سوانح عمریاں لکھنے میں مولانا شبلی کی نگاہ انتخاب ان پر پڑنی لازمی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان پر لکھا اور لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ "الغزالی" کی عبارت کا مختصر نمونہ درج ذیل ہے:

"امام صاحب کے زمانے تک یہ دستور تھا کہ فلسفہ اور متعلقات فلسفہ پر جس قدر کتابیں لکھی جاتی ہیں' عموماً پیچیدہ اور دقیق عبارت میں لکھی جاتی تھیں' اور بو علی سینا نے تو فلسفہ کو گویا طلسم بنا دیا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ فلسفہ کے مسائل خود دقیق ہوتے تھے' کچھ یہ کہ یونانیوں کے زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ فلسفہ کو عام فہم نہ کرنا چاہئے' کچھ یہ کہ اکثر لوگ یہ قابلیت ہی نہ رکھتے تھے کہ پیچیدہ مطالب کو آسان عبارت میں ادا کر سکیں۔ فلسفہ کی اور اقسام کی بہ نسبت فلسفہ اخلاق آسان اور سریع الفہم ہے' تاہم اخلاق پر جو بھی کتابیں لکھی گئی تھیں' مثلاً "کتاب الطہارت ابن مسکویہ" اشکال سے خالی نہ تھیں۔ امام صاحب پہلے شخص ہیں' جنہوں نے فلسفہ اخلاق کے مسائل اس طرح ادا کئے کہ دقیق سے دقیق نکتے افسانہ اور لطائف بن گئے۔ ایک ہی مضمون کو "کتاب الطہارت اور "احیا العلوم" دونوں دیکھو۔ "کتاب الطہارت میں غور و فکر اور خوض سے کام لینا پڑے گا' اور باوجود اس کے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کتاب کا مطلب تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ "احیا العلوم" میں یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ تم کوئی علمی کتاب پڑھ رہے ہو۔ تم قصے کی طرح پڑھتے چلے جاؤ گے' اور مضمون کی نسبت صرف یہی نہیں کہ تم اس کو سمجھ جاؤ' بلکہ دل پر اس کی کیفیت طاری ہوگی' اور تم سراپا اثر میں ڈوب جاؤ گے۔"

۶۔ **علم الکلام:** اس میں مولانا شبلی نے علم الکلام کی تاریخ کے ساتھ یہ اسباب دریافت کئے کہ یہ علم کیوں ایجاد ہوا۔ اس کے بانی اول کون ہے۔ اس کی ترقی کیسے ہوئی۔ مولانا کی یہ کتاب اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے' مگر آج کل لوگوں کو علم الکلام سے دلچسپی باقی نہیں رہی۔ اس لئے مولانا کی وہ کتاب بھی طاق نسیان کی نذر ہوئی۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"علم کلام نے اگرچہ بارہ سو برس کی عمر پائی' لیکن کمال کے رتبہ تک نہ پہنچ سکا- پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کو سخت مخالفت سے سامنا ہوا- تمام محدثین' بلکہ آئمہ مجتہدین (بجز امام ابوحنیفہؒ کے) اس کے دشمن بن گئے- دولت عباسیہ کی حمایت کی بدولت وہ برباد ہونے سے بچ گیا' لیکن مقبول عام نہ ہوسکا' جو محدود فرقہ اس کا طرفدار تھا' اور اس کو ترقی دینا چاہتا تھا' وہ اعتزال کے نام سے بدنام تھا- اہل سنت و جماعت مدت کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئے' لیکن وہ فلسفہ و عقلیات سے آشنا نہ تھے- کیونکہ اس گروہ میں اب تک فلسفہ تو فلسفہ' منطق کا سیکھنا بھی ناجائز تھا- امام غزالی نے جرات کر کے منطق کو مذہبی گروہ میں روشناس کیا- اتنے تعلق سے فلسفہ کو بھی اس بزم میں باریابی ہوئی- فلسفہ اور عقلیات کی آمیزش سے علم کلام نے ایک دوسرے قالب اختیار کرنا شروع کیا تھا' اور امام رازی و آمدی جیسے لوگ پیدا ہونے شروع ہوئے تھے کہ دفعتاً" تارتار کی طرف سے اس زور کی آندھی اٹھی کہ اسلام کا تمام دفتر پراگندہ ہوگیا- مشرق نے تو سنبھالا ہی نہیں لیا- شام و روم میں ملکی طاقت سنبھل گئی' لیکن وہاں کی خاک' مشرق کے سے دل و دماغ کہاں پیدا کر سکتی- اشاعرہ کی فرسودہ عبارت کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے- متاخرین اسی پر ردے رکھتے گئے- وہی عمارت آج پرستش گاہ عالم بن گئی ہے- امام غزالی اور ابن رشد نے جو میناکاریاں' اور جواہر نگاریاں کی تھیں' اس کی کسی کو خبر بھی نہیں-"

۷- الکلام: یہ مولانا شبلی کی کتاب "علم الکلام" کا دوسرا حصہ ہے لیکن اسے الگ شائع کیا گیا- اس میں جدید علم الکلام پر بحث کی گئی ہے- فلسفے کا جب زور ہونے لگا' اور اس کے مضر اثرات اسلامی ممالک پر بھی پڑھنے لگے' اور مسلمان رفتہ رفتہ خدا اور مذہب سے بیگانگی اختیار کرنے لگے' تو مولانا کو "الکلام" لکھنے کا خیال آیا- اس میں انہوں نے فلسفے اور مذہب میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے' تاکہ ہماری قوم کے افراد' خصوصاً جواں طبقہ جو یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے ہیں' اور فلسفہ پڑھ کر خدا کے وجود سے بھی انکار کرنے لگتے ہیں' ان کو گمراہی سے بچایا جائے- چونکہ "الکلام" بھی مولانا کی مستقل تصنیف ہے' اس کی عبارت کا ایک مختصر نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

علوم جدیدہ اور مذہب: یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا' جس میں طبیعیات' عنصریات' فلکیات' الٰہیات' مابعد الطبیعیات' سب کچھ شامل ہیں لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دیئے- جو مسائل مشاہدے اور تجربے کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہوگئے' ان

سائنس کا لقب دیا۔ جو مسائل تجربے اور مشاہدے کی دسترس سے باہر تھے، ان کا نام فلسفہ رکھا۔
مسائل جدیدہ کی نسبت یہ عام خیال جو پھیلا ہوا ہے کہ وہ قطعی اور یقینی ہیں، اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ جو چیزیں قطعی اور یقینی ہیں، وہ صرف سائنس کے مسائل ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ یورپ میں ان کی نسبت طبقہ علما میں کسی قسم کا اختلاف نہیں لیکن فلسفے کی یہ حالت نہیں ہے۔ یورپ میں آج فلسفے کے بیسویں اسکول ہیں، اور ان میں شدت سے اختلاف ہے۔ اگر ان سب کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک ہی چیز سفید بھی ہوسکتی ہے اور سیاہ بھی۔"

سوانح مولانا روم: پوری دنیا میں خصوصاً اسلامی دنیا میں مولانا رومی کی جو شہرت اور فضیلت ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انہوں نے اپنی مثنوی کے ذریعے اسلام کی ایسی خدمات انجام دیں، جن کی بنا پر اس مثنوی کو "قرآن در زبان پہلوی" کہا جاتا ہے۔ مشاہیر اسلام کے سلسلے میں مولانا شبلی کو ان پر بھی قلم اٹھانا چاہئے تھا۔ مولانا رومی اس کے مستحق تھے۔ مولانا نے "سوانح مولانا روم" لکھ کر یہ فرض پورا کیا۔ مولانا رومی کی مثنوی شریف بنیادی طور پر تصوف کی کتاب ہے، اور اس میں ایک عارف ربانی کی واردات قلبی بیان کی گئی ہیں، لیکن مولانا شبلی نے اپنی کتاب میں دوسری باتوں کے علاوہ خاص طور پر علم الکلام پر بحث کی ہے۔ اس میں وہ تمام مسائل انہوں نے چن چن کر نکالے ہیں، جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح علم الکلام سے ہے۔ مولانا رومی کی مثنوی کا یہ بھی ایک پہلو ہے، جس پر بحث ضروری تھی۔ "سوانح مولانا روم" کی عبارت کا ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے:

> "ان تمام تصنیفات کے پڑھنے سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین غلط کو صحیح، دن کو رات، زمین کو آسمان ثابت کرسکتے ہیں، لیکن ایک مسئلہ میں بھی یقین اور تشفی کی کیفیت پیدا نہیں کرسکتے۔ بخلاف اس کے مولانا روم جس طریقے سے استدلال کرتے ہیں، وہ دل میں اثر کر جاتا ہے، اور گو وہ شک و شبہات کے تیر باراں کو کلیتہ" نہیں روک سکتا، تاہم طالب حق کو اطمینان کا حصار ہاتھ آ جاتا ہے، جس کی پناہ میں وہ اعتراضات کے تیر باراں کی پروا نہیں کرتا۔"

موازنہ انیس و دبیر: مولانا کی نگاہ اب تک برصغیر سے باہر تھی۔ انہوں نے ان مشاہیر اسلام پر لکھا تھا جو عرب ممالک اور ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ خود اپنے ملک کی بڑی شخصیتوں کی طرف انہوں نے توجہ نہ کی تھی۔ حالانکہ ان کے ہمعصر مولانا حالی نے اپنے ہیروز زیادہ تر اس ملک سے چنے۔ اس سے ان دونوں ادیبوں کی اپنی اپنی پسند کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ بہرحال، مولانا شبلی نے "موازنہ انیس و دبیر" لکھ کر یہ شکایت دور کر دی کہ انہوں نے اپنے ملک کے کسی ادیب

اور شاعر کو نہیں نوازا۔

مولانا شبلی نے یہ کتاب اپنے حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں لکھی تھی، اور وہیں سے سلسلہ آصفیہ میں شائع ہوئی۔ حیدر آباد دکن میں شروع سے ہی اہل تشیع کا بڑا مرکز رہا۔ وہاں ہمیشہ مجلس وغیرہ کی خوب دھوم رہتی تھی۔ جس زمانے میں مولانا شبلی وہاں قیام پذیر تھے، اس عہد کے مشہور مرثیہ گو شعرا مثلاً مرزا اوج، خلف مرزا دبیر، میر نفیس، عارف، رشید وغیرہ جمع ہوئے اور بڑے زور کے مرثیے سنائے۔ مولانا کو یہ سب دیکھ کر خیال آیا کہ کیوں نا اردو میں مرثیہ کے بانی میر انیس اور مرزا دبیر پر ایک کتاب لکھ کر ان میں موازنہ کر کے دکھایا جائے کہ کون بڑا ہے، کون چھوٹا؟ چنانچہ انہوں نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ بقول مولانا حامد حسن قادری: اردو اور مرثیہ دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ علامہ کی اس طرف توجہ ہوئی۔ ان کے ذہن رسا اور دقت نظر نے کلام انیس کا جیسا تجزیہ و تبصرہ کیا ہے، جو نکتے نکالے ہیں، جو موازنے کئے ہیں، وہ دوسروں سے مشکل تھے۔" لیکن اس سلسلے میں ان پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جانبداری سے کام لیا ہے، اور میر انیس کو مرزا دبیر پر زبردستی ترجیح دی ہے، تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ "موازنہ انیس و دبیر" میں جو خوبیاں بیان ہوئی ہیں، ان کے مقابلے میں یہ اعتراض کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مولانا شبلی کی یہ کتاب اردو میں اپنی قسم کی پہلی اور بہترین ہے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:

> "فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ، آسان، کثیر الاستعمال ہو، اس لیے مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے۔ میرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آ جاتے ہیں۔ مثلاً جہاں شہ بانو نے حضرت عباس کی لاش پر نوحہ کیا ہے، شہ بانو کی زبان سے فرماتے ہیں، ہے ہے مرے دیور، مرے دیور، ایک اور جگہ فرماتے ہیں: تازہ تو ان کی سالگرہ کا نکال لا۔
>
> ابتذال کی صاف اور بین مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے، اگر یہ متمیز نہ ہوتا تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا، ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں، وہ مبتذل ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں۔ سینکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں، لیکن سب میں ابتذال ہیں، ابتذال کا معیار مذاق صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح خود بتا دیتا

ہے کہ یہ لفظ مبتذل، پست اور سوقیانہ ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کے جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے لیکن یہ ان کی انتہا درجہ کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی ان کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پاتا۔

شعر العجم: یہ مولانا شبلی کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ ان کے زمانے میں برصغیر میں فارسی علم و ادب کا جو چرچا تھا، اور خود مولانا کو اس سے جو دلچسپی تھی، اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ "شعر العجم" جیسی کتاب لکھتے۔ یہ کتاب پانچ جلدوں میں ہے، اور کل گیارہ سو صفحے پر محیط ہے۔ پہلی جلد کی تالیف مولانا نے ٦ مارچ ١٩٠٦ء کو شروع کی، اور ٦ ستمبر ١٩٠٧ء کو ختم کی جو ١٩٠٨ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ باقی چار جلدیں تیرہ سال کے عرصے میں بتدریج لکھی جاتی رہیں۔ ان میں دوسری جلد ١٩٠٩ء کے آخر میں اور تیسری جلد ١٩١٠ء میں شائع ہوئی۔ چوتھی جلد ١٩١٢ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ پانچویں جلد بھی لکھ لی تھی، لیکن ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ آخر مولانا سلیمان ندوی نے دسمبر ١٩١٨ء میں اس کو شائع کیا۔ مولانا شبلی نے چونکہ اس دوران میں اور چھوٹے موٹے کام کے علاوہ اپنا مہتم الشان کارنامہ "سیرت النبیؐ" لکھنے لگ گئے تھے، اس لیے "شعر العجم" کی تالیف میں اتنی دیر ہوئی۔ مولانا اپنی تحریر ہمیشہ نظرثانی اور کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کرتے تھے، لیکن "شعر العجم" کی پانچویں جلد کو دوبارہ دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ حیات نے وفا نہ کی، چنانچہ مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> "مولانا اپنی ہر تصنیف بار بار کی حک و اصلاح، تکرار نظر اور کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کرتے تھے۔ اس کتاب سے معلوم ہوگا کہ بے ساختگی کے ساتھ اول ہلہ میں ان کے دماغ سے کیا خیالات اور ان کے قلم سے کیا الفاظ نکلتے تھے۔

"شعر العجم" کی پہلی تین جلدوں میں فارسی شاعری کا آغاز و ارتقا دکھایا گیا ہے لیکن ان میں تمام شاعروں کو احاطہ کرنے کے بجائے صرف ۲۴ ممتاز شعرا کو چن کر ان کے حالات بیان کر کے ان کے کلام پر تفصیل سے نقد و تبصرہ کیا ہے۔ چوتھی جلد میں شاعری کی حقیقت اور فارسی شاعری کے محاسن و معائب سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ آخر جلد میں مضامین شاعری کے مختلف اصناف، عشق و حسن، اخلاق، فلسفہ، تصوف، مدح و ثنا پر ریویو ہے۔(۹) کتاب کی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔ امیر خسرو دہلوی کے حالات میں لکھتے ہیں:

> "ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات پیدا نہیں ہوا، اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے

بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کئے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو' تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی' سعدی' انوری' حافظ' عرفی' نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے "جم و کے" ہیں' لیکن ان کی حدود حکومت ایک ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ' عرفی نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے' لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل' مثنوی' قصیدہ' رباعی سب کچھ داخل ہے' اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تصنیف' مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ہمسری کا دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔ صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر خسرو کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے۔ اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے۔ امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے' اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں' چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جابجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتیں ہیں۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرہ "عرفات" میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے' اسی قدر برج بھاشا میں ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں۔ مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے۔ عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں۔ سنسکرت کے ماہر ہیں' چنانچہ مثنوی "نہ سپہر" میں تواضع کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے: من قدرے بر سراین کار شدم۔

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے۔ انہوں نے ایک مستقل کتاب "اعجاز خسروی" تین جلدوں میں لکھی' اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بیکار گیا' لیکن ان کی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب ان کے بعد آج تک کوئی شخص حاصل نہ کرسکا۔ ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیائے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ ان کو ان کاموں میں مشغول ہونے کے لیے وقت کس قدر ملتا تھا' تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ ہے اور

درباروں میں تمام تمام دن حاضری دینی پڑتی - کام جو سپرد تھا، وہ شاعری نہ تھی، بلکہ اور اشغال تھے۔"

سیرت النبیؐ: مولانا شبلی کی یہ آخری تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک لکھی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مسلمانوں کے لیے کس قدر اہمیت رکھتی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ اردو میں اب تک آپ کی سیرت پاک پر کوئی مدلل اور مفصل کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ مولانا شبلی کو اس کی سعادت نصیب ہوئی۔ انہوں نے غالباً ۱۹۰۶ء میں اس ضخیم کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اور غزوہ احد تک اس کا تھوڑا سا حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن اس وقت شاید کسی مجبوری کی بنا پر کام رک گیا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں اس کے لکھنے کا تہیہ کر لیا۔ انہوں نے اس کے پانچ حصے تجویز کئے تھے۔ (۱) عرب و کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، غزوات، اخلاق، اور اولاد اطہار اور ازواج مطہرات (۲) منصب نبوت فرائض و احکام (۳) قرآن مجید کی تاریخ اور حقائق و اسرار (۴) معجزات کی حقیقت و تحقیق (۵) یورپین تصانیف سیرت پر تنقید، لیکن زندگی نے مولانا کا ساتھ نہیں دیا۔ صرف پہلا حصہ ہی لکھ پائے تھے، جو ضخامت کا لحاظ کرتے ہوئے دو جلدوں میں شائع کیا گیا۔ پہلے میں غزوات و فتح مکہ تک، اور دوسرے میں حجتہ الوداع، وفات، اخلاق، ازواج مطہرات، ناموس خلافت ۱۱ ہجری تک۔ اس کے باقی تین حصے بعد میں ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے معجزات، منصب نبوت، اور مشہور عبادت سے متعلق لکھے۔ پہلا حصہ مولانا شبلی کی وفات کے بعد ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "چمنستان دھر میں بارہا روح پرور بہاریں آ چکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سرو سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے؛ جس کے انتظار میں پیر کہن سال دھر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔ سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخ کہیں مدت ہائے دراز سے اسی صبح جان نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابرو باد کی تردستیاں عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیمؑ، جمال یوسفؑ، معجز طرازی موسیٰؑ، جان نوازی مسیحؑ، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز، شاہنشاہ کونینؐ کے دربار میں کام آئیں گے۔"

آج کی صبح وہی صبح جان نواز' وہی ساعت ہمایوں' وہی دور فرخ فال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرانیہ و زبان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے' آتش کدہ فارس بجھ گیا' دریائے ساوہ خشک ہوگیا' لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں' بلکہ شان عجم' شوکت روم' اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں' بلکہ جحیم شر' آتش کدۂ کفر' آذر کدہ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی۔ بت کدے خاک میں مل گئے' شیرازہ مجوسیت بکھر گیا۔ نصرانیت کے اوراق خزان دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا' چمنستان سعادت میں بہار آ گئی' آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں' اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔

مقالات شبلی: مولانا شبلی نے مستقل تصنیفات کے علاوہ بہت سے مقالات و مضامین بھی لکھے ہیں' جو گونا گوں موضوعات پر حاوی ہیں' اور ندوۃ العلما کے رسالہ "الندوۃ" اور دوسرے رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ دارالمصنفین نے بعد میں ان تمام مقالات کو جو سو سے زائد ہیں' "مقالات شبلی" کے نام سے آٹھ جلدوں میں مندرجہ ذیل ترتیب سے شائع کر دیا ہے:

۱۔ جلد اول' مذہبی مضامین۔
۲۔ جلد دوم' ادبی مضامین۔
۳۔ جلد سوم' تعلیمی مضامین۔
۴۔ جلد چہارم' تنقیدی مضامین۔
۵۔ جلد پنجم' سوانحی مضامین۔
۶۔ جلد ششم' تاریخی مضامین۔
۷۔ جلد ہفتم' فلسفیانہ مضامین۔
۸۔ جلد ہشتم' قومی مضامین۔

ان تمام مضامین میں مولانا کی قوت استدلال' وسعت تحقیق اور دقت نظر پائی جاتی ہے۔ نمونے کے طور پر ایک مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"زیب النساء نے شادی نہیں کی' عام طور پر مشہور ہے کہ سلاطین تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔ اس غلط روایت کو یورپین مصنفوں نے بہت شہرت دی ہے' اور اس سے ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے لیکن یہ قصہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے۔ خود عالمگیر کی دو بیٹیاں زبدۃ النسا اور مہر النسا بیگم پسر

شکوہ اور ایزد بخش (پسر شہزادہ مراد) سے بیاہی تھیں' چنانچہ ماثر عالمگیری میں دونوں شادیوں کی تاریخیں اور مختصر حالات لکھے ہیں' اور خاتمہ کتاب میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

عالمگیر زیب النسا کی نہایت عزت کیا کرتا تھا' جب وہ کہیں باہر سے آتی تھی تو اس کے استقبال کے لیے شہزادوں کو بھیجتا تھا' سفر و حضر میں اس کو ساتھ رکھتا تھا۔ کشمیر کے دشوار سفر میں بھی وہ ساتھ تھی' لیکن عالمگیر دکن گیا' تو اس نے غالباً اپنی علمی زندگی کی وجہ سے پائے تخت کو چھوڑ دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی چھوٹی بہن زینت النسا عالمگیر کے ساتھ گئی' چنانچہ اس کا نام بار بار واقعات میں آتا ہے۔ زیب النسا نے دلی میں قیام کیا' اور وہیں پیوند زمین ہوگئی۔ زیب النسا نے ۱۱۱۳ھ میں' جو عالمگیر کی حکومت کا اڑتالیسواں سال تھا' دلی میں انتقال کیا۔ "ادخلی جنتی" مادہ تاریخ ہے۔

عالمگیر اس زمانے میں دکن کی فتوحات میں مصروف تھا۔ یہ خبر سن کر سخت غمزدہ ہوا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکلے' اور باوجود انتہا درجے کے استقلال مزاج کے صبر کی تاب نہ لا سکا۔ سید امجد خان' شیخ عطا اللہ اور حافظ خان کے نام حکم صادر ہوا کہ اس کے ایصال ثواب کے لیے زکوۃ و خیرات دیں اور مرحومہ کا مقبرہ تیار کرائیں۔

مکاتیب و خطوط شبلی: دوسرے مشاہیر علم و ادب کے خطوط کی طرح مولانا شبلی کے مکتوب بھی ادبی خوبیوں کے حامل ہیں۔ مولانا کے یہ مکتوبات تین مجموعوں میں شائع ہوئے' دو "مکاتیب شبلی" کے نام سے "دارالمصنفین" نے شائع کئے' اور ایک "خطوط شبلی" کے عنوان سے مولوی محمد امین زبیری مارہروی نے ۱۹۲۶ء میں نکالا۔ پہلے مجموعے میں مولانا کے عام خطوط ہیں' دوسرے میں ان کے تلامذہ کے نام خاص خطوط ہیں' اور تیسرے میں وہ خطوط شامل ہیں' جو انہوں نے عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم کے نام لکھے تھے۔

یہ دونوں نازلی بیگم المیہ نواب صاحب جنجیرہ (بمبئی) کی بہنیں ہیں۔ مولانا شبلی ان میں سے عطیہ بیگم فیضی کی لیاقت' ذہانت اور غالباً حسن کے بے حد دلدادہ تھے۔ یہ وہی عطیہ بیگم فیضی ہیں' جن کی روشن خیالی' اعلیٰ صلاحیت اور خصوصاً حسن خداداد کے شاعر مشرق علامہ اقبال بھی دلدادہ تھے۔ یوں کہئے کہ عطیہ بیگم فیضی مولانا شبلی اور علامہ اقبال دونوں کی بہت بڑی کمزوری تھیں۔

ان کو ہم نے ۱۹۶۰ء کے درمیان کے سالوں میں دیکھا ہے۔ وہ اکثر کراچی کی خوشنما سڑکوں پر اور شام کی پارٹیوں میں اپنے کہنہ سال شوہر مسٹر فیضی رحیمن کے ساتھ سر پر ایک خاص قسم کا رومال لپیٹے ہوئے نظر آتی تھیں۔ ان کی زندہ دلی اور شوخی طبع ان دنوں میں بھی غضب کی تھی۔ ان کو دیکھ کر ہمیں مولانا شبلی اور علامہ اقبال یاد آتے تھے۔ ان کی وجہ سے مولانا شبلی کافی بدنام بھی ہوئے۔ علامہ اقبال کے بارے میں بھی بعض لوگوں کو بدگمانی رہی۔ ان کی دوسری بہن زہرا بیگم کا تو ہمیں پتا نہیں' البتہ ان کی بڑی بہن نازلی بیگم کو دو تین سال پہلے یوم اقبال کے سلسلے میں ایک نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

"خطوط شبلی" میں سے ایک دو اقتباس ملاحظہ ہوں۔ مولانا عطیہ بیگم فیضی کو رقم طراز ہیں:

"میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لکچرار بن جائیں' جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہوچکی ہیں' لیکن اردو میں' تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہیں' صرف مشق کی ضرورت ہے۔ ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامع عام میں عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے' لیکن آپ تو اس میدان میں آچکیں' اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو۔"

"نصاب تعلیم کے متعلق میں سرے سے اس کا مخالف ہوں کہ عورتوں کے لیے الگ نصاب ہو' یہ ایک اصولی غلطی ہے۔ جس میں یورپ مبتلا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہئے کہ ان دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہوگیا ہے' وہ کم ہوتا جائے' نہ کہ بڑھتا جائے' اور بات چیت' رفتار گفتار' نشست و برخاست' مذاق زباں سب الگ ہو جائیں۔ یوں ہی تفرقہ بڑھتا رہا' تو دونوں دو مختلف نوع ہو جائیں گے۔"

"عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں' اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں' لیکن یاد رکھو' مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے' اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیوپیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو' لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان' چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہئے۔ جلال اور حسن' نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی' دلیری' دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔ مرد نما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہوسکتی ہے۔ ہاں' یہ اعتراض صحیح ہے کہ موجودہ طرز تعلیم سے بچے خاندان سے اجنبی ہو جاتے ہیں' لیکن خاندان سے زیادہ تر پیچیدگی بھی کوئی مفید چیز نہیں۔ مہمات امور رک جاتے ہیں۔"

تبصرہ

مولانا شبلی ایک بہت بڑے عالم دین تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات اور تالیفات میں ہر جگہ عالمانہ شان قائم رکھی۔ ان کے ہمعصر حالی بھی مولانا تھے، لیکن وہ اپنی تحریروں میں ایک مولانا کی شکل میں نظر نہیں آتے۔ ان کا انداز جیساکہ ہم نے پہلے بھی لکھا "شریفانہ" ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، سیدھی سادی زبان میں اتار چڑھاؤ پیدا کئے بغیر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ جوش و خروش کو دخل نہیں دیتے۔ ان کی تحریروں میں جذبات اور واردات قلبی کا فقدان معلوم ہوتا ہے۔ ان کی نگارشات میں پاکیزگی تو ہے، لیکن لطافت نہیں پائی جاتی۔ وہ شوخی و ظرافت کو اپنے لئے کسی حد تک باعث عار سمجھتے ہیں۔ شریف آدمی کو ان باتوں سے کیا واسطہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شوخی و ظرافت کی چاشنی نہ ہو، تو عبارت میں دلکشی اور جاذبیت پیدا نہیں ہوتی، پڑھنے والے کا دل اکتا جاتا ہے۔ وہ فطرتاً" ایک ایسے باغ کی سیر کرنا چاہتا ہے، جس میں گل بوٹے لگے نظر آئیں۔ حالی کی عبارت سپاٹ ہے، لیکن مولانا شبلی ان کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کی نثر شگفتہ بلکہ دلفریب ہے۔ اس میں دلربائیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کی عبارت میں عالمانہ شان ہونے کے باوجود دلکشی اور جاذبیت قائم رہتی ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں عربی کے فقرے خلل انداز ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، لیکن وہ ضروری ہے۔ بعد کی عبارت ایسی شیریں اور دلکش ہوتی ہے کہ پڑھنے والا عربی فقروں کی خلل اندازی بھول جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں انقباض نہیں، بلکہ ہر جگہ انبساط ہے۔ پڑھنے سے دماغ کو تسکین اور دل کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ مولانا شبلی اپنے عہد کے دوسرے ادیبوں سے بھی مختلف ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے ادب میں جو رنگ اختیار کیا ہے، وہ بہت حد تک سرسید کا رہین منت ہے۔ سرسید کی صحبت سے انہوں نے جدید دور کے تقاضے کو محسوس کیا، اور اس کے نئے رجحانات سے واقف ہوئے لیکن اس کے باوجود انہوں نے مولانا حالی کی طرح اپنے آپ کو سرسید میں مدغم نہیں کیا، اور اپنی شخصیت کو برابر ان سے الگ تھلگ ہی رکھا۔ شروع شروع میں وہ سرسید کے ہم خیال ضرور تھے، لیکن بعد میں ان میں تبدیلی پیدا ہوئی اور سرسید کے بعض اصلاحی اقدام کو بہت حد تک شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ادب کے میدان میں وہ کبھی سرسید کے ہم رنگ نہیں ہوئے۔ انہوں نے شروع سے ہی اپنا راستہ الگ نکالا۔ انہوں نے سرسید کے مشعل سے روشنی لی اور ایک نیا دیا جلایا۔ اسی لیے سرسید کی اردو نثر اور مولانا شبلی کی اردو نثر میں بہت فرق ہے۔ اس عہد کے دوسرے دو بڑے ادیب مولانا آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کی تو بات ہی اور ہے۔ مولانا آزاد کا طرز جداگانہ ہے، اور ڈپٹی نذیر احمد کا اسلوب بالکل الگ۔ اس لیے ان سے مولانا شبلی کا موازنہ کرنا عبث ہے۔ مولانا شبلی کی تحریر میں،

جیساکہ اوپر لکھا گیا ہے' عالمانہ شان ضرور ہے' لیکن تکلف اور تصنع سے پاک ہے۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال تو کیا ہے' لیکن بے جا نہیں۔ اس سے عبارت کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے مولانا شبلی اول درجے کے سوانح نگار ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک مورخ بھی ہیں اور متکلم بھی' ایک نقاد بھی ہیں اور انشاء پرداز بھی۔ سوانح نگاری میں مولانا حالی کو اولیت حاصل ہے۔ انہوں نے پہلے حیات سعدی'' یاد گار غالب اور "حیات جاوید" لکھ کر اردو نثر میں اس فن کی بنیاد ڈالی تھی' لیکن مولانا شبلی نے اس صنف ادب کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ "سیرت النبی"' "سوانح مولانا روم" اور "الفاروق" لکھ کر انہوں نے جو داد تحقیق دی ہے' اس کی مثال نہیں ملتی۔ "علم الکلام" کا انداز بھی ان سے پہلے سرسید نے ڈال دیا تھا' لیکن مولانا شبلی نے اس میں وسعت نظر اور دقت نظر سے کام لیا۔ ان کی خدمات سید کے مقابلے میں اس صیغہ علم میں زیادہ ہیں۔ تنقید میں مولانا نے "موازنہ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" لکھ کر جو خدمات انجام دیں' وہ بہت ہی قابل قدر ہیں۔ بحیثیت مورخ کے مولانا شبلی کا درجہ ذرا گھٹا ہوا ہے۔ تاریخی واقعات کی غلطیاں ان کی کتابوں میں کافی پائی جاتی ہیں' اگرچہ تاریخ اور سوانح میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے' تاہم مولانا شبلی کو مورخ کے بجائے ایک کامیاب سوانح نگار قرار دیا جائے' تو زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ بنیادی طور پر ایک سوانح نگار تھے۔ ان کی دوسری تمام حیثیات ثانوی درجہ رکھتی ہیں۔

حواشی

۱۔ شبلی - ایک دبستان' صفحہ ۲۹۔

۲۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۴۲۷

۳۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۶۰۷

۴۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۶۴۷

۵۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۸۱۷۔

۶۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۹۱۷ - ۹۲۷

۷۔ داستان تاریخ اردو' صفحہ ۸۳۷۔

نواب وقار الملک

حالات زندگی: سرسید کے ساتھیوں میں نواب وقار الملک کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے۔ ان کا نام مشتاق تھا۔ امروہہ، ضلع مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ان کے بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ والدہ نے تربیت کی۔ رسمی تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۸۵۹ء میں سرکاری مدرسے میں ملازم ہوگئے۔ ۱۸۷۳ء میں تحصیلداری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ وہ سرسید کے ساتھ قومی کاموں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں مفید الخلائق کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۸۶۹ء میں سررشتہ تعلیم کے ممبر مقرر ہوئے، اور ضلع کے مدارس کی نگرانی کرتے رہے۔

۱۸۷۰ء کے شروع میں سرسید کی سفارش پر وہ حیدر آباد دکن گئے، اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ وہاں وہ ۱۸۷۹ء تک رہے۔ اس کے بعد کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر چھ مہینے کی چھٹی لے کر وطن امروہہ چلے آئے پھر استعفیٰ دے کر بیٹھ گئے، لیکن ان کے حسن خدمت کے صلے میں مدارالمہام سرسالار جنگ نے ان کے لیے سیکرٹ سروس فنڈ سے چار سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ ساڑھے تین سال کے بعد سرسالار جنگ نے ان کو پھر حیدر آباد بلا لیا۔ وہ گئے، اور دس بارہ سال نیک نامی کے ساتھ فرائض انجام دے کر سات سو روپیہ پنشن پر واپس آئے۔ انہوں نے ریاست حیدر آباد کی ملازمت کے دوران فلاح و بہبود، اصلاح سلطنت اور استحکام ریاست کے سلسلے میں جو نمایاں خدمات انجام دیں، ان کے صلے میں ان کو ۱۸۸۵ء میں خان بہادر اور انتصار جنگ اور ۱۸۹۰ء میں وقار الدولہ وقار الملک کے اعزازی خطابات دیے گئے۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے بھی نواب کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۳ء میں حرمین شریفین کی زیارت کی۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی، تو اس کے پہلے سیکرٹری منتخب ہوئے لیکن بعد میں جب علی گڑھ کالج کے سیکرٹری بنائے گئے، تو مسلم لیگ سے مستعفی ہوگئے، اور علی گڑھ کالج کی خدمت میں اپنی زندگی وقف کر دی۔

ان کا انتقال ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء میں ہوا۔

ادبی زندگی: نواب وقار الملک کی ادبی خدمات مضامین تک محدود ہیں۔ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ صرف سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اور معاون ہونے کی حیثیت سے ایک انگریزی کتاب "فرنچ ریوولیوشن اینڈ نپولین" کی سرگزشت نپولین بونا پارٹ" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی وہ کتاب ۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی۔

نواب وقار الملک نے سرسید کے مشہور پرچہ "تہذیب الاخلاق" میں کثرت سے مذہبی اور قومی مضامین لکھے' اور آخر عمر تک مختلف اخباروں اور رسالوں میں وقتاً" فوقتاً" لکھتے رہے۔ ان کی تحریروں کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ کانپور کی مسجد کی شکست کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ عرصہ تک اپنی بدمزاجی پر قائم نہیں رہ سکتا' اگر رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال و استقلال کے ساتھ کرتی رہے۔ اب جو معاملات کانپور کے متعلق مسلمانان صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں' ایک ایسا موقع ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر کافی توجہ کے ہاتھ سے جانے دیا' تو ایک ٹانلر نہیں' آئندہ ہم کو توقع رکھنی چاہئے کہ ہر ایک سب انسپکٹر ہمارے لیے ٹانلر ثابت ہوگا' اگر اس وقت ہم نے اعتدال و استقلال سے کام لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بڑے سے بڑا حاکم بھی دفعتاً" ہمارے جذبات کے خلاف کارروائی کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتے گا' اور اب یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ اپنی آزادی و عزت کو برقرار رکھیں' یا پیروں کے تلے پامال ہونے دیں۔"

عہد سرسید کا اجمالی جائزہ

اردو نثر کی تاریخ میں سرسید کے عہد کو عہد زریں کہنا چاہیے۔ اس لیے کہ اردو نثر کو اسی عہد میں عروج حاصل ہوا۔ اس کی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقائے کار نے اس قدر حصہ لیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کو دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کے ہمسر کر دیا۔ سرسید خود بھی اردو میں شب و روز لکھتے رہے' اور دوسروں سے بھی لکھواتے رہے۔ یہ سرسید کی شخصیت کی مقناطیسی قوت کا اثر تھا کہ ان کے گرد قابل ادیبوں کی ایک جماعت ان کی مدد کے لئے جمع ہو گئی۔ آسمان ادب پر سرسید کی مثال ماہتاب کی سی ہے' اور ان کے رفقا ان کے گرد درخشندہ تابندہ کوکب۔

اردو ادب کے میدان میں یوں تو سرسید کے رفقا کافی ہیں' مگر ان میں خاص طور پر تین زیادہ مشہور ہیں۔ ایک مولوی نذیر احمد' دوسرے مولانا حالی اور تیسرے مولانا شبلی' سرسید کے

ساتھ ان تینوں کو ملا کر اور ان میں آزاد کو شامل کر کے انہیں اردو نثر کے "عناصر خمسہ" کہا جاتا ہے۔ اردو کے نثری ادب کے گویا یہ پانچ ستون ہیں، جن پر پوری عمارت کھڑی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جماعت سے تعلق رکھنے کے باوجود سب کے راستے الگ الگ ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنی تحریر میں جو طرز اختیار کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے تاریخ اور تنقید میں بھی وہی تمثیلی انداز برتا، جو افسانوی ادب کے لیے موزوں ہوسکتا تھا، لیکن تاریخ اور تنقید جیسے سنجیدہ مضامین کے لیے ہرگز ٹھیک نہ تھا۔ مگر آزاد کو کون سمجھاتا کہ یہ راستہ ٹھیک نہ تھا۔ وہ تو اپنی شوخی طبع اور افتاد طبع سے مجبور تھے۔ وہ اگر بالفرض اپنی تحریر میں کوئی دوسرا انداز اختیار کرنا بھی چاہتے، تو یہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ حقیقت میں آزاد کی اہمیت بھی اسی طرز کی وجہ سے ہے، وہ ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ اپنے میدان میں واحد اور منفرد، کوئی ان کی تقلید نہ کرسکا، ان کا یہ طرز خاص ان کی حیات دوام کا ضامن ہوا۔ ان کو موضوع سے اتنی محبت اور دلچسپی نہ تھی، جتنی کہ اپنے طرز سے تھی۔

ڈپٹی نذیر احمد کا خاص میدان ناول ہے وہ گویا ایک لحاظ سے اس صنف ادب کے بانی ہیں۔ ان سے پہلے دنیا کے دوسرے ادب میں ناول کافی ترقی کرچکا تھا، لیکن اردو ادب میں کیا تھا؟ کچھ قصے کہانیاں تھیں، جو ترجمہ ہو کر دوسری زبانوں سے آئی تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اردو ادب میں ناول کی طرح ڈالی، اور طبع زاد قصے لکھ کر اردو نثر کو مالا مال کیا۔ صرف یہی نہیں، انہوں نے مولانا آزاد کی طرح اپنا ایک خاص طرز ایجاد کیا۔ انہوں نے اردو ادب کو عوام کی زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کی۔ اپنی کہانیوں میں، جیساکہ پہلے ان کے ذکر میں لکھا جا چکا ہے، انہوں نے جن، پری اور دیو کے غیر فطری اور ماورائی عناصر کو جگہ نہیں دی، بلکہ اس دھرتی کے روز و شب سے پیدا ہونے والی زندگیوں پر اپنے قصوں کی بنیاد رکھی۔ ان کے ناولوں میں ہمیں جن اور پری جیسی غیر مرئی اشیا کی بجائے گوشت پوست کے انسان ملتے ہیں، جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اور جن میں آپس میں ہمدردی اور خلوص کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا یہ پہلو خاص طور پر قابل قدر ہے۔

لیکن انہوں نے یہ غضب کیا کہ اپنا یہ عوامی طرز "قرآن مجید" کے ترجمہ اور "امہات الامہ" جیسی سنجیدہ کتابوں کے لئے بھی جائز رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی میں ان کے سامنے، امہات الامہ کی ساری جلدیں نذر آتش کی گئیں، اور قرآن مجید کے ترجمہ پر اعتراضات ہوئے لیکن غور کیا جائے تو یہاں بھی وہی آزاد والی بات ہے۔ وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔ دلی

کے محاوروں کا ان کو ایسا چٹخارہ لگ گیا تھا کہ انہیں وہ کسی حالت میں بھی ترک نہیں کر سکتے تھے۔

سرسید کے ساتھیوں میں مولانا حالی سب سے شریف ہیں۔ انہوں نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ امام عصر سرسید کی راہ اختیار کی جائے۔ مولانا آزاد پر خیر سرسید کا اثر برائے نام ہی رہا۔ البتہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی نے ان سے شروع میں اثر قبول کیا ہے۔ ایک زمانے کے بعد وہ سرسید کی ہر بات سے اتفاق نہیں کرتے تھے، بلکہ بعض اوقات اختلاف بھی کرتے تھے لیکن ان میں مولانا حالی ایک ایسے شخص ہیں، جنھوں نے شروع سے آخر تک سرسید پر ایمان اور اعتقاد رکھا۔ اس لیے ان کی تحریر سرسید کی تحریر سے بہت قریب ہے۔ ادب کے ان دو معماروں کے اسلوب میں کوئی بین فرق نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ سرسید کی شروع کی نگارشات اپنے اندر قدرے قدامت لیے ہوئی ہیں۔ دونوں سادہ نگاری کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ سرسید قومی کاموں اور زندگی کی ہماہمی میں اس قدر غرق تھے کہ ان کو پر تصنع اور پر تکلف عبارت لکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ ممکن ہے، اسی لیے وہ سادگی کی طرف مائل ہوئے ہوں، لیکن مولانا حالی طبعاً" سادگی پسند تھے۔ وہ زبان کے پیچ و خم اور انداز کے نشیب و فراز میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہنگامہ آرائی سے دور بھاگتے تھے۔ انہوں نے "مسدس" لکھ کر محشر بپا کرنے کا سامان پیدا کرنا چاہا تھا، لیکن نہیں ہوا۔ قوم کے افراد نے "مسدس" کے اشعار کو گنگنانے کے لیے زیادہ موزوں پایا۔ کوئی کرے تو کیا کرے۔ حالی کی زندگی ہی ایسی تھی--- سرد، دھیمی، سادہ، شریف کسی بھی صفت سے اسے متصف کرلیں، چسپاں ہو جائے گی۔ ان کے اسلوب اور طرز نگارش میں ہر جگہ یہ باتیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

مولانا شبلی نے اپنی دنیا الگ بسائی۔ ان کے موضوعات تو وہی قومی، ملی اور تاریخی ہیں، جو ان کے ساتھیوں کے تھے، لیکن بعض چیزوں کو انہوں نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ مثال کے طور پر سوانح نگاری کو لے لیجئے۔ ان سے پہلے مولانا حالی نے اس موضوع پر ضرور خامہ فرسائی کی ہے، اور "حیات سعدی" "یاد گار غالب" اور "حیات جاوید" لکھ کر اس میدان میں اپنی اولیت قائم کی، لیکن ان میں وہ وسعت اور پھیلاؤ نہیں ہے، جو مولانا شبلی کے سوانحی کارناموں میں ہے۔ مولانا نے اس موضوع پر معلومات کا دریا بہا دیا ہے۔ تاریخ اور تنقید پر بھی ان سے پہلے کافی لکھا جاچکا تھا، لیکن مولانا شبلی نے ان میں جو جدت طرازیاں کیں، وہ اور کسی نے نہیں کیں۔ سیرت نگاری کے میدان میں تو وہ یکتائے روزگار معلوم ہوتے ہیں۔

مولانا شبلی کا طرز تحریر بھی سب سے نرالا ہے۔ ان کا اسلوب نہ سرسید کے اسلوب سے ملتا

ہے' نہ مولانا آزاد کے اسلوب سے' نہ ڈپٹی نذیر احمد کا سا ان کا طرز تحریر ہے' نہ مولانا حالی جیسی روش ہے۔ وہ ایک بہت بڑے عالم تھے۔ ان کی تحریروں میں ہر جگہ ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے۔ عربی اور اسلامیات کی تعلیم انہوں نے خاص جتن کے ساتھ حاصل کی تھی۔ اس تعلیم کو وہ بعد میں اپنی تصنیفات میں استعمال میں لائے۔ ان کو ہم مولانا آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کی طرح سو فی صدی صاحب طرز ادیب تو نہیں تسلیم کرتے' البتہ اگر کسی کو اعتراض ہو تو انہیں "نیم صاحب طرز" کہا جاسکتا ہے۔ مولانا شبلی کا طرز کچھ ایسا نہیں ہے کہ کوئی دوسرا اس کی تقلید نہ کرسکے۔ البتہ ذرا مشکل ضرور ہے۔ مولانا کی طرح اتنی عربی کون پڑھتا ہے؟ جو پڑھتا ہے' وہ بے شک مولانا کی طرح لکھ سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہی کی مثال لے لیجئے۔ انہوں نے عربی اور اسلامیات پر ایسا عبور حاصل کیا' اور اپنی تحریر میں ایسی عربیت برتی کہ مولانا شبلی ان کے سامنے ہار ماننے پر مجبور ہیں۔

مولانا شبلی کی عربی دانی سے قطع نظر' ان کی تحریر بڑی شگفتہ' دلنشین اور بعض اوقات دلربا ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات میں ایک ادبی شان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے' جو بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ ادب میں ادبی شان نہ ہو' تو وہ ادب کس شمار کا۔ مولانا نے ہر جگہ ادبیت کو بڑی خوبی سے نبھایا۔ عبارت انہوں نے سادہ ہی رکھی' لیکن کہیں کہیں تشبیہات و استعارات کے گل بوٹے ٹانک دیئے' جن کو دیکھ کر پڑھنے والے کے دل میں فرحت و مسرت پیدا ہوتی ہے۔

سرسید کے عہد میں اردو علم و ادب درجہ کمال تک پہنچ گیا۔ اس میں علم و ادب کے تمام شعبوں پر قلم اٹھایا گیا۔ مشاق ارباب فن نے اس میں وہ کمالات دکھائے' اور وہ تنوع پیدا کیا' جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ان لوگوں نے ایک قلیل عرصے میں اپنی محنت اور کوشش سے اردو کے بے مایہ ادب کو مالا مال کر دیا۔ سیاست' تاریخ' تذکرہ' سوانح' سیرت' علم الکلام غرض کہ ہر موضوع پر وافر ذخیرہ مہیا کر دیا گیا۔ انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے بھی قائم کئے گئے۔ اردو ادب میں گوناگوں مضامین لکھ کر لچک پیدا کی گئی۔ اس میں وہ وسعت اور پھیلاؤ پیدا کیا گیا کہ اب ہر قسم کے مطالب کے اظہار کرنے میں کوئی دقت نہیں آتی۔

سرسید کے عہد سے پہلے اردو ادب میں جو کچھ بھی تھوڑا بہت سرمایہ جمع ہوا تھا' وہ محض ترجمے کی شکل میں تھا۔ کسی نے کچھ لکھا بھی تو عبارت اس قدر گنجلک اور پر تصنع تھی کہ لوگوں کی طبیعت پر گراں گزرتی تھی۔ سرسید کے عہد کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اردو ادب ترجمے کا خول توڑ کر باہر آگیا' اور اس میں بے شمار طبع زاد تصنیفیں وجود میں آگئیں۔ ادب کا یہی اصلی روپ تھا' جو زمانے کی تہوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار نے اس روپ

کو نکھار دیا- اس لیے اردو ادب پر ان کا بڑا احسان ہے- اردو دنیا ان برگزیدہ ہستیوں کے بار منت سے کبھی سبکدوش نہ ہو سکے گی-

سرسید کے زمانے کے ادیبوں سے بعض لغزشیں بھی صادر ہوئی ہیں' جو ان کے معائب میں شمار ہوتی ہیں- محاسن کے ساتھ ان معائب کا ذکر بھی ضروری ہے' چنانچہ ہم نے گزشتہ صفحات میں الگ الگ ان سے موقع و محل کے مطابق بحث کی ہے' البتہ ایک مشترکہ عیب جو قریب قریب سب میں پایا جاتا ہے' اس کی طرف اشارہ نہیں کیا- وہ مشترکہ عیب ہے' انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال' یوں تو دنیا کا کوئی ادب بھی غیر زبان کے الفاظ سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتا' بلکہ بعض اوقات یہ طریقہ کار ناگزیر ہو جاتا ہے' لیکن جن الفاظ کے مترادفات خود اسی زبان میں موجود ہوں' تو غیر زبان کے الفاظ کا خواہ مخواہ استعمال بالکل بے موقع معلوم ہوتا ہے- سرسید اور ان کے رفقائے کار نے اس بات کی احتیاط نہیں کی' بلکہ اپنی تحریروں میں جا و بے جا ایسے انگریزی الفاظ استعمال کئے' جن کے متبادل الفاظ اردو میں موجود تھے-

اس کی وجہ جو ہماری سمجھ میں آتی ہے' وہ یہ ہے کہ ان کا زمانہ وہ تھا' جب برصغیر پر انگریزی حکومت کا تسلط ابھی ابھی قائم ہوا تھا' اور ایک نئی تہذیب کی بنیاد پڑ رہی تھی- اس وقت انگریزی بولنا' لکھنا' اور اس کے الفاظ استعمال کرنا قابلیت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا' خصوصاً اس شخص کے لیے' جس کو انگریزی نہیں آتی تھی- اتفاق سے سرسید' مولانا آزاد' ڈپٹی نذیر احمد' مولانا حالی اور مولانا شبلی ان میں سے کسی کو انگریزی نہیں آتی تھی- آتی کیسے' انہوں نے انگریزی پڑھی کب تھی اور باقاعدگی سے پڑھنے کا موقع ہی کب ملا تھا؟ بعد میں البتہ اپنے طور پر کوشش کر کے تھوڑی بہت سیکھ لی تھی- صرف کام چلانے کی حد تک- اس لیے شاید ان پر انگریزی کا رعب چھایا ہوا تھا' اور ان کا خیال تھا کہ دوسروں پر رعب جمانے کے لیے جگہ جگہ دو چار انگریزی کے الفاظ جھاڑ دو- سب قابلیت کا لوہا مان جائیں گے' ممکن ہے' انہوں نے یہ طریقہ غیر شعوری طور پر اختیار کیا ہو' لیکن ہے یہ طرز تحریر کی بے اعتدالی- آج جب کہ اردو ترقی کر کے اور زیادہ پاک صاف اور شائستہ ہو گئی ہے' تو ان کے وہ انگریزی الفاظ ذوق سلیم کو اور زیادہ کھٹکنے لگے ہیں- اس سے ہمارا مقصد ان بزرگان ادب کے نام و ناموس کو ہرگز گھٹانا نہیں ہے' صرف ایک لغزش کی نشاندہی کرنی ہے-

طرز نگارش کی یہ بے اعتدالی عناصر خمسہ میں سے سرسید' ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی سے زیادہ صادر ہوئی ہے- سرسید اور حالی پر "نیچر" کا دور دورہ تھا- "فطرت" کا ہوتا تو بہتر تھا-(۱) ڈپٹی نذیر احمد پر "نیچر" کا غلبہ نہیں تو دوسرے عام انگریزی الفاظ کا رعب بہت ہے' خصوصاً ان

کے لکچروں میں یہ بات زیادہ نمایاں ہے۔ مولانا آزاد میں یہ بیماری بہت کم ہے۔ وہ اپنے انداز تحریر میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ علامہ اقبال کے شعر کا وہ ٹکڑا "تو کیا حاجت گلگونہ فروش" ان پر صادق آتا ہے۔ انگریزیت سے ان کے طرز کی خوبی میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ مولانا شبلی شروع شروع میں جب علی گڑھ میں رہنے لگے تھے، اور ان کو "پیر کہن" کی صحبت نصیب ہوئی تھی، تو وہ بھی انگریزی الفاظ کے استعمال کو تحریر کا کمال سمجھنے لگے تھے لیکن بعد میں وہ سنبھل گئے، اور پھر وہی طرز کہن اختیار کیا، جو ان کے شایان شان تھا۔ گویا بحر سید میں ڈوب کر ابھر آئے۔ مولانا حالی نہ بچ سکے۔ وہ اصل میں بچنا چاہتے بھی نہ تھے۔ انہوں نے سرسید سے الگ اپنی کوئی شخصیت قائم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، تو اس ورطہ تحریر سے کیا بچتے۔ ان ادیبان کامل نے اردو ادب میں جہاں بہت سی بدعتوں کو توڑا، وہاں انہوں نے ایک بدعت کو رواج بھی دیا۔ یہ ان کا قصور نہیں، زمانے کا قصور تھا۔

حواشی

۱۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ "نیچر" اور فطرت دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ ایک انگریزی کا لفظ ہے، دوسرا اردو کو عربی سے ورثے میں ملا۔ اب اردو ہی کا ہے لیکن سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اکثر "نیچر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سرسید کے "نیچری" کہلانے کا ایک سبب لفظ "نیچر کا لفظاً" و معنیً" کثرت استعمال بھی ہے۔

عہد سرسید کا تتمہ

سرسید کا عہد نامکمل رہ جائے گا اگر چند بقیۃ الصالحین کا ذکر نہ کیا جائے- یہ وہ بزرگان ادب ہیں' جو عہد حاضر سے تعلق رکھتے ہیں' اور سرسید اور ان کے رفقائے کار کے فیض یافتہ ہیں- ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں- (۱) مولانا سید سلیمان ندوی (۲) مولانا ابوالکلام آزاد (۳) ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور (۴) مولانا عبدالماجد دریا آبادی' ذیل میں مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے:

مولانا سید سلیمان ندوی

حالات زندگی: مولانا سید سلیمان ندوی صوبہ بہار میں ضلع پٹنہ کے ایک مردم خیز گاؤں دیسنہ میں ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے- والد سید ابوالحسن بڑے حاذق طبیب تھے- مکتبی تعلیم اپنے گاؤں کے ایک معلوم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود علی اکھدوی سے پائی- اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیمی کتابیں ختم کرنے کے بعد عربی میں میزان و منشعب اپنے بڑے بھائی مولوی ابو حبیب سے پڑھی- بڑے بھائی سے تعلیم پانے کے بعد اپنے والد کے پاس اسلام پور گئے- وہاں سے ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف پٹنہ گئے- وہاں ایک سال خانقاہ مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدین' سجادہ نشین خانقاہ پھلواری شریف سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں- خانقاہ کے دیگر بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر بھی علم و ادب کا شوق پیدا ہوا- پھلواری شریف سے دربھنگہ جاکر بھی چند ماہ رہے اور تعلیم حاصل کی- ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلما' **لکھنؤ** میں داخل ہوئے- وہاں سات سال رہ کر تعلیم کی تکمیل کی- ۱۹۰۵ء میں جب مولانا شبلی دارالعلوم ندوہ کے معتمد تعلیم ہو کر **لکھنؤ** آئے تو ان کی صلاحیت کو دیکھ کر اپنے دامن تربیت میں لے لیا- مولانا شبلی کے پاس مصر و شام کے مشہور عربی رسائل اور جدید تالیفات آتی تھیں- مولانا سلیمان ندوی ان کا برابر مطالعہ کرتے رہے' جس سے ان میں جدید عربی ادب کا ذوق پیدا ہوا- ۱۹۰۷ء میں ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو ان کے استاد مولانا شبلی نے ان کو اپنے پرچہ "الندوہ" کا سب ایڈیٹر مقرر کیا- ۱۹۰۸ء میں وہ ندوہ میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد بھی مقرر ہوئے- جولائی ۱۹۱۲ء

میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو مولانا شبلی کے صحبت یافتہ تھے، کلکتے سے اپنا مشہور و معروف اخبار "الہلال" نکالا، تو مئی ۱۹۱۳ء میں وہ اس کے اسٹاف میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۱۳ء کے آخر میں مولانا شبلی کے ایما سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج، پونہ میں السنہ شرقیہ کی پروفیسری قبول کر لی لیکن یہاں ڈیڑھ سال بھی نہ رہے ہوں گے کہ ان کے استاد مولانا شبلی کا انتقال ہوگیا۔

مولانا شبلی نے اپنی وفات سے پہلے "دارالمصنفین" کا ایک خاکہ تیار کیا تھا، لیکن اس کو عملی جامہ پہنا نہ سکے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے پونہ سے اعظم گڑھ آکر ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ وہ اس دارالمصنفین کے ناظم کی حیثیت سے ۳۲ سال تک کام کرتے رہے، لیکن آخیروقت تک ڈھائی سو روپیہ ماہوار سے زیادہ تنخواہ لینا پسند نہ کیا۔

جولائی ۱۹۱۶ء میں "معارف" کا پہلا پرچہ ان کی ادارت میں نکلا، جو آج تک جاری ہے۔ ۱۹۱۷ء میں کلکتے میں علمائے بنگال کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی، اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی سیاسی تحریکوں میں شریک رہے۔ فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر کی سرکردگی میں معاملات ترکی میں انصاف طلبی اور مسلمانان ہند کے معاملات کی تشریح کے لیے خلافت پارٹی کا جو وفد یورپ گیا تھا وہ بھی اس کے ایک ممبر تھے۔ وہ اس وفد کے ساتھ اٹلی، فرانس اور انگلستان میں حقوق ترکی کے لیے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعے لڑتے رہے۔ ۱۹۲۰ء کے آخر میں لندن کے سفر سے واپس آکر تحریک ترک موالات میں پورے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ ۱۹۲۴ء میں ابن سعود اور شریف حسین میں جنگ چھڑ گئی، تو مولانا سید سلیمان ندوی کی قیادت میں ایک وفد حجاز گیا کہ فریقین کے سامنے خلافت کی تجویزیں پیش کرے۔ اس سلسلے میں وہ دو ماہ جدہ رہے۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا کی دعوت پر انہوں نے مدراس کا سفر کیا، اور سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دیے، جو "خطبات مدراس" کے نام سے شائع ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں سلطان عبدالعزیز ابن سعود نجدی نے موتمر حجازیہ اسلامیہ کے نام سے ایک اجلاس بلایا تو اس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے جو وفد گیا تھا، اس کی قیادت بھی مولانا سید سلیمان ندوی ہی نے کی تھی۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں نادر خان، شاہ افغانستان کی دعوت پر علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ہمراہ کابل کا سفر کیا، اور وہاں شاہی مہمان رہ کر کابل یونیورسٹی کی ترتیب، تنظیم اور تکمیل اور وہاں کے تراجم و تالیفات کے دائرے کو وسیع کرنے کے سلسلے میں مفید مشورے دیے۔ نومبر ۱۹۴۰ء میں ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ان کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی آنریری ڈگری دی۔ ۱۹۴۲ء میں وہ اتنے بڑے عالم ہونے کے باوجود مولانا اشرف علی تھانوی (جولائی ۱۹۴۳ء) کے آستانے پر جا کر جھک گئے، اور ان

سے روحانی فیض حاصل کیا۔ ۱۹۴۲ء میں نواب حمید اللہ خان، والئی بھوپال کے اصرار پر وہاں کے عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر عربی تعلیم کی اصلاح و ترقی کی کوشش کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ریاستوں کا حال بالکل بدل گیا، تو اکتوبر ۱۹۴۹ء میں خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے گئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد ہندوستان میں اپنی ساری جائیداد اور املاک کو چھوڑ کر جون ۱۹۵۰ میں پاکستان چلے آئے۔ یہاں کئی ایک بڑے بڑے تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا(۱)

ادبی زندگی: مولانا سید سلیمان ندوی اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کے سچے جانشین تھے۔ انہوں نے وہ سب کام پورا کیا، جو مولانا شبلی کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک عالم متبحر تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تبحر علمی میں وہ اپنے استاد مولانا شبلی سے بڑھ گئے تھے۔ انہوں نے سب سے بڑا کام جو کیا، وہ دارالمصنفین کا قیام تھا۔ اس کے بعد "سیرت النبی" کی تکمیل تھی۔ مولانا شبلی اس کی صرف ایک ہی جلد مرتب کرنے پائے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ عالم نزاع میں انہوں نے اپنے ہونہار اور قابل شاگرد کو پونہ سے تار دے کر اعظم گڑھ بلوایا اور وصیت کی کہ سب سے پہلے وہ تمام کام چھوڑ کر "سیرت النبیؐ" کی تکمیل کریں، جس کو وہ ناتمام اور غیر مرتب چھوڑ رہے تھے۔ انہوں نے استاد کی وصیت پر عمل کر کے اس کام کو بہ خوبی پورا کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی اردو نثر میں تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہیں:

(۱) ارض القرآن پہلی جلد، ۱۹۱۷ء (۲) سیرت النبی، جلد اول، ۱۹۱۸ء، (۳) ارض القرآن، دوسری جلد، ۱۹۱۸ء (۴) سیرت النبی، جلد دوم ۱۹۲۰ء (۵) سیرت عائشہ ۱۹۲۰ء (۶) سیرت النبی جلد سوم ۱۹۲۴ء (۷) خطبات مدراس، ۱۹۲۵ء (۸) عرب و ہند کے تعلقات ۱۹۲۹ء (۹) عربوں کی جہاز رانی، ۱۹۳۱ء (۱۰) سیرت النبی جلد چہارم ۱۹۳۲ء (۱۱) خیام ۱۹۳۳ء (۱۲) سیر افغانستان ۱۹۳۳ء (۱۳) سیرت النبی جلد پنجم ۱۹۳۵ء (۱۴) سیرت النبی، جلد ششم ۱۹۳۹، (۱۵) نقوش سلیمانی ۱۹۳۹ء (۱۶) رحمت عالم ۱۹۴۰ء (۱۷) حیات شبلی ۱۹۴۳ء (۱۸) لغات جدیدہ وغیرہ۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے "ارض القرآن" میں ارض قرآن کا جغرافیہ، اقوام عرب کے سیاسی، تاریخی، نسبی، قومی، دینی، تجارتی اور تمدنی حالات پر قرآن مجید کی تطبیق کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں مہدی افادی لکھتے ہیں:

"مجھے حیرت ہے کہ ایک کام جو علم آثار کے ایک زبردست ماہر فن کے کرنے کا تھا، وہ بھی ساٹھ برس کے بعد کسی یورپ کی اکیڈمی میں بیٹھ کر آپ اس پر کیونکر قابو حاصل کر سکتے ہیں۔ عربیت سے زیادہ آپ کی ادبیت سے مرعوب ہو رہا ہوں۔ زبان

نفس موضوع کے لحاظ سے قطعاً لائق شکایت نہیں، یعنی کہیں سے بے جوڑ نہیں ہے، اور جب تناسب میں کہیں سے کوئی کسر نہیں، تو حسن کی جامعیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔"

مولانا کا اہم کارنامہ "سیرت النبی" ہے۔ اس کے اور دوسری تصانیف کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں:

"سیرت النبیؐ اول تا ششم کے اس ضخیم اور عظیم الشان کارنامہ کی مثال اردو میں یا کسی اور زبان میں کیا ہوتی، عربی میں ملنا مشکل ہے—— سلیمان کا یہی ایک کارنامہ انہیں سلیمان اعظم بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ زندگی بھر وہ کچھ اور نہ کرتے، تنہا یہی اپنی یادگار چھوڑ جاتے، جب بھی ان کا نام نامی رہتی دنیا تک روشن رہتا، رسول کریم کے ممتاز سیرت نگاروں کی صف اول میں انہیں جگہ ملتی، اور حشر میں اپنے جد اعلیٰ کی نگاہ کرم و شفقت کے روبرو سہیلی اور قسطانی اور زرقانی کے زمرہ میں وہ بھی محشور ہوتے لیکن سیرت النبی کے جلو میں تو ایک پورا لشکر ہی ہے۔ "رحمت عالم" اور "ارض القرآن"—— "سیرت عائشہ" اور خطبات مدراس" "نقوش سلیمانی اور "خیام، عرب و ہند کے تعلقات اور "حیات شبلی"" "لغات جدید" عربوں کی جہاز رانی"" چھوٹی بڑی نئی پرانی، دینی، علمی، ادبی درجنوں کتابوں کے مصنف اور بے شمار مقالات کے راقم کو کوئی اردو خواہ بھلانا چاہے، تو بھی کیسے بھلا سکتا ہے۔ اپنی چالیس سالہ زندگی میں ادب صالح سے اردو کے ذخیرے کو جتنا مالا مال اس نے کیا، اس سے بڑھ کر اور کون کر سکتا ہے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی اردو ادب میں ایک طرز خاص کے مالک ہیں۔ وہ ایک جید عالم دین تھے۔ اس لیے ان کی عبارت میں ادبیت اور پختگی کے علاوہ علمیت بھی نمایاں ہے لیکن ان کی وہ علمیت ایسی نہیں، جو کانوں کو گراں معلوم ہو۔ وہ کبھی بے موقع عربی، فارسی کے بڑے بڑے الفاظ کا استعمال کر کے عبارت کو بھاری نہیں بناتے، بلکہ وہ ان دونوں زبانوں کے ایسے الفاظ لکھتے ہیں، جو اردو میں کثرت استعمال سے اردو کے اپنے ہو گئے ہیں، اور جن کے بغیر اب بلند خیالات کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک الفاظ کی رنگینی کا نام ادبیت نہیں، بلکہ خیالات اور الفاظ کا اس طرح ترتیب دینا ہے کہ پڑھنے والے کو ادبیت کا مزہ مل جائے۔ ان کی نثر میں مولویانہ رنگ کبھی پیدا نہیں ہو پایا، جس سے مضمون خشک معلوم ہو۔ ان کی عبارت میں شگفتگی، سلاست و روانی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں شوخی و ظرافت کا بھی چٹخارہ مل جاتا ہے۔ مولانا ایک

اچھے مقرر بھی تھے' جس کی وجہ سے ان کی عبارت میں کبھی کبھی خطیبانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے' جو افہام و تفہیم کے لیے بہت سازگار ہوتا ہے۔ اس سے بیان میں برجستگی اور مضمون میں ایک خاص قسم کا لطف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

ان کے طرز تحریر کے بارے میں مولانا عبد الماجد دریا بادی لکھتے ہیں :

"سیرت النبی" کی ضخیم مجلدات سے لے کر "خیام" "خطبات مدارس" اور "رحمت عالم" تک بڑی' منجھلی اور چھوٹی کتابوں تک کون سی ایسی ہے' جہاں حضرت سلیمان ایک خشک مولوی' ملانے معلوم ہوتے ہیں اور صحت زبان اور سلاست بیان نمایاں نہ ہو۔ شگفتگی' متانت' شرافت یہ تو ان کے اسلوب تحریر کے جوہر اصلی ہیں' اور اس میں جا بجا شوخی و ظرافت کی گلکاریاں اور حسن صناعت کی سحر طرازیاں' جیسے خاتم سلیمان میں نگین۔"

"ارض القرآن" میں سے مولانا کی اردو نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو : مولانا اس کا سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ قدیم و جدید معلومات کی تطبیق کے ساتھ ارض القرآن (عرب) کے حالات مذکورہ کی اس طرح تحقیق کی جائے کہ قرآن مجید کی صداقت اور معترضی کی لغزش علی الاعلان آشکارا ہو جائے۔ اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت سے شاید کسی مسلمان کو انکار نہ ہو گا۔ قرآن مجید میں عرب کی بیسویں قوموں' شہروں اور مقامات کے نام ہیں جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام علما تک ناواقف ہیں' اور نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی' اور دوسری طرف غیروں کو انہیں افسانہ کہنے کی جرات ہوئی تورات میں ہزاروں اشخاص' اقوام' بلاد اور مقامات کے نام ہیں' جو تطاول زمانہ اور تغیر السنہ کی بنا پر مجہول اور ناپید ہوگئے ہیں۔ لیکن علمائے نصاریٰ کی ہمت سزاوار آفرین ہے کہ وہ ارض تورات اور انسائیکلوپیڈیا آف بائبل کے ذریعے سے ۳ ہزار برس کے مردہ نام اپنی مسیحیت سے زندہ کر رہے ہیں۔

قرآن مجید میں بیس تیس اقوام و اشخاص کے ناموں سے زیادہ نہیں' تاہم ان کی تحقیق کے لیے مخصوص طور سے کوشش نہیں کی گئی۔ عموماً یہ مباحث تفسیر کے ضمن میں لکھے گئے یا تاریخ عمومی مقدمے کے طور پر مذکور ہوئے۔ حالانکہ اس کی اہمیت

مستقل بحث و تصنیف کی محتاج تھی۔

مقام عبرت ہے کہ ہماری مذہبی کتاب کی تحقیق و کاوش میں بھی اغیار نہایت کوشش و جان فشانی سے مصروف ہیں۔ جرمن، فرنچ، اٹالین اور انگلش مستشرقین نے تاریخ عرب قبل اسلام پر محققانہ کتابیں لکھیں، یونانی و رومی تصنیفات سے جو عرب قبل اسلام کے حالات سے پر ہیں[2] انتخاب و خلاصہ کیا۔ قرآن مجید نے جن اقوام و بلاد کا ذکر کیا ہے، ان کے کھنڈروں کا مشاہدہ کیا، ان کے کتبات کو حل کیا، اور ان سے عجیب و غریب نتائج مستنبط کئے۔"

حواشی

۱۔ ماخوذ از نقوش، شخصیات نمبر، جلد اول، صفحہ ۱۸۰۔ ۱۸۸ اور معارف، سلیمان نمبر، ۱۹۵۵ء۔

مولانا ابوالکلام آزاد

حالات زندگی: محی الدین احمد نام ابوالکلام کنیت اور آزاد تخلص تھا۔ اگست ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا خیر الدین ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے مگر ۱۸۶۲ء میں مکہ معظمہ چلے گئے تھے' اور وہیں ایک عرب خاتون سے شادی کر لی تھی۔ اس لحاظ سے مولانا آزاد کے والد ہندوستانی تھے اور والدہ عرب تھیں۔ مولانا خیر الدین ۱۸۹۴ء کے شروع میں پھر ہندوستان آئے' اور کلکتے میں جا کر قیام کیا۔ مولانا آزاد بھی والد کے ساتھ تھے' اور ان کی عمر اس وقت کوئی سات سال کی تھی۔

مولانا آزاد کی تعلیم کا آغاز کے میں ہوگیا تھا۔ جب ان کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی تو شیخ عبداللہ میرداد کے ہاتھوں بسم اللہ کی تقریب ادا ہوئی۔ اس کے بعد اپنی خالہ سے قرآن مجید پڑھا۔ حافظ بخاری اور بنگال کے ایک مولوی صاحب سے بھی دو چار سبق پڑھے تھے۔ جب قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا' اور بعض سورتیں بھی حفظ کر لیں' تو حرم شریف میں قاری حسن شیخ الموزنین کے پاس جا کر کچھ دن قرات پڑھی۔ ہندوستان آنے سے پہلے اپنی بڑی بہن آبرو بیگم سے اردو کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۸۹۴ء کے سفر کے بعد جب ان کے والد کو کلکتے میں مستقل طور پر قیام کرنے کی نوبت آئی' تو پہلے اپنے والد سے عربی' فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد مختلف علوم و فنون کی کتابیں مولانا محمد یعقوب اور مولانا نذیر الحسن سے پڑھیں۔ اس سلسلے میں اور کئی ایک اساتذہ کا ذکر آتا ہے' جن سے مولانا نے تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور استعداد کی بدولت پندرہ سولہ سال کی عمر ہی میں درس نظامیہ سے فراغت حاصل کر لی۔ انہوں نے حکیم باقر خان سے طب بھی پڑھا۔ اردو شاعری کا شوق مولوی عبدالواحد خان کی صحبت سے پیدا ہوا۔ اردو میں استعداد اور معلومات بڑھانے کی غرض سے انہوں نے مختلف اساتذہ اور شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا اور اردو شعرا کے تذکرے دیکھے۔ دواوین اور تذکروں کے علاوہ جدید اردو ادب کی طرف بھی توجہ کی' اور سرسید' نذیر احمد' حالی' شبلی وغیرہ کی تمام کتابیں

پڑھ ڈالیں۔ ان کا انتقال ۲۲ فروری، ۱۹۵۸ء کی صبح کو ہوا۔

ادبی زندگی : مولانا ابوالکلام آزاد نے سب سے پہلے ۱۸۹۹ء "نیرنگ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ نکالا، جو آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ ۱۹۰۰ء کے اواخر میں "المصباح" ایڈٹ کیا۔ ۱۹۰۳ء میں مولوی احمد حسین کے اخبار "احسن الاخبار" سے ان کا تعلق رہا، جس کی ادارت بعد میں خود ان ہی کے ذمے ہوگئی۔ "احسن الاخبار" بند ہوگیا، تو نومبر ۱۹۰۳ء میں "لسان الصدق" کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ پرچہ تھوڑے ہی دنوں میں بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے اپنے والد کے ساتھ حجاز کا سفر کیا۔ ۱۹۰۵ء کے شروع میں وہاں سے واپس ہوئے، تو بمبئی میں مولانا شبلی سے پہلی دفعہ ان کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۰۵ء میں وہ لکھنؤ گئے، اور مولانا شبلی کے ساتھ قیام کیا۔ وہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک "الندوہ" کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے مولانا شبلی سے کسب فیض کیا۔ ۱۹۰۶ء کے وسط میں وہ امرتسر گئے اور اخبار "وکیل" سے وابستہ ہوئے۔ وہاں وہ کوئی چھ ماہ رہے۔ اس کے بعد اپنے بڑے بھائی ابونصر غلام یٰسین کے انتقال پر وہ کلکتہ چلے گئے۔ وہاں کچھ دنوں تک وہ اخبار "دارالسلطنت" نکالتے رہے، لیکن وہ اخبار قلیل عرصے کے بعد بند ہوگیا۔ ۱۹۰۷ء کے آخر میں وہ پھر امرتسر گئے، اور اخبار "وکیل" سے دوبارہ متعلق ہوگئے، لیکن اس دوران میں ان کے خیالات میں انقلاب آ چکا تھا، اور آزادی وطن کے جذبات اُمڈ آئے تھے، چنانچہ آٹھ نو ماہ کے بعد جولائی ۱۹۰۸ء میں "وکیل" سے قطع تعلق کر لیا، اور کلکتہ چلے گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۰۸ء کو والد کا انتقال ہوگیا، تو وہاں کچھ دن ٹھہرے۔ اس کے بعد اسلامی ممالک کی سیاحت کے لیے روانہ ہوگئے۔ سب سے پہلے بغداد گئے، اولاً وہاں کی اکثر علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں سے ملے۔ اسی سفر کے دوران میں ان کی ملاقات فرانسیسی مستشرق لوئی مسینوں سے ہوئی۔ ان سے گفتگو کرکے فرانسیسی زبان کی اہمیت کا اندازہ ہوا، چنانچہ چند روز کی محنت سے اس کے مطالعہ پر حاوی ہوگئے۔ بغداد سے پھر مصر، شام، ترکی اور فرانس گئے۔ لندن جانے کا بھی ارادہ تھا، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر نہ جاسکے۔ اسلامی ممالک کے سفر کے دوران میں انہوں نے ترقی یافتہ صحافت کا مطالعہ کیا، اور اس کے بلند معیار کا اندازہ لگایا تھا۔ ان کے دل میں بھی ایک معیاری پرچہ نکال کر آزادی وطن کے لیے جدوجہد کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ اس سفر سے واپس ہونے کے بعد کلکتہ سے جولائی ۱۹۱۲ء میں اپنا مشہور پرچہ "الہلال" بند ہوگیا، تو انہوں نے "البلاغ" کے نام سے دوسرا پرچہ نکالا۔ اس کا بھی معیار وہی تھا، جو "الہلال" کا تھا۔ "البلاغ" کے ساتھ انہوں نے کلکتہ میں "دارالارشاد" قائم کیا، جس میں وہ منتخب نوجوانوں کو قرآن حکیم کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ قومی اور دینی

کارکنوں کی تعلیم و تربیت کا وہ مرکز تھا' جس کے لیے وہ "الہلال" کے زمانے سے انتظامات کر رہے تھے' لیکن اس کے قیام کو ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ اپریل ۱۹۱۶ء میں حکومت بنگال نے انہیں حدود بنگال سے باہر نکال جانے کا حکم صادر کیا۔ وہ رانچی چلے گئے' تو وہاں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ انہوں نے کم و بیش دس سال قید و بند کی زندگی گزاری۔ وہ ہمیشہ ایک سرگرم سیاسی کارکن رہے۔ بعد میں ان کا تعلق کانگرس سے رہا۔ ملک کی تقسیم ہوئی' تو وہ ہندوستان کی مرکزی کابینہ میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے' اور آخر دم تک اس عہدے پر فائز رہے۔ مولانا اپنی غیر معمولی قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر اپنے عنفوان شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ ادبی ذوق و شوق میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے قلم سے ایسے زور دار اور پر شکوہ مضامین نکلے کہ اردو ادب اور صحافت کی تاریخ میں ان کا شمار اردو کے ممتاز ترین انشا پردازوں میں ہوا۔ ان کے وہ مضامین جو "الہلال" اور "البلاغ" میں نکلے' "مقالات آزاد" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوگئے ہیں۔ قرآن پر ان کی نظر بہت گہری اور وسیع تھی۔ ان کی تفسیر "ترجمان القرآن" اس کا ثبوت ہے۔ مولانا کو خدا نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا۔ اس کی محسوس و مشہود مثالیں "تذکرہ" اور "غبار خاطر" کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود ہیں۔ "تذکرہ" رانچی کی نظربندی کے زمانے میں لکھا گیا' جب مولانا کے پاس کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہ تھی "غبار خاطر" کے خطوط احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ اس وقت بھی وہ کتابوں سے بڑی حد تک محروم تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی طرز تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عبارت کے توازن و تسلسل میں کبھی کوئی فرق نہ آنے پاتا۔ ایک جملے کے بعد دوسرا جملہ اسی انداز سے آتا ہے۔ اس کے ساتھ عبارت اس قدر مربوط ہوتی ہے کہ اس کی ترتیب میں ذرا بھی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ ایک لفظ بھی اگر اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو پوری عبارت کے بے لطف ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ وہ الفاظ کا انتخاب زیادہ عربی فارسی کے ذخیرے سے کرتے ہیں' لیکن عموماً نہایت دلکش الفاظ کو چنتے ہیں۔ علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات کی آمیزش سے جو ادبیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے عبارت کو ایک خاص دلکشی اور موضوع کو بلندی حاصل ہوتی ہے۔ تشبیہات و استعارات عربی انداز کے ہوتے ہیں' جن کی بنا پر ادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسری طرف مضمون میں شگفتگی بڑھ جاتی ہے۔

مولانا آزاد بہترین مقررین میں سے تھے۔ اس لیے عبارت میں کہیں کہیں خطابت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس انداز سے ان کی عبارت پر تاثیر اور پر لطف ہو جاتی ہے۔ ان کا قرآن حکیم

کا مطالعہ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، بہت گہرا اور وسیع تھا۔ اس لیے ان کی کوئی تحریر قرآنی تعلیمات کے حوالے سے خالی نہ ملے گی۔ وہ آیات قرآنی کو عبارت میں اس قدر برمحل استعمال کرتے ہیں، پھر ان کا ترجمہ اردو میں اس قدر خوبی سے کرتے ہیں کہ پورا مفہوم آسانی سے ذہن نشین ہوجاتا ہے۔

۱۔ اولاً ان کا وہ انشا پردازانہ رنگ، جسے انہوں نے "تذکرہ" کے آخری صفحات یا سوانح سرمد، افسانہ ہجر و وصال اور اس طرح کے دوسرے شاعرانہ رنگ کے مضامین میں برتا ہے۔ اس طرز تحریر میں تصنع، آورد اور شان خود نمائی کا زور ہے اور کہیں کہیں "نیرنگ خیال" کے مصنف کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ مضامین ایک ممتاز صاحب فن کی تحریر ہیں۔ ان میں ایک خاص انفرادی شان اور دلاویزی ہے۔

۲۔ مولانا کا دوسرا اسلوب خطیبانہ ہے جو "الہلال" اور "البلاغ" کے اکثر مضامین کی خصوصیت ہے، اور جس نے ان کے آتشین قلم میں اس قدر زور اور اثر بھر دیا تھا کہ اردو زبان میں شاہ اسمٰعیل شہید کے بعد کسی نے یہ طرز تحریر اختیار نہ کیا تھا۔ مولانا نے اسے اختیار کیا تو اس میں اور ہی جدتیں اور شوخیاں پیدا کیں۔ اس اسلوب کی بنا پر "الہلال" اور "البلاغ" کو ایسا بلند درجہ ملا، کہ کبھی کسی اردو اخبار کو نصیب نہ ہوا تھا۔ مولانا نے بعد میں یہ اسلوب ترک کر دیا تھا۔

۳۔ مولانا کا تیسرا اسلوب سادگی اور سلاست پر مبنی ہے، جو انہوں نے "ترجمان القرآن" کے مقصد یا بعد کے بعض مضامین میں اختیار کیا لیکن اس اسلوب پر ان کا نثری سرمایہ مقدار میں بہت قلیل ہے۔(۱)

"تذکرہ" میں سے مولانا ابوالکلام آزاد کی اردو نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"پھر کس قدر عقل سے کورے اور بصیرت سے محروم ہیں وہ بندگان غفلت، جو ان روایتوں کو پڑھ پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ کسی ایسے آنے والے زمانے کی نسبت ہیں، جو قیامت سے چند برس پہلے دنیا پر آئے گا۔ اور ابھی اس کی آمد کا ہم کو صدیوں انتظار کرنا چاہیے۔ اب تک نہ تو "یصبح مومنا" "ویمسی کافرا" ہوا ہے اور نہ "حتی تعبد الاوثان" اور نہ "حتی تعبد اللات العزیٰ" اور نہ وہ وقت کہ "بطن الارض خیرلکم من ظہرھا۔ تو کیا وہ کسی ایسے وقت کے منتظر ہیں، جب صبح کو ایک شخص مومن ہوگا اور شام کے وقت ان کی پیشانی پر قلم اور سیاہی سے لکھا ہوگا کہ یہ کافر ہے؟ یا اس کے یہ معنی ہیں کہ صبح کو ایک شخص مومنوں کی شکل؟ یا ایمان و کفر

بستی میں ہوگا' شام کو اس کا گھر یہودیوں کے محلے میں خود بخود اٹھ جائے گا' وہ خود سڑکوں اور گلیوں میں پکارتا ہوا دوڑے گا کہ میں یہودی ہوگیا' میں یہودی ہوگیا؟ کیا مشرکین سے اتصال و الحاق کا وہ یہ مطلب سمجھے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کی جماعتیں مردم شماری کے کاغذات میں اپنا نام مشرکوں کے خانے میں لکھوا دیں گی یا خود اپنے منہ سے کہیں گی کہ ہم مشرک ہو گئے؟ اور کیا "تعبد الاوثان" کی پیشین گوئی کا اسی وقت ظہور ہوسکتا ہے کہ جب کہ مسلمان کالی اور مہادیو کا بت اپنے ہاتھوں سے تراش کر اس کی پوجا شروع کر دیں؟ اور کیا اس کے سوا اور کوئی بات بت پرستی کی نہیں ہوسکتی؟ اور پھر کیا؟ "تعبد اللات و العزیٰ" کے ظہور کے لیے وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ جو ایام جاہلیت میں پتھر کی مورتیں تھیں' جن کو اسلام نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو اب پھر ان ٹکڑوں کو ڈھونڈ کر مسلمان جمع کریں اور کعبے کے طاقوں میں دھر کر ان کے سجدے کرنے لگیں؟ اور جب اسی "لات و عزیٰ" کی پوجا نہ ہوگی' اس وقت تک یہ بات بھی پوری نہ ہوگی؟ تو اگر ان لوگوں نے ان خبروں کا یہی مطلب سمجھا ہے اور اسی انتظار میں ہیں' تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کا انتظار کبھی پورا نہ ہوگا۔ اور اگر کسی امت کی گمراہی اور ہلاکی کا یہی سبب ہے اور موحدین کا شرک و بت پرستی میں پڑ جانا بغیر اس کے نہیں ہوسکتا' تو آج تک دنیا میں نہ تو کوئی امت ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہوئی' نہ یہود و نصاریٰ نے اس زمین پر کبھی شرک کیا' اور نہ ان تمام الزاموں میں سے ایک الزام بھی سچا ہے' جو قرآن حکیم نے مشرکین جاہلیت اور یہود و نصاریٰ پر لگائے ہیں۔"

حواشی

۱۔ آثار غالب' صفحہ ۲۵۸۔ ۲۶۰۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

حالات زندگی : ڈاکٹر مولوی عبدالحق، جو بابائے اردو کے معزز لقب سے دنیائے ادب میں مشہور ہیں، ضلع میرٹھ کے قصبہ ہاپور میں ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پرانے طرز پر گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے۔ ۱۸۹۴ء میں مدرسہ العلوم علی گڑھ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ان ہی ایام میں انہیں مصلح اعظم سرسید احمد خان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سرسید انہیں بہت عزیز رکھتے تھے، اور اپنے بیٹے کے برابر سمجھتے تھے۔

علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد وہ چند سال مدرسہ آصفیہ حیدر آباد دکن کے صدر مدرس رہے۔ ریاست کی معتمدی امور عامہ میں عرصے تک مترجم کی خدمت انجام دی۔ ۱۹۰۱ء میں ناظم تعلیم کے مددگار اور چند ماہ کے بعد صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات مقرر کئے گئے۔ سرکاری ملازمت کا یہ سلسلہ ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد ان کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

جنوری ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ میں "انجمن ترقی اردو" کی بنیاد پڑی۔ پروفیسر ٹامس آرنلڈ اور مولانا شبلی علی الترتیب اس کے پہلے صدر اور سیکرٹری مقرر ہوئے۔ مولانا شبلی نے استعفیٰ دے دیا، تو دسمبر ۱۹۰۵ء میں ان کی جگہ مولوی حبیب الرحمٰن شروانی بحیثیت سیکرٹری منتخب ہوئے لیکن وہ کچھ نہ کر سکے۔ انجمن کے صدر اس زمانے میں ہندوستان چھوڑ کر انگلستان جاچکے تھے۔ اس صورت حال میں انجمن کا تمام نظام درہم برہم ہوکر رہ گیا۔ ارکان انتظامی تقریباً سب کے سب حیدر آباد دکن میں تھے۔ اس لیے ۱۹۰۹ء میں مولوی حبیب الرحمٰن خان شروانی ایک لحاظ سے حالات سے مجبور ہو کر سیکرٹری کے عہدے سے دست بردار ہوگئے، اور ان کی جگہ مولوی عزیز مرزا نئے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ وہ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اردو کے بھی بڑے اچھے ادیب تھے لہٰذا امید کی گئی تھی کہ وہ انجمن کا کام حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں گے،

لیکن اگلے سال ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا دہلی میں سالانہ اجلاس ہوا۔ انجمن ترقی اردو اصل میں اسی کی ایک شاخ تھی۔ ترقی اردو کا شعبہ عزیز مرزا کے بعد لاوارث رہ گیا تھا۔ کانفرنس کے سربراہ صاحب زادہ آفتاب احمد خان نے اس موقع پر اس کا سیکرٹری مولوی عبدالحق کو نام زد کیا۔ حاضرین جلسہ نے بالاتفاق منظوری دے دی۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ملازمت کے سلسلے میں اورنگ آباد میں مقیم تھے۔ انہوں نے اس نئے عہدے کو احساس ذمہ داری کے ساتھ اور بہ طیب خاطر قبول کیا۔ یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب انجمن کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوا' تو نئے سیکرٹری کو "ایک پرانا صندوق ملا' جو بوسیدگی کی وجہ سے رسی سے کسا ہوا تھا۔ اس میں ایک رجسٹر' چند پرانے اور غیر مرتب مسودات' ایک قلم دوات اور باقی —— اللہ کا نام۔ یہ تھی کل کائنات انجمن ترقی اردو کی' جو اس نے اپنے معتمد چہارم کے حوالے کی۔ ایک رجسٹر اور ایک قلم دوات کو ہاتھ میں لے کر ہندوستان جیسے ملک میں کسی علمی کام کے لیے کھڑا ہونا مولوی عبدالحق صاحب ہی کا کام تھا۔ "اس کے بعد ان کی زندگی اور انجمن کی تاریخ ایک ہوگئی۔ اس انتخاب نے ان کی جولانی طبع کے لیے بالکل نیا اور وسیع میدان کھول دیا' اور وہ ایسے تازہ شوق اور ولولے کے ساتھ اس اقلیم جدید میں داخل ہوئے' جو سرکاری عہدہ داری یا تصنیف و تالیف کے عام مشغلوں میں پیدا نہ ہوسکتے تھے۔ وہ انجمن کے کام میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ ان کو کام سے عشق تھا' جس کی وجہ سے ان میں یکسوئی کا مادہ پیدا ہوگیا تھا۔ کام سے اس عشق کا رجحان ان کی طبیعت میں کچھ طالب علمی کے زمانہ ہی سے پیدا ہوگیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں: "مجھے علی گڑھ کا طالب علم ہونے کا فخر حاصل ہے' مگر میں کالج میں ایک مٹھا طالب علم تھا۔ میں نہ کبھی کھیلوں میں شریک ہوا' نہ یونین یا کلب میں حصہ لیا اور نہ انتخاب پریذیڈنٹ و سکرٹری کے ہنگامے میں شامل ہوا۔ غرض جو خوبیاں ایک علی گڑھ کالج کے طالب علم کے لیے تمغہ ہائے شرافت ہیں' ان میں سے مجھ میں ایک بھی نہ تھی۔"

ان کو پڑھنے لکھنے کے کام سے لگاؤ تھا' دنیا کے دوسرے کاروبار کے لیے ان کو وقت نہیں ملتا تھا۔ "انجمن" زندگی کی نئی دھن اور سب سے بڑا مقصد حیات بن گئی۔ فطری محنت اور مستعدی میں اورنگ آباد کی نفیس آب و ہوا اور پرسکون فضا نے ایک حد تک مساعدت کی' وہ علم و ادب کی دیوی کی پوجا میں ایسے منہمک ہوئے کہ تاہل کی زندگی سے بھی دلچسپی نہ لی۔ اپنی ساری عمر تجرد میں گزار دی۔

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ کی مجلس مشاورت کے فیصلے کے مطابق انجمن ترقی اردو کا مرکز

دہلی قرار دی گئی۔ مولوی صاحب نے حیدر آباد کی ملازمت کو اردو کی خدمت پر قربان کر دیا' اور اورنگ آباد کی سکونت ترک کر کے انجمن کے دفتر کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے۔ دہلی میں وہ نو سال تک رہے۔ ۱۹۴۷ء کا انقلاب آیا اور ملک کا پرانا نظام درہم برہم ہو گیا تو انہیں بھی پاکستان کی طرف ہجرت کرنا پڑا۔ وہ اسی سال نومبر کے اواخر میں کراچی پہنچے۔ اس کے بعد انجمن کا دفتر بھی کراچی منتقل ہو گیا۔ یہاں انہوں نے از سرنو کام شروع کیا' لیکن حالات کی ناسازگاری کی بنا پر وہ اس طرح کام نہ کر سکے' جس طرح وہ کرنا چاہتے تھے۔ دہلی میں وہ غیروں کے ہاتھ لاچار تھے' پاکستان آکر وہ اپنوں کے ہاتھ اور زیادہ بے بس ہو گئے۔ ارباب اختیار سے انہیں موافقت سے زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹۵۸ء میں ملک میں دوسرا انقلاب آیا' تو حالات ذرا بہتر ہوئے' لیکن اس وقت تک وہ بہت زیادہ بوڑھے ہو چکے تھے' اور ان کے قویٰ جواب دے چکے تھے۔ ہر دم بیماری لگی رہتی تھی۔ آخر ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

ادبی زندگی: ڈاکٹر مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو سے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۶۱ء تک ۴۹ سال وابستہ رہے۔ اس مدت میں انہوں نے اچھے سے اچھے دن بھی دیکھے ہیں' اور برے سے برے دن بھی۔ ان کی زندگی میں انجمن کے تین دور گزرے ہیں۔ (۱) ۱۹۱۲ء - ۱۹۳۸ء تک ۲۶ سال حیدر آباد کا دور (۲) ۱۹۳۸ء۔ ۱۹۴۷ء تک ۹ سال دہلی کا دور اور (۳) ۱۹۴۷ء ۱۹۶۱ء تک ۱۴ سال کراچی' پاکستان کا دور' ان میں حیدر آباد کا دور بہترین دور تھا۔ دہلی میں بھی اچھے جم گئے تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ پاکستان کا دور بہت نرم رہا۔ اس میں وہ حسب توقع جم نہ سکے۔

لیکن ان ایام میں وہ جہاں بھی رہے؛ جس حال میں بھی انہیں دن گزارنا پڑا' وہ ہمیشہ کام کرتے رہے۔ ان کے زیر ہدایت و سرپرستی انجمن ترقی اردو نے نہایت مفید اور عمدہ کتابیں تالیف و ترجمہ کرا کے بکثرت شائع کی ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابوں پر انہوں نے فاضلانہ مقدمے اور دیباچے لکھے ہیں' جن سے ان کی تحقیقی صلاحیت اور تبحر علمی کا پتا چلتا ہے۔ خصوصاً قدیم اردو پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ ان کی بدولت دکن میں بہت سے پرانے دبے ہوئے ادبی دفینے نکل آئے ہیں۔ یہ ان ہی کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج اردو ادب کی تاریخ میں کئی سو سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کی ان ہی بیش بہا خدمات کی بنا پر وہ "بابائے اردو" کہلائے۔ ان ہی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے الہ آباد یونیورسٹی نے ۱۹۳۷ء میں اپنی گولڈن جوبلی کے موقع پر ان کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق عہد حاضر کے بلند پایہ نثر نگار ہیں۔ اگرچہ ایک "قواعد اردو" کے علاوہ ان کی مستقل تصنیف کوئی نہیں ہے لیکن بے شمار کتابوں پر ان کے مقدمات اور دیباچے، مختلف موضوعات پر ان کے بے شمار مضامین اور اردو زبان اور علم و ادب پر ان کے عالمانہ خطبات اردو نثر کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ ان کے مقدمات کتابی شکل میں دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے خطبات کی دو ضخیم جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ سرسید پر ان کے جو مضامین تھے، ان کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ "چند ہم عصر" ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے برصغیر کی مختلف اعلیٰ اور ادنیٰ شخصیتوں پر لکھے تھے۔ یہ کتاب ان کی شخصیت نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔" اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام کے نام سے بھی انہوں نے ایک کتابچہ لکھا تھا، جو بنیادی معلومات کا حاصل ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "تنقیدات عبدالحق" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ قدیم اردو پر ان کے جو مضامین وقتاً" فوقتاً" ان کے رسالہ "اردو" میں شائع ہوتے رہے، ان کا ایک مجموعہ "قدیم اردو" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

اسلوب نگارش: مولوی صاحب کی اردو نثر سرسید اور حالی کے طرز تحریر کی بہت حد تک نمائندگی کرتی ہے۔ ان دونوں بزرگان ادب کی طرح وہ بھی سادگی اور سلاست کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں ایک خاص قسم کی پختگی ہے، جس میں دلی کی ٹکسالی زبان کا خاص طور سے رنگ جھلکتا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ سے جملوں میں زور پیدا کر دینا ان کا امتیازی اسلوب نگارش سمجھا جاسکتا ہے۔ عبارت میں سادگی کے باوجود ہر جگہ شگفتگی پائی جاتی ہے۔ موقع و محل دیکھ کر عربی، فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ہلکے پھلکے ہندی الفاظ سے کہیں کہیں اپنی عبارت کی خوبی کو بڑھاتے ہیں۔ روزمرہ اور محاوروں کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ سادگی ملحوظ رہتی ہے۔ کہا کرتے تھے: "زبان تو ایسی ہونی چاہیے کہ گھر کا بامن بھی اسے بہ آسانی سمجھ سکے۔" عبارت کی شوخی اور رنگینی سے بعض اوقات مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس طرز تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ زبان میں عالمانہ شان دکھانے کی کوشش کرنا بھی وہ گوارا نہیں کرتے تھے۔ ایک روز ان سے مولانا ابوالکلام آزاد کے طرز تحریر کا ذکر آیا، تو کہا: اس طرز کے اختیار کرنے کی کوشش ہرگز کسی کو نہ کرنی چاہیے۔

"چند ہم عصر" میں انہوں نے نام دیو مالی کا جو خاکہ کھینچا ہے، اس کا ایک اقتباس ان کی نثر کے نمونہ کے طور پر ذیل میں کیا جاتا ہے:

"مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں

تھا- میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا تھا- میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا- میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی- اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا- لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا- بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا- مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے- تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا' اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا- پانی ڈال کر ڈول درست کی' اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا- پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا- دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا- یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی- کام اسی وقت ہوتا ہے' جب اس میں لذت آنے لگے- بے مزہ کام کام نہیں بیگار ہے-"

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی- یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا' مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے- وہ اپنے کام میں مگن رہتا- اس کی کوئی اولاد نہ تھی- وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا' اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے- وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا' ان کو پیار کرتا' جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے- جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے' ان کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا- ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی- کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا- بازار سے دوائیں لاتا- باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا- دن بھر اسی میں لگا رہتا' اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے- ہزار جتن کرتا' اور اسے بچا لیتا' اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا' اسے چین نہ آتا- اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے' اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا-"

مولانا عبدالماجد دریا بادی

عہد حاضر کے اردو نثر نگاروں میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کو بڑا امتیاز حاصل ہے۔ وہ مارچ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر تھے۔ عربی' فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم قدیم دستور کے مطابق مختلف مولوی صاحبان سے حاصل کی۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کے لیے سیتا پور گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ پڑھنے میں بہت تیز تھے۔ ۱۹۰۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج کی تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے۔ ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج' حال لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ انگریزی اور فلسفہ ان کی خاص دلچسپی کے مضامین تھے۔ عربی کا مضمون بھی ساتھ لئے ہوئے تھے۔ اس کالج سے بی اے کرنے کے بعد وہ علی گڑھ گئے اور ایم اے میں داخل ہوئے۔ اس کا سال اول پاس کر چکے تھے کہ سفر حجاز کے دوران میں والد کا انتقال ہوگیا۔ دوسری ذمہ داریاں آپڑیں۔ سلسلہ تعلیم منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے ماتحت لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر دارالترجمہ حیدر آباد دکن میں تقریباً دو سال ترجمے کے کام پر مامور رہے۔ کہتے ہیں ابتدا میں انگریزی تعلیم کا اثر ان پر برا پڑا۔ مذہب سے کسی حد تک بیزاری پیدا ہوگئی تھی۔ طبیعت میں بھی ذرا لاابالی پن آ گیا تھا۔ ملازمت کی پابندیاں ناگوار گزرتی تھیں۔ اس لیے ملازمت چھوڑ کر وطن چلے آئے۔ نظام دکن نے بلوا کر استعفیٰ دینے کا سبب دریافت کیا' تو انہوں نے ملازمت کی پابندیوں کو اپنے لیے بارگراں بتایا۔ اس پر نظام دکن نے ازراہ سرپرستی ایک سو پچیس روپیہ ماہانہ حین حیاتی وظیفہ مقرر کر دیا۔ حیدر آباد کے ہندوستان سے الحاق کے بعد یہ وظیفہ بند کر دیا گیا تھا' لیکن مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی کوشش سے دوبارہ جاری ہوا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد پھر بند ہوگیا۔

۱۹۲۷ء میں مولانا اشرف علی تھانوی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ان کی صحبت سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے' اور ان کے ہاتھ پر بیعت ہو کر مسٹر سے مولانا بن گئے۔ اس کے بعد سے حلیہ'

لباس' اقوال و اعمال ہر لحاظ سے برابر مولانا بنے ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی پاکستان چلے آئے تو ادارہ دارالمصنفین کی نگرانی ان ہی کے سپرد ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے۔ واپس ہو کر ایک سفرنامہ مرتب کیا' جو "سفر حجاز" کے نام سے شائع ہوا۔

ادبی زندگی: اردو میں مضمون نویسی کا شوق ان کو ابتدا ہی سے ہوگیا تھا۔ اسکول کے ساتویں یا آٹھویں درجے میں پڑھتے تھے کہ ان کے مضامین لکھنؤ کے مشہور روزنامہ "اودھ اخبار" اور پنجاب کے بعض اخبارات میں مثلاً "وکیل" امرتسر "پیسہ اخبار" لاہور وغیرہ میں شائع ہونے لگے تھے۔ مولانا جب لکھنؤ میں ایف اے کے طالب علم تھے' تو ان کا ایک مضمون کتابی شکل میں "غذائے انسانی" کے نام سے اخبار "وکیل" امرتسر کے دفتر سے شائع ہوا' جس میں انہوں نے آریہ سماجیوں کے جواب میں یہ ثابت کیا تھا کہ گوشت انسان کی فطری غذا میں داخل ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی اپنے زمانہ طالب علمی میں لکھنؤ کے علمی اور ادبی حلقوں میں شریک ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ انہوں نے مولانا شبلی نعمانی کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا عبدالسلام ندوی' مولانا عبدالحلیم شرر' مرزا ہادی رسوا وغیرہ سے بھی ربط و ضبط پیدا ہوا۔ دارالعلوم "ندوا العلما" کا علمی رسالہ "الندوۃ" نکلا' تو اس میں وہ مضمون لکھنے لگے۔ دوسرے ادبی رسالہ "الناظر" میں بھی انہوں نے بہت سے فلسفیانہ مضامین لکھے' اس دور کے مضامین کا ایک مجموعہ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے "فلسفیانہ مضامین" کے نام سے شائع کیا تھا۔

مولانا جس زمانے میں دارالترجمہ حیدر آباد دکن میں ملازم تھے' ان کی مشہور کتاب "فلسفہ حیات" جو اردو میں نفسیات کی پہلی مقبول ترین کتاب تھی' انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں ان کی ایک انگریزی کتاب "سائیکالوجی آف لیڈر شپ" انگلستان کے مشہور ناشر فشر اینڈ انون" لندن نے شائع کی۔ اس کتاب کا اردو ایڈیشن "فلسفہ اجتماع" کے نام سے انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام نکلا۔ اس کتاب کے بعض مندرجات پر بعض علما نے ان پر کفر کے فتوے دیے۔ حیدر آباد کے زمانہ قیام ہی میں جدید علم منطق پر "منطق" کے نام سے انہوں نے اور ایک ضخیم کتاب لکھی' جو عرصے تک جامعہ عثمانیہ میں داخل نصاب رہی۔ اسی زمانے میں حیدر آباد میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے بھی ان کے مراسم پیدا ہوئے۔ اسی بنا پر انجمن ترقی اردو نے مذکورہ بالا دو کتابوں کے علاوہ اور کئی کتابیں ان سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں: (۱) تاریخ اخلاق یورپ' دو جلدوں میں اور (۲) تاریخ تمدن۔

۱۹۲۶ء میں دارالمصنفین، اعظم گڑھ کا مشہور علمی رسالہ "معارف" نکلنے لگا تو مولانا اس کے مضمون نگاروں میں شریک ہوئے۔ "اخبار علمیہ" کا عنوان سالہا سال ان ہی کے قلم کا رہین منت رہا۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا سلیمان ندوی تحریک خلافت کے وفد کے ساتھ یورپ گئے تو "معارف" کی ادارت مولانا کے سپرد کر گئے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی "معارف" کی ادارت ان کے ذمے رہی۔ ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار "حقیقت" کے نام سے نکلا۔ مولانا نے اس میں کثرت سے مضامین لکھے۔ ۱۹۶۵ء میں مولانا نے خود ایک ہفتہ وار دینی و اصلاحی پرچہ "سچ" کے نام سے نکلا۔

۱۹۳۲ء میں قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ اور تفسیر کے کام کا آغاز کیا۔ اس لیے اخبار "سچ" کو وقتی طور پر بند کر دیا۔ ۱۹۳۴ء میں پھر وہ اخبار "صدق" کے نام سے دوبارہ جاری ہوا۔ شروع شروع میں وہ دو روزہ رہا۔ بعد میں ہفتہ وار کر دیا۔ ۱۹۵۰ء میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے اخبار "صدق" کو چند ماہ کے لیے بند کرنا پڑا۔ یکم دسمبر ۱۹۵۰ء سے پھر یہی اخبار "صدق جدید" کے نام سے نکلا۔

طرز تحریر: مولانا عبدالماجد دریا بادی صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ شروع شروع میں جب وہ مولانا شبلی کی صحبت سے فیض حاصل کرتے رہے، اس وقت ان کا طرز تحریر بڑی حد تک مولانا شبلی سے ملتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کا اپنا الگ رنگ پیدا ہوا، اور ان کی انفرادیت نمایاں ہونے لگی۔ ان کی عبارت میں سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ شدت تاثر پائی جاتی ہے۔ رعایت لفظی کا بھی وقتاً فوقتاً استعمال ہوتا ہے، لیکن اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ ذرا بھی آوردہ معلوم نہ ہوا۔ مضمون کے لحاظ سے موزوں الفاظ اور فقروں کا انتخاب ان کی تحریر کے خاص جوہر ہیں۔ طنز نگاری میں بھی ان کو مہارت تامہ حاصل ہے۔ لیکن ان کے اس طرز میں نہ تو دوسروں پر ذاتی حملے ہوتے ہیں نہ کسی قسم کی رکاکت و ابتذال۔ ان کے طرز تحریر کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ مضمون کے درمیان میں کبھی سوالات خود ہی کرتے جاتے ہیں، اور زیر بحث مسئلے کے متعلق جتنے موافق و مخالف سوال ہوسکتے ہیں، سب کا احاطہ کرلیتے ہیں۔ اس سے مفہوم بہت واضح ہو جاتا ہے۔

"فلسفہ اجتماع" سے ان کی نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"مملکت فرانس کی کسی عدالت کے سامنے ایک مقدمہ درپیش ہے، جج کے گرد جیوری حلقے کئے ہوئے ہیں، ملزم کی طرف سے پیروکار مشہور و معروف فرنچ بیرسٹر مسٹر سیو لاشاد ہے۔ وہ تقریر شروع کرتا ہے، اور ساتھ ہی جج اور ممبران جیوری متاثر ہونے

لگے ہیں، لیکن ایک خاص جیوری اس عام کیفیت سے مستثنٰی ہے۔ اسے مقدمات کے واقعات کی رتی رتی اطلاع ہوچکی ہے۔ وہ دل میں یہ عہد کرکے آیا ہے کہ وکلا و بیرسٹر کی خطابت اسے کسی طرح شاہراہ انصاف سے منحرف نہ ہونے دے گی۔ مانا کہ بریت جرم پر تقریر کرنے والا نہایت مشہور سحربیان بیرسٹر ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ خود ذاتی طور پر ملزم کے مجرم ہونے کو متحقق کرچکا ہے، اور آج وہ ہرگز اپنی حس عدل پروری کو وکیلانہ چرب زبانی سے مغلوب نہ ہونے دے گا۔ لاشاد کی تقریر شروع ہوئے دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ ہوچکے ہیں، اور تمام سامعین اس کے زور بیان و فصاحت پر مرحبا و آفرین کہہ رہے ہیں، لیکن اس جیوری کا یقین واثق اب بھی بالکل غیر متزلزل ہے۔ ناواقفوں کا فریب میں آ جانا ممکن ہے لیکن اسے ناواقف کون کہہ سکتا ہے؟ وہ ذاتی طور پر اس معاملے کی تحقیق کرکے ملزم کے قصوروار ہونے کے نتیجے پر پہنچ چکا ہے اور اس کے یقین کامل کو دنیا کی کون سی زبان آوری شکست دے سکتی ہے؟ آدھ گھنٹا ہوگیا، پینتیس، چالیس یہاں تک کہ پورے پینتالیس منٹ گزر گئے اور عہد راسخ اب تک خطابات کی حملہ آوریوں سے غیر مغلوب ہے۔ سیولاشاد کا جوش تقریر اب اپنے منتہائے شباب پر ہے۔ سامعین میں سے ہر شخص ہمہ تن گوش ہے، اور عدالت کے در و دیوار کے ساتھ حاضرین کے دلوں سے بھی اس کے موثر الفاظ کی صدائے بازگشت آ رہی ہے، کہ بے سان و گمان دفعتہ وہ اپنی تقریر میں قطع کلام کرکے حاکم عدالت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے، براہ مہربانی چپڑاسی کو حکم دیجئے کہ سامنے کے دریچے پر پردہ چھوڑ دے، ادھر سے دھوپ آ رہی ہے، جس سے فلاں جیوری صاحب کو تکلیف ہو رہی ہے۔

یہ جملہ عمل تسخیر تھا۔ عہد و پیماں، عزم و ثبات کا قلعہ بات کی بات میں مسخر ہو گیا۔ چہرے پر سرخی کا آنا، لبوں پر خفیف مسکراہٹ کا نمودار ہونا اور زبان کا شکریے کے لیے کھلنا "آنا" فانا" کا کام تھا۔ بالاخر چند منٹ کے بعد جب ملزم کی رہائی کا حکم سنایا گیا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس فرمان رہائی پر ان جوری صاحب کے بھی دستخط تھے۔

نفس بشری کی اثر پذیری و تلون کی یہ کیسی روشن مثال ہے۔"

تبصرہ

عہد سرسید کے تتمے میں ہم نے صرف چار نمائندہ ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ سب عہد حاضر سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا ابوالکلام آزاد' ڈاکٹر مولوی عبدالحق' (اور مولانا عبدالماجد دریا بادی سب ہی پچھلے چند سالوں میں یکے بعد دیگرے راہی ملک بقا ہوئے۔

مولانا سید سلیمان ندوی اپنے استاد مولانا شبلی کے جانشین اور پیرو ہوتے ہوئے بھی اردو ادب میں اپنا ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ بعض باتوں میں ان کا مرتبہ استاد سے بڑھ گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی افتاد طبع بالکل جداگانہ تھی۔ انہوں نے سرسید کے عہد میں رہ کر بھی کسی کی روش اختیار نہیں کی۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا طرز ایک مخصوص نوعیت کا حامل ہے۔ عالم ادیب اور بھی گزرے ہیں' لیکن مولانا آزاد نے جس عالمانہ شان سے اردو لکھی' وہ کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ عربی کے الفاظ' فقرے اور جملے ان کے ہاتھ میں موم کی طرح پگھلتے تھے۔ وہ جس طرح جہاں چاہتے تھے' ڈھال لیتے تھے۔ عربیت کے برتنے کی ایسی بے پناہ صلاحیت کسی میں بھی پیدا نہیں ہوئی۔ ان کا فلسفیانہ انداز بھی ایک خاص رعب پیدا کرتا ہے۔ وہ اگر سیاست میں نہ پڑتے' اور اپنی فطری استعداد سے کام لے کر اپنی زندگی اردو ادب کے لیے وقف کر دیتے' تو نہ جانے وہ کیا کچھ کرسکتے تھے۔ مسلمانوں کو رجائی ادب کی بہت ضرورت ہے۔ مولانا ابوالکلام رجائیت پسند ادیب تھے۔ وہ اگر مزید توجہ دیتے تو اقبال نے جو کام اپنی شاعری سے انجام دیا' وہ اپنی نثر سے وہ کام شاید بہ احسن و جوہ انجام دے سکتے تھے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی سب سے بڑی اہمیت اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دینا ہے۔ کوئی نصف صدی تک اس مرد خدا نے جس خلوص' ایثار اور بے غرضی سے اپنی زبان و ادب کی خدمت کی' اس کی مثال دنیا کے کسی ادب کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ ان کے اس کام یا مشن میں قدم قدم پر مشکلات درپیش ہوئیں۔ انقلاب پر انقلاب آیا' موج حوادث کے تھپیڑے کھاتے کھاتے بوڑھے ہوگئے لیکن ان کا عزم و استقلال ہمیشہ جوان رہا۔ وہ

خندہ پیشانی سے ہر مصیبت، ہر دکھ درد کو برداشت کر لیتے تھے، اور رخت سفر باندھ کر اگلی منزل کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ ان کو لوگوں نے دیوانہ کہا، جنون باختہ بتایا، لیکن انھیں روز اول سے اردو سے جو عشق ہوگیا تھا، اس کی شدت میں کبھی کمی نہ ہوئی۔ ان کا یہ عشق اور ان کی یہ لگن ان کو ادبی دنیا میں امر بنانے کا باعث ہوئی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سرسید اور مولانا حالی کے سچے جانشین اور پیرو تھے۔ ان دونوں بزرگوں کو بھی اردو کی ترقی سے ایسی ہی دلچسپی تھی۔ اس لیے وہ ہمیشہ ان کے نام بڑے عقیدت سے لیتے تھے۔ طرز نگارش میں وہ حالی سے بہت قریب ہیں، اور مولانا حالی سرسید سے قریب تھے۔ اس طرح گویا یہ تینوں ایک ہی سلسلے کی تین کڑیاں ہیں۔ مولوی صاحب شاید اس سلسلے کی آخری کڑی ثابت ہوئے۔ سائنس کی روز افزوں ترقی کی بنا پر آج کل سادگی اور سلاست کی طرف رجحان عام ہو رہا ہے، لیکن وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے، جو سرسید، حالی اور مولوی عبدالحق میں تھی۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اپنے مخصوص طرز سے اردو کو فلسفیانہ مضامین سے آشنا کیا۔ اس سے اردو ادب میں وسعت، پھیلاؤ اور لچک پیدا ہوئی۔ کوئی ادب بھی ادب عالیہ کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس میں حیات انسانی کے تمام پہلوؤں کو سمونے کے لیے لچک نہ پیدا ہو۔ مولانا نے فلسفیانہ کتابیں اور مضامین لکھ کر اردو ادب کی بڑی خدمت انجام دی۔

باب پنجم

داستان' ناول' ڈراما اور افسانہ

داستان

تمہید : اردو کے نثری ادب کا ایک بہت بڑا سرمایہ داستانوں کی شکل میں ہے جو انیسویں صدی عیسوی میں وجود میں آیا- اس ادب کا بیشتر حصہ دوسری زبانوں کے قصے کہانیوں سے ترجمہ ہو کر آیا ہے- صرف دو کتابیں ایسی ہیں' جن کو طبعزاد کہا جاسکتا ہے- ان میں ایک مرزا رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" ہے-

اردو کی ان داستانوں میں بعض تو مختصر ہیں اور بعض بہت طویل- مختصر داستانوں میں سے بہتوں کا ذکر باب دوم اور باب سوم میں آچکا ہے- اس لیے ان کی طرف صرف اشارہ کافی ہے- طویل داستانوں پر البتہ ابھی تک کہیں بحث نہیں کی گئی ہے- یہاں مختصر اور طویل دونوں قسم کی داستانوں پر یکجا مختصر طور پر بحث کی جاتی ہے-

۱- کلیلہ و دمنہ کے اردو ترجمے : (۱) "کلیلہ و دمنہ" فارسی میں ہے' اور سنسکرت الاصل ہے- اردو میں اس کے تین مستند ترجمے ہوئے ہیں- اول "اخلاق ہندی" دوم "خرد افروز" اور سوم "بستان حکمت"- "اخلاق ہندی" فارسی کتاب "مفرح القلوب" کا اردو ترجمہ ہے' جو ۱۸۰۲ء میں فورٹ ولیم کالج میں میر بہادر علی حسینی نے کیا ہے- "مفرح القلوب" کلیلہ و دمنہ کے سلسلے کی کتاب ہے- اس کا ذکر باب سوم میں آچکا ہے- "خرد افروز" فارسی کتاب "عیار دانش" کا ترجمہ ہے' جو ۱۸۰۳ء میں فورٹ ولیم کالج میں شیخ حفیظ الدین احمد نے کیا ہے- "عیار دانش" بھی "کلیلہ و دمنہ" ہی کے سلسلے کی کتاب ہے' اور اس کا ذکر پچھلے باب میں آ چکا ہے- "بستان حکمت" مشہور فارسی کتاب "انوار سہیلی" کا اردو ترجمہ ہے' جو ۱۹۳۵ء میں فقیر محمد گویا نے کیا ہے- "انوار سہیلی" بھی' جیسا کہ سب کو معلوم ہے' "کلیلہ و دمنہ" ہی سے ماخوذ ہے- ڈاکٹر گیان چند جین کی رائے میں فقیر محمد گویا کا ترجمہ سب میں بہترین ہے- اس پر باب دوم میں بحث کی

جا چکی ہے۔

۲۔ **طوطی نامہ:** اس کا ذکر فورٹ ولیم کالج کے سلسلے میں سید حیدر بخش حیدری کے کارناموں کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

۳۔ **بیتال پچیسی:** مظہر علی خاں ولا اور للو لال نے مل کر فورٹ ولیم کالج میں ۱۸۰۴ء میں یہ کتاب تالیف کی۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

۴۔ **الف لیلہ:** یہ عربی الاصل کہانیوں کا مجموعہ ہے' اور ادبیات مشرق میں بہت زیادہ مشہور ہے اس کی بے پناہ مقبولیت کی بنا پر مشرق اور مغرب کی بہت سی زبانوں میں اس کے لاتعداد ترجمے ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے مندرجہ ذیل ترجمے ہیں:

حکایات الجلیلہ: مولفہ شمس الدین احمد' مدراس' ۱۸۳۲ء اس کی کئی جلدیں ہیں اور ہر جلد میں سو راتوں کی کہانیاں ہیں۔

الف لیلہ: مترجمہ عبدالکریم' ۱۸۴۲ء اس کے چار حصے ایک جلد میں ہیں۔ پہلی ۱۸۴۷ء میں طبع ہوئی۔

الف لیلہ: مترجمہ حسن علی خان' سید الدین خان اور جعفر علی خان' مولویان دہلی کالج ۱۸۴۴ء

الف لیلہ: مولفہ حیدر علی فیض آبادی۔ حیدر علی فیض آبادی نے یہ کتاب واجد علی شاہ کے عہد میں دس جلدوں میں عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ پہلی جلد ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔

شبستان سرورۃ: مولفہ رجب علی بیگ سرور' ۱۸۶۲ء

ہزار داستان: مولفہ منشی طوطا رام شایاں۔ نول کشور پریس **لکھنؤ** سے ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے پہلے' دوسرے اور چوتھے حصے میں دو سو پچاس راتیں ہیں۔ تیسرے حصے میں دو سو کیاون راتیں ہیں' مگر وہ کچھ تو مرصع و مسجع عبارت میں ہیں' اور کچھ منظوم ہیں۔

ہزار داستان: مولفہ منشی حامد علی خان حامد۔ نول کشور پریس کانپور سے ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی۔

شبستان حیرت یا الف لیلہ شہرزاد: مولفہ مرزا حیرت دھلوی' ۱۸۹۲ء۔ اس میں ناول کے انداز پر مکالے ہیں۔ ڈھائی ڈھائی سو راتوں کے چار حصے ہیں۔

الف لیلہ: مولفہ رتن ناتھ سرشار' **لکھنؤ** ۱۹۰۱ء یہ دو جلدوں میں ہے۔ اردو کی تمام الف لیلاؤں میں سے اس میں زیادہ کہانیاں ہیں۔

الف لیلہ: مترجمہ مولوی ضیاء الحسن۔ یہ کتاب انڈین پریس الہ آباد میں گئی تھی' لیکن غالباً شائع نہیں ہوئی۔

الف لیلہ و لیلہ: مولفہ ابوالحسن منصور احمد۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک سات جلدوں میں انجمن

ترقی اردو نے شائع کی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" میں لکھتے ہیں کہ یہ اردو کی بہترین الف لیلہ ہے۔

۵۔ **آرائش محفل**: مولفہ حیدر بخش حیدری۔ اس کا ذکر فورٹ ولیم کالج کے سلسلے میں گزر چکا ہے۔

۶۔ **نوطرز مرصع**: مولفہ میر محمد حسین خان تحسین۔ اس کا ذکر باب دوم "اردو نثر شمالی ہند میں" کے ذیل میں آ چکا ہے۔

۷۔ **نو طرز مرصع**: مولفہ زریں ۱۸۰۳ء یہ بھی تحسین کی "نوطرز مرصع" کی طرح "فارسی کتاب" چہار درویش" کا ترجمہ ہے۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

۸۔ **باغ و بہار**: مولفہ میرامن۔ اس کا ذکر باب سوم میں فورٹ ولیم کالج کے ذیل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ آچکا ہے۔

۹۔ **رانی کیتکی کی کہانی**: مولفہ انشاء اللہ خان انشا۔ اس پر بحث باب دوم میں اردو نثر شمالی ہند کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

۱۰۔ **نثر بے نظیر**: مولفہ میر بہادر علی حسینی۔ اس کا ذکر بھی باب سوم میں فورٹ ولیم کالج کے ذیل میں کیا جاچکا ہے۔

۱۱۔ **مذہب عشق**: مولفہ نہال چند لاہوری۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو' باب سوم' فورٹ ولیم کالج۔

۱۲۔ **فسانہ عجائب**: یہ مرزا رجب علی بیگ سرور کی طبعزاد تصنیف ہے۔ باب دوم میں "اردو نثر شمالی ہند میں" کے ذیل میں اس پر بحث کی جاچکی ہے۔

۱۳۔ **گل صنوبر**: منشی نیم چند کھتری نے ۱۸۳۷ء میں فارسی "گل باصنوبر" سے ترجمہ کیا ہے۔

۱۴۔ **سروش سخن**: مصنفہ فخر الدین حسین سخن ۱۸۶۰ء سخن غالب کے شاگرد تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے "فسانہ عجائب" کے دیباچے میں میرامن اور اہل دہلی پر طعن کیا تھا۔ سخن نے اس کے جواب میں یہ کتاب تحریر کی۔

۱۵۔ **طلسم حیرت**: جعفر علی شیون کاکوروی نے یہ کتاب ۱۸۷۲ء میں "سروش سخن" کے جواب میں لکھی۔ شیون نثر میں مرزا رجب علی بیگ سرور کے شاگرد تھے۔ انہوں نے "طلسم حیرت" لکھ کر شاگردی کا حق ادا کیا۔

۱۶۔ **داستان امیر حمزہ**: "الف لیلیٰ" کے بعد یہ سب سے بڑی داستان ہے۔ بلکہ داستانوں کا ایک ضخیم مجموعہ ہے۔ نول کشور کی شائع کردہ داستان امیر حمزہ چھیالیس جلدوں میں ہے' اور اس

کی ہر جلد بڑے سائز کے ایک ہزار صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے' اس حساب سے اس کے کل صفحات چھیالیس ہزار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں: "اگر کوئی انہیں تمام و کمال پڑھنا چاہے تو دو سو صفحے روز پڑھنے پر تقریباً آٹھ مہینے درکار ہوں گے۔" یہ تمام جلدیں شیخ تصدق حسین' احمد حسین قمر' محمد حسین جاہ' سید اسماعیل اثر اور پیارے مرزا نے انیسویں صدی عیسوی کے آخری سالوں اور بیسویں صدی عیسوی کے شروع کے دنوں میں فارسی سے ترجمہ و ترتیب دے کر نول کشور پریس کے اہتمام سے چھپوائیں۔ یہ ایک عظیم الشان کام تھا' جو ان ادب نواز حضرات نے انجام دیا۔ ان جلدوں کے علاوہ "داستان امیر حمزہ" کے مندرجہ ذیل تین خاص ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں:

۱۔ داستان امیر حمزہ' چار حصے یکجا مجلّہ' مترجمہ خلیل علی خان اشک' کلکتہ ۱۸۰۱ء

۲۔ داستان امیر حمزہ: چار حصے یکجا مجلد' مولفہ محمد عبداللہ بلگرامی' لکھنؤ ۱۸۷۱ء

۳۔ داستان امیر حمزہ: چار حصے یکجا مجلد' مولفہ شیخ تصدق حسین' لکھنؤ ۱۸۸۷ء ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" میں لکھتے ہیں:

عبداللہ بلگرامی کی تالیف کوئی ترجمہ نہیں ہے' بلکہ انہوں نے نولکشور کی فرمائش پر خلیل علی خان اشک کے ترجمے کی زبان پر نظرثانی کی۔ نولکشور کے چوتھے ایڈیشن میں شیخ تصدق حسین نے عبداللہ والے متن کو مرزا رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" کی طرز پر مرصع عبارت میں لکھا۔(۲)

"داستان امیر حمزہ" کا بہترین نسخہ نول کشور پریس کا ترجمہ ہے۔ اردو ادب بجاطور پر فخر کرسکتا ہے کہ اس میں ایک ایسی عظیم داستان موجود ہے' جس کی مثال دنیا کے کسی ادب میں موجود نہیں۔ ہمارے ذہن میں داستان کا جو تصور قائم ہوگیا ہے' وہ اسی "داستان امیر حمزہ" کا ہے۔ اگرچہ یہ داستان فارسی سے ترجمہ ہو کر آئی ہے' لیکن اردو میں اس کے مترجمین اور مولفین نے اس میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ وہ داستان اب فارسی کی نہیں رہی' اردو کی ہوگئی۔ ہر چند کہ داستان کا عام مفہوم یہ ہے کہ اس میں طوالت ہو' لیکن "داستان امیر حمزہ" کی طوالت انتہا کو پہنچ گئی ہے' جو خوبی کے بجائے نقص قرار پائی ہے۔ اس کی اتنی زیادہ جلدیں ہیں اور اتنے لوگوں نے مختلف اوقات میں تالیف کی ہیں کہ کوئی تحقیق کا جویا ان سب کا جائزہ لیتے ہوئے پریشان ہو جاتا ہے۔ ان کے آپس میں ربط و تسلسل کا قائم کرنا بے حد دشوار ہے۔ صرف اس کے جو حصے فارسی سے ترجمے ہوئے ہیں' ان پر بھی بحث کی جائے' تو ایک دفتر چاہیے۔ فارسی کے خاص حصے یہ ہیں: (۱) نوشیرواں نامہ' (۲) ہرمز نامہ' (۳) کوچک باختر' (۴) بالا باختر'

(۵) ایرج نامہ' (٦) طلسم ہوشربا' (۷) صندلی نامہ' (۸) تورج نامہ' (۹) لعل نامہ۔ لعل نامے پر اصل داستان ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے' مترجمین یا مولفین کا اضافہ ہے۔(۳)

"داستان امیر حمزہ" کے ان دفتروں میں "طلسم ہو شربا" سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ محض اسی دفتر کی بنا پر داستان کا معیار بلند ہوگیا ہے۔ اس کے لکھنے والے محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر ہیں۔ اس کی سات جلدیں ہیں۔ ابتدائی چار جلدیں محمد حسین جاہ کی لکھی ہوئی ہیں' اور آخری تین جلدیں احمد حسین قمر کی۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں کہ "اردو میں کوئی کتاب اس کے برابر دلچسپ نہیں۔ کوئی شخص کسی بھی نظریے اور کسی بھی مزاج کا کیوں نہ ہو' ممکن نہیں کہ وہ "طلسم ہوشربا" کی کوئی جلد اٹھا لے اور آدھا صفحہ پڑھ کر رکھ دے۔ وہ مجبور ہو جائے گا کہ اسے پڑھتا رہے' جب تک کہ دوسرے اشغال اسے خواب محویت سے چونکا نہ دیں۔"

اس دلچسپی کا اصل راز ڈاکٹر گیان چند کی رائے میں اس کے مافوق الفطرت عناصر ہیں۔ "داستان امیر حمزہ" کے تمام دفتروں میں خصوصاً "طلسم ہو شربا" میں ان عناصر کی معراج ہے۔ دیو' جن' پری' عجیب الخلقت حیوان' ساحر' سحر کے حیوان' گوناگوں طلسمات کے ذکر سے پوری داستان بھری پڑی ہے۔ "ایرج نامہ" میں ایک دیو کا حلیہ یوں بیان کیا گیا ہے :

"دریا سے ایک دیو نکلتا ہے' کوئی ہزار نوسو گز کا اس کا قد ہے۔ دو سینگ سر پر مثل دو میناروں کے ہیں۔ آنکھیں مثل طاس خون کے سرخ ہیں۔ چنگال مانند شیر کے ہیں' مگر اتنا بڑا چنگل ہے کہ کئی ہاتھی اس میں آسکتے ہیں۔ منہ سے اس کے مانند ازدھائے دمان شعلہ آتش نکلتے ہیں۔ جس وقت وہ دیو دریا سے نکلتا ہے' اور شہر میں آتا ہے' آدمی' جانور جو ذی حیات سامنے اس کے آجاتا ہے' لقمہ ہو جاتا ہے۔ وہ دیو جہاں تک آدمی کھائے جاتے ہیں' کھا جاتا ہے' باقی دونوں جنگلوں میں سو سو آدمی لے جاتا ہے۔" (۴)

"طلسم ہو شربا" میں ایک جادوگرنی کا سراپا اس طرح باندھا گیا ہے :

"یہ حجرہ ہفت بلا کی دوسری بلا ہے۔ تاریک شکل کش ایک گنبد انتہا کا تاریک' ایک جانب ــــ آگ جل رہی ہے۔ ایک جانب پلٹ کر ایک دیونی کو دیکھا۔ حقیقت میں دیونی قالب انسان میں سمائی ہوئی۔ سر مثل گنبد' خام سیاہ چہرہ' نیلی کرتی' کئی تھان کا لہنگا۔ از سر تا ناخن پا بصورت دل کافر سیاہ مثل پردہ ظلمات سراسر خطا ہے۔ حقیقت میں الٹا ہوا ہے۔ زبان منہ سے نکلی ہوئی' رال ٹپک رہی ہے۔ دونوں ہاتھ زمین میں ٹیکے ہوئے بیٹھی جھوم رہی ہے۔ دس جوان ایک جانب سر جھکائے مثل برگ بید مٹکا شراب کا اٹھایا' منہ غٹ غٹ پی گئی۔ ایک جوان کی ٹانگ پکڑ کے مع استخوان چبانا شروع کیا۔ جب ایک جوان کی ٹانگ کھا چکی تب طرف خواجہ عمرو کے متوجہ

ہوئی- دیکھتے ہی اس کی صورت نحس' قریب تھا عمرو کو غش آ جائے' کانپ گیا-"

"داستان امیر حمزہ" میں دیو' ساحر' جن' پری وغیرہ کے مقابلے میں دوسرے عناصر حکیم' درویش' پیر و غیرہ ہیں' جو کرامات اور علوم غیبی کے زور سے جادو و سحر کے اثرات زائل کرتے ہیں- ان میں سے اکثر اسلام کے طرف دار ہوتے ہیں' اور قصے کے مرکزی خیال کو شر کے بجائے خیر کی طرف پھیر دیتے ہیں' اور داستان کے اصل کردار کو اڑے وقتوں میں مدد دیتے ہیں- مثال کے طور پر "نوشیرواں نامہ" میں حکیم بزرجمہر امیر حمزہ کا مشیر اور حلال مشکلات ثابت ہوتا ہے- وہ اپنے علم نجوم اور رمل کے ذریعے ہر بلا کی اصل اور اس کا علاج بتاتا ہے- اکثر حکیموں اور فقیروں کا ذکر ایسے مقاموں پر لایا جاتا ہے' جب کسی غیبی مدد کی ضرورت ہوتی ہے- "ایرج نامہ" میں شہزادہ اسد ساحروں کے پاس قید ہو جاتا ہے- اس کا عیار فرغام شیر دل تلاش میں پھرتا ہے کہ جنگل میں ایک درویش سے ملاقات ہوتی ہے:

"دیکھا کہ ایک فقیر باریش سفید بیٹھا ہوا ہے- تلاوت قرآن مجید میں مصروف ہے- فرغام بہت خوش ہوا کہ فقیر مسلمان ہے—— فرغام شیر دل نے کہا' شاہ صاحب مجھے پتا اس طرف کا بتائیے- شاہ صاحب نے ایک نقش لکھ کر دیا اور کہا کہ اسے بالائے ہوا نام اسد غازی کا لے کو اڑا دینا جس طرف یہ نقش گرے' اسی طرف چلے جانا-"

امیر حمزہ کے ہاں ایک لاکھ چوراسی ہزار عیار ہیں- جن کا سردار خواجہ عمرو ہے- ان کے پاس پیغمبروں سے ملے ہوئے کچھ بیش بہا تحفے ہیں' جن میں سے سب سے اہم زنبیل ہے- زنبیل میں کمال یہ ہے کہ یہ خود ایک دنیا ہے- اس کے اندر کتنی ہی بڑی چیز ڈال دی جاتی ہے' سما جاتی ہے' عمرو اس زنبیل میں ہر قسم کا سامان رکھ چھوڑتا ہے' جو بوقت ضرورت کام آتا رہتا ہے- عمرو عیار کا حلیہ ملاحظہ ہو:

"ایک عیار دبلا پتلا' جس کی زیرہ سی آنکھیں' طباق سا پیٹ' ناریل سا سر' کلچے سے گال' چھ گز کا دھڑ نیچے کا اور تین گز کا دھڑ اوپر کا ہے- ایک کرسی پر بیٹھا ہے-"

عمرو عیار جب جی چاہتا ہے کسی کی بھی شکل اختیار کر لیتا ہے- بعض اوقات بھیس بدل کر حسین عورت بن جاتا ہے- کہیں وہ کسی ساحر کو چرا کر اس کا پشتارہ باندھ کر ایک ہاتھ سے خنجر سے نقب کھودتا ہوا لشکر سے دور جا نکلتا ہے- کہیں لشکر مخالف کی کسی بارگاہ میں جانا ہوتا ہے تو ہاتھوں ہاتھ کوسوں تک سرنگ کھود کر منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے- غرض اس کے روپ اتنے گونا گوں ہیں کہ شمار میں نہیں لائے جا سکتے- کسی نہ کسی صورت سے اور کسی نہ کسی روپ میں وہ اپنے آقا کی ہمیشہ مدد کرتا رہتا ہے- "داستان امیر حمزہ" میں عیار کا کردار بڑا جان دار ہے' اور

پوری داستان میں ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ وہ تمام عیاروں کا سرتاج ہے' اور امیر حمزہ کا نہایت وفادار ساتھی۔

طرز تحریر: "داستان امیر حمزہ" کے لکھنے والوں میں تصدق حسین' محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر زیادہ ممتاز ہیں۔ تینوں کے طرز تحریر میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ "داستان امیر حمزہ" میں دو طرز تحریر ہیں۔ ایک باتکلف' رنگین' فسانہ عجائب کے ڈھنگ پر' دوسرا سادہ عاری۔ داستان گو اگلے آدمیوں کی صحبت میں پرورش پائے ہوئے تھے۔ انہیں "فسانہ عجائب" کا طرز ضرور مرغوب ہوگا۔ اس لیے جہاں زور دکھاتے ہیں' سرور کی طرح بولنے لگتے ہیں۔ لیکن اتنا ضخیم قصہ کسی مصنوعی طرز میں نہیں لکھا جاسکتا۔ مجبوراً سادہ رواں طرز استعال کرنا پڑتا ہے۔ رقاقت و رنگینی کا رنگ جاہ کے یہاں زیادہ ہے۔ قمر کے یہاں اس سے کم' اور تصدق حسین کے یہاں اور بھی کم ہے۔" (۵)

ان تینوں کی عبارتوں کے الگ الگ نمونے ملاحظہ ہوں:

تصدق حسین: تصدق حسین مالنون کی گفتگو کراتے ہیں:

"باجی تم بھی کس سے جھگڑتی ہو' لے ہماری ایک بات سنو۔ کل تمہارے یہاں جھٹ پٹے وقت ایک مردوا بھاری ٹوپی دبے' انکھڑیوں میں سرمہ لگائے' اجلے کپڑے پہنے' پٹون میں تیل پڑا ہوا' لباس میں عطر لگا ہوا' بانکا' نکیلا' ٹھٹھول' رنگیلا کون آیا تھا۔ وہ کچھ شرما کر' بات کو چبا چبا کر آنکھیں نیچی کر کے کہنے لگی' اوہی' تم تو کیا ننھی بنتی ہو' جیسے تم کو معلوم ہی نہیں۔ اے وہ میرے دولہ بھائی تھے۔ کل ہی تو طلسم نیرنگ سے آئے تھے۔ یہ سن کر سب نے قہقہہ مارا اور کہا کہ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ میں ہی بھول گئی' بے شک صاحب آپ کے دولہ بھائی تھے۔"

محمد حسین جاہ: "وہ پچھلی رات کا سماں' چاندنی شبنم کے گرنے سے خوب صاف ہوگئی تھی۔ روشنی جھلملا کر گل ہوگئی تھی۔ کہیں کہیں جو چراغ جلتا تھا' وہ بارخ زرد لہرا رہا تھا۔ چکور چاند پر دوڑتے تھے' پہاڑ پر طاوس رنگین ناچتے تھے۔ قدرو کہساری کے قہقہے بلند تھے۔ نازنینوں کے جسم میں پھولوں کی مہک آتی تھی۔ رات بھر کے نشے کا خمار تھا۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے نشے کے پڑے تھے۔"

احمد حسین قمر: "مصاحب سامری دھرے گئے' روح سامری کو صدمے پہنچے۔ دو دن کے اختیار پر فرعون ثانی بن گئے۔ یہ نہ سمجھے' ہر فرعونے را موسیٰ' شداد پر کیا بیداد ہوئی۔ تمام عالم سے جواہر جمع کیا۔ باغ بہشت بنوایا۔ آخر سیر کا قصد کیا۔ دل میں یہ تھا کہ میں خداوند ہوں۔

اپنے بہشت کی سیر دیکھوں- جب در باغ پر پہنچا' اس حال سے ماہر نہ تھا- ایک قدم اندر ایک باہر تھا- کہ قبض روح کا حکم ہوا- ساری خداوندی بھولے- آرزوئے سیر باغ میں ایسے پھولے' باغ کی سیر نہ دیکھ سکے- نہ پھولے' نہ پھلے' حسرت لے کر باغ دنیا سے چلے- ایک کو ایک جاتا ہے- ہر ایک بسر رنگ دنیا کو پہنچاتا ہے- دام میں دنیا کے ضرور پھنستا ہے- عیش و آرام دنیا دیکھ کر جانتا ہے کہ کبھی نہ مروں گا- ہمیشہ عیش و آرام کروں گا-"

اوپر کے تینوں داستان گویوں کی عبارتوں کے مختصر اقتباسات سے یہ اندازہ لگانا تو ذرا دشوار ہے کہ ان کی طرز تحریر میں نمایاں فرق کیا ہے' البتہ اتنا پتا ضرور چلتا ہے کہ ان تینوں کی طرز سادگی کی طرف مائل ہے- کہیں کہیں اگرچہ تصنع کا رنگ پایا جاتا ہے' وہ طبیعت پر بار نہیں گزرتا- داستان کے ساتھ جو قدامت کا مفہوم وابستہ ہے' وہ اس میں شدت سے نمایاں نہیں ہوتا' اور ہمارے خیال میں یہی ان اساتذہ فن کا کمال ہے-

۱۷- **بوستان خیال:** یہ داستان اصل میں فارسی زبان میں ہے' اور میر محمد تقی خیال کی تصنیف ہے- اس کی کل نو جلدیں ہیں خیال نے محمد شاہ کے عہد (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) میں اس کی دو جلدیں "مہدی نامہ" اور "اسماعیل نامہ" لکھی تھیں- اس کے بعد وہ مرشد آباد' بنگال چلے گئے تھے' جہاں انہوں نے اس کی باقی سات جلدیں پوری کیں- پہلی جلد "مہدی نامہ" ۱۷۴۲ء میں دہلی میں شروع ہوئی تھی' اور آخری جلد ۱۷۵۵ء میں مرشد آباد میں ختم ہوئی- اس طرح گویا پوری داستان تیرہ سال کے عرصے میں تکمیل کو پہنچی-

"داستان امیر حمزہ" کی طرح "بوستان خیال" بھی بہت ضخیم داستان ہے- اردو میں بہت سے لوگوں نے اس کے ترجمے کئے ہیں' جن میں سب سے پہلا ترجمہ "زبدۃ الخیال" ہے- اس کو عالم علی نے مرتب کیا- انہوں نے تمام "بوستان خیال" کو بڑے سائز کے ۴۱۰ صفحوں کی ایک جلد میں خلاصہ کر دیا ہے- بھاگلپور میں ۱۸۴۰ء میں مرتب ہوا' اور ۱۸۴۴ء میں پہلی بار چھپ کر شائع ہوا- لیکن "بوستان خیال" کے سب سے مشہور ترجمے خواجہ امان اور آغا ہجو کے ہیں-

کہا جاتا ہے کہ "بوستان خیال"' "داستان امیر حمزہ" کے جواب میں لکھی گئی ہے- اس بنا پر یہ داستان نقش اول سے بہتر ہونی چاہیے تھی' لیکن حقیقت میں ایسی نہیں ہے- "داستان امیر حمزہ" کے مقابلے میں اس کی حیثیت ثانوی ہے لیکن بقول کلیم الدین احمد : بہرکیف "بوستان خیال" میں اتنا ضرور ہے کہ "طلسم ہوش ربا" کے بعض نقائص سے ہمیں سابقہ نہیں پڑتا- وہ تکلف' وہ مبالغہ' وہ مضامین پریشان کن کی تکرار' وہ الفاظ و نقوش کا ناموزوں سیلاب یہاں نہیں- نسبتاً یہاں اعتدال' انتخاب' اختصار سے کام لیا گیا ہے- اس لیے پہلی نظر میں داستان

زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔"(۶) اس کے علاوہ "بوستان خیال" میں دو باتیں ایسی ہیں، جو اسے "داستان امیر حمزہ سے ممتیز کرتی ہیں۔ ایک اس کی "واقعیت" ہے، جس سے "تمہید و بیان قصہ میں تاریخ گزشتہ کا لطف آئے۔ ناقابل یقین چیزیں بدیہی ہو جاتیں اور مافوق الفطرت اشیا فطری نظر آئیں۔ دوسری اس کی "علمیت" ہے۔ "بوستان خیال" میں مصنف کی قوت دماغی اور اکتساب علم و فضل حرف حرف سے پیدا ہے۔ اس میں ہر جگہ "علمیت" نمایاں ہے، اور پڑھنے والے اس کی اس علمیت سے بہت متاثر اور مرعوب ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں "داستان امیر حمزہ" میں یہ "علمیت" نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں ایسی خامیاں اور غلطیاں پائی جاتی ہیں، جن کی وجہ مصنف میں علم و فضل کی کمی ہے۔ "بوستان خیال" میں اس قسم کی خامیاں اور غلطیاں نہیں ملتیں۔"(۷)

"بوستان خیال" میں "علمیت" کا یہ رنگ اس کی دوسری جلد میں زیادہ نمایاں ہے۔ یہ جلد زیادہ تر طلسم اجرام و اجسام پر مشتمل ہے۔ علم نجوم، علم ہندسہ، علم رمل، علم حساب، علم سیمیا و ریا اور علم جفر وغیرہ پر پوری تفصیل سے اس میں بحث کی گئی ہے۔(۱۰) تاہم یہ امر مسلمہ ہے کہ اس قسم کی علمی قابلیت اور مثلاً مظاہرہ کرنے کے لیے داستان جیسے ادب کو تختہ مشق بنانا نازیبا ہے۔ اس سے داستان کے حسن و خوبی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ نقص پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے "بوستان خیال" کی قدر و قیمت بحیثیت داستان کے داستان امیر حمزہ سے کم ہے۔

"واقعیت" اور "علمیت" سے قطع نظر "بوستان خیال" میں ہر جگہ "داستان امیر حمزہ" کے اثرات نظر آتے ہیں۔ قصے کے اشخاص، واقعات اور بیانات قریب قریب وہی ہیں، جو "داستان امیر حمزہ" میں ہیں۔ اس میں بھی امیر حمزہ کی طرح کئی صاحبقران پیدا ہوگئے ہیں۔ اس میں صاحبقران اکبر معزالدین، صاحبقراں اصغر اور صاحبقراں اعظم کے نام سے تین ہیرو پیدا کئے گئے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی کردار کے لحاظ سے امیر حمزہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "بوستان خیال"، "داستان امیر حمزہ" کی نقل ہے، اور ظاہر ہے، یہ نقل کبھی اصل کے برابر نہیں ہوسکتی۔

"داستان امیر حمزہ" کی طرح "بوستان خیال" میں بھی عیار قصے کے جزو لاینفک ہیں۔ مثلاً صاحبقران اکبر کا عیار ابوالحسن جوہر ہے۔ یہ جوان، حسین، طاقتور اور ظریف ہے، اور اسے سلطان کا خطاب بھی دیا گیا ہے، لیکن اس کا "داستان امیر حمزہ" کے عمرو عیار سے کوئی مقابلہ نہیں۔ اس کی فطرت میں وہ عیاری اور وہ بزرگی نہیں، جو خواجہ عمرو عیار میں ہے۔ صاحبقران اصغر بدر منیر کا عیار مہتر توفیق ہے، جو عمرو عیار کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ جواں

ہے۔ اسے بھی کچھ تحفے ملتے ہیں، جن سے یہ کام بھی لیتا ہے۔ اس کے پس جامہ منقش ہے، جس کی وجہ سے صورت بدلنا، ہوا پر اڑنا، پانی پر چلنا، یا اسی قسم کا کوئی غیر معمولی کام انجام دینا ممکن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے زنبیل، کمند حبل المتین، اور نظر سے غائب کرنے والی انگوٹھی ہے۔ جہاں تک لالچ کا تعلق ہے، یہ عمرو عیار سے ہرگز کم نہیں۔ حکیم بزرگ دانش سے اسے تحفے ملتے ہیں، لیکن یہ اس کے غلام کا لبادہ بھی اتار لینا چاہتا ہے۔ صاحبقران اعظم کا عیار مہتر سریع السیر ہے۔ اس کو بھی کچھ اسی قسم کے تحفے مل جاتے ہیں، جن سے عیاری میں مدد ملتی ہے لیکن وہ انہیں استعمال میں نہیں لاتا۔ سریع السیر ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔ ملازم پیشہ ہے۔(۸) بایں ہمہ "بوستان خیال" کا کوئی عیار "داستان امیر حمزہ" کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔

"بوستان خیال" کا ایک بڑا نقص اور عیب یہ ہے کہ اس میں فحش نگاری بہت زیادہ ہے۔ اس میں عیار کے تینوں کردار نہایت عاشق مزاج اور عیش پرست ہیں۔ وہ بعض موقعوں پر بدترین ہوس پرستی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ صاحبقران اصغر ایک موقع پر سب کے سامنے متعدد کنیزوں سے اختلاط کرتے ہیں، جہاں ان میں اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ اس میں کافروں کو اکثر انہی بری حرکتوں میں دکھایا گیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے بوستان کی ان فحش نگاریوں کی اس طرح توضیح کرنے کی کوشش کی ہے:

> "اگلے مصنفین دماغی صحت سے بہرہ مند تھے۔ وہ روحانی اور جذباتی توازن رکھتے تھے، اور ان نئی چیزوں کی صحیح قدر و قیمت ان کے موزوں مقام و تناسب سے واقف تھے۔ اس لیے وہ جنسی تعلقات کے بیان میں مبالغہ، زیادتی، ناموزونیت اور اس قسم کے نقائص کے مرتکب نہیں ہوتے۔ وہ قصوں کے ذریعہ اپنے غیر صحت مند میلانات کا نکاس نہیں چاہتے۔ انہیں میلانات کے لیے کسی مصنوعی نکاس کی ضرورت نہیں۔ وہ جنسی تعلقات، واقعات اور میلانات کا ذکر نہایت ہوشمند اور صحت مند طور پر کرتے ہیں۔"(۹)

لیکن یہ غالباً کلیم الدین احمد کی خوش فہمی ہے۔ "بوستان خیال" میں فحاشی اور عریانیت کا جو مظاہرہ کیا گیا ہے، اس کی مثال اردو ادب میں ملنی مشکل ہے۔

حواشی

۱۔ داستان پر بحث تاریخی لحاظ سے سرسید کے عہد سے پہلے ہونی چاہیے تھی، لیکن ہم نے اسے بعد میں اس لیے رکھا کہ ناول، ڈراما اور افسانہ کے ساتھ ربط قائم رہے۔ اصل میں داستان،

ناول' ڈراما اور افسانہ ایک ہی سلسلے کی چار کڑیاں ہیں۔ اردو ادب میں داستان سب سے پہلے وجود میں آئی۔ اس کو زوال آیا تو اس کے تخم سے ناول پیدا ہوا۔ ناول کے ساتھ ساتھ ڈراما نے اس سے اپنے گل بوٹے حاصل کئے۔ افسانہ جو حال کی پیداوار ہے' ان تینوں اصناف ادب کا خوشہ چین ہے۔ اس بنا پر افسانوی ادب کے ان چاروں عناصر ترکیبی کا اگر ایک ہی جگہ بیان ہو' تو اس کی رفتار ترقی کو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔

یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ دوسری جگہ ہم نے پہلے ادبی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے' پھر ان شخصیتوں کے ماتحت ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن داستانوں کے بیان میں اس اصول کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ یہاں پہلے داستانوں کا ذکر کیا گیا' پھر داستان نویسوں سے زیادہ مشہور ہیں۔ داستانوں سے لوگ واقف تو ہیں' لیکن داستان نویسوں کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ اس لیے یہ فطری تقاضا ہے کہ داستانوں کا ذکر پہلے آئے' پھر داستان نویسوں کا۔

۲۔ داستانوں کے ماخذ اور اصل کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیقی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

۳۔ اردو کی نثری داستانیں' صفحہ ۱۸۱۔

۴۔ اردو کی نثری داستانیں' صفحہ ۲۵۹

۵۔ اردو کی نثری داستانیں' صفحہ ۳۱۴

۶۔ فن داستان گوئی' صفحہ ۱۱۱

۷۔ فن داستان گوئی' صفحہ ۱۱۰

۸۔ اردو کی نثری داستانیں' صفحہ ۳۳۶۔

۹۔ اردو کی نثری داستانیں' صفحہ ۳۴۶ - ۳۴۹

۱۰۔ فن داستان گوئی' صفحہ ۱۳۷ - ۱۳۸۔

داستانوں کی عام خصوصیات

داستان اردو کے نثری ادب کی قدیم یادگار ہے۔ انیسویں صدی کے ایک مخصوص وقت اور ماحول میں اس کا آغاز ہوا، تیزی سے پروان چڑھی، اور پھر جلد اس کا زوال ہوگیا۔ اس کے بعد نئے زمانے کے نئے تقاضے کے مطابق ناول نے اس کی جگہ لے لی۔ اردو داستانوں میں کچھ تو مختصر ہیں اور کچھ طویل۔ پچھلے صفحات میں ان دونوں قسموں کی داستانوں کا مختصر طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اب ذیل میں ان داستانوں کی عام خصوصیات کا جائزہ لیا جاتا ہے:

۱۔ **آغاز داستان میں تاریخ کا لطف:۔** عام طور پر داستانوں کا آغاز کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس سے تاریخ کا لطف حاصل ہونے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داستان نویس کوئی اہم تاریخی واقعہ لکھنا چاہتا ہے۔ اگرچہ آگے چل کر جب سحر و طلسمات کا بیان شروع ہوتا ہے، یہ واہمہ دور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ "داستان امیر حمزہ" کا آغاز قباد اور نوشیران کے بیان سے ہوتا ہے، اور "بوستان خیال" کے شروع میں امام جعفر صادقؒ اور ان کی اولاد کا ذکر ہے۔

۲۔ **طوالت:۔** داستان کو طول دے کر اس قدر وسعت پیدا کر دینا کہ پڑھنے والے یا سننے والے ایک بحر بے کراں میں غوطہ کھانے لگیں، داستانوں کی بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ اس خوبی کو قائم کرنے کے لیے قصہ در قصہ اور ضمنی کہانیوں کے ذریعے داستان کو پیچیدہ کر دیا جاتا ہے۔ داستان کی دلچسپی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ پڑھنے والوں یا سننے والوں کو زیادہ سے زیادہ دیر تک انجام کا مشتاق بنائے رکھنا، داستان کا فن ہے۔

۳۔ **پلاٹ کی یک رنگی:۔** داستانوں کی یہ ایک عام خصوصیت ہے کہ ان کے پلاٹ میں تنوع نہیں پیدا ہوتا۔ ہر داستان میں ایک فرسودہ طریقہ پایا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کوئی شہزادہ کسی شہزادی کے بارے میں، جو کہیں ہزاروں کوس کے فاصلے پر رہتی ہے، سن کر اس کے دام محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے، پھر اس کی تلاش میں گھر سے نکل پڑتا ہے۔ راستے میں ہر قسم کی بلاؤں کا سامنا ہوتا ہے۔ مگر وہ اس قدر بہادر اور دلیر ہوتا ہے کہ اپنی داد شجاعت دے کر ان تمام بلاؤں

اور مصائب پر قابو پا جاتا ہے۔ ایک مدت دراز کے بعد منزل مقصود کو پہنچ جاتا ہے' اور اپنے معشوق پر قابو پا جاتا ہے۔ لیکن وہ بہت ہی عارضی ہوتا ہے' اور اسے پھر نئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیو' جن' طلسمات اور نہ جانے کیا کیا مصیبتیں اس کے مقصد میں حائل ہوتی ہیں لیکن شہزادہ کبھی ہمت نہیں ہارتا۔ وہ برابر مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی پیر' فقیر' حکیم کی کرامات سے وہ بچ نکلتا ہے اور بعض اوقات غیبی امداد بھی اسے حاصل ہو جاتی ہے۔ آخر کار ظفر و فتح مندی اسی کو ملتی ہے۔

۴۔ **مافوق الفطرت عناصر:۔** مافوق الفطرت عناصر داستانوں کے جزو لاینفک ہیں۔ جن' دیو' پری' جیسے غیر مرئی عناصر کو جب تک مخالف گروہ میں شامل نہ کیا جائے' اور سحر و طلسمات کے کرشمے نہ دکھائے جائیں' یا پیر' فقیر' اور حکیم کی کرامات کے زور سے ہیرو کو مصیبتوں سے نجات نہ دلائی جائے' اور اتفاقات یا غیبی امداد سے اس کو مطلب براری میں سہارا نہ دیا جائے' اس وقت تک کوئی داستان مکمل نہیں ہوتی۔ یہ باتیں بجائے خود بری نہیں ہیں' نہ ہماری داستان حیات میں ان کا شامل ہونا ہمیں ناگوار گزرتا ہے' بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کائنات رنگ و بو ان اشیا کے وجود سے خالی نہیں ہے' اور نہ کوئی مذہبی کتاب ان چیزوں کے ذکر سے عاری ہے' لیکن موجودہ دنیا کے حالات' اور جدید زمانہ اور معاشرے کا کیا علاج کہ ان چیزوں پر ہرگز یقین نہیں کرتے۔ جدید دنیا کے لوگ نہ دیو' جن یا پری کو مانتے ہیں' نہ سحر و طلسمات کو تسلیم کرتے ہیں' اور نہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ پیر' فقیر' اولیا کی کرامات یا غیبی امداد کوئی چیز ہے۔ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ جو ہمیں نظر نہیں آتا' اس کو ہم کیسے باور کرسکتے ہیں؟ البتہ عوام الناس کو اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ داستان میں ان عناصر کا جن کو لوگ غیر فطری کہتے ہیں' شامل ہونا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ داستان پڑھتے وقت ہر کوئی تھوڑی دیر کے لیے ایک دوسری دنیا میں کھو جاتا ہے' اور تکلیف کی زندگی سے فرار حاصل کرنے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ زمانے کی قدریں بدل گئیں۔ یہ بات صحیح ہے' لیکن ہمارا خیال ہے' اردو ادب کی یہ پرانی قدریں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

۵۔ **کرداروں کا تعلق طبقہ بالا سے:۔** داستانوں میں ہیرو عموماً شہزادے ہوتے ہیں۔ ان میں بادشاہوں' ان کی معرکہ آرائیوں اور جنگ آزمائیوں کا بیان ہوتا ہے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کا ذکر کہیں ہے' تو وہ نہایت مختصر اور نہایت ضمنی' ملازم' خواجہ سرا' انا' دائی' مغلانی' مہری وغیرہ کو سامنے لائے بغیر طبقہ اعلیٰ کی شان و شوکت اور جاہ و حشمت پوری طرح نمایاں نہیں ہوتی۔ محض اسی صورت کی بنا پر داستانوں میں ان کو جگہ دی جاتی ہے۔ ان کی کوئی آزاد ہستی نہیں ہے۔

داستان نویسوں کا ماحول بھی اسی طبقہ اعلیٰ کا تھا۔ اس لیے ان کی تفریح طبع کی خاطر کردار کی حیثیت سے داستان میں انہیں کو لانا تھا۔ اس کے علاوہ عشق و محبت، عیش و نشاط بھی بڑے لوگوں کی ہی زندگی کا جزو ہے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کو اس کے لیے فرصت کہاں، داستان میں ہیرو اگر کوئی شہزادہ ہے، تو ہیروئن کوئی شہزادی، جو بے پناہ حسن، سچے عشق اور دوسری خوبیوں کی مالک ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ وزیر زادے اور وزیر زادیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ شہزادیاں یا وزیر زادیاں نہ ہوں تو عشق و محبت کا تختہ عمل پریاں بنتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ بھی حسن کی پتلیاں ہوتی ہیں۔ داستان کی جو مقتضیات ہیں، عوام کی زندگی میں ان کا گزر نہیں۔

۶۔ **مذہب :۔** داستان نویس عموماً چونکہ مسلمان ہیں، اس لیے داستانوں میں مذہب کا عنصر شامل رہتا ہے۔ ان میں ہیرو ہمیشہ غالب رہتا ہے، اور مذہب اور ایمان کا رکن رکین اور حامی ہوتا ہے۔ "داستان امیر حمزہ" اور "بوستان خیال" میں ہیروؤں کو کافروں سے مقابلہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس سے ان کا اصل مقصد تبلیغ اسلام ہے کہیں ہیرو اگر غیر مسلم ہے، تو اس سے اسلامی روایات اس طرح وابستہ کر دی جاتی ہیں کہ وہ لامحالہ مسلمان معلوم ہونے لگتا ہے۔ حاتم طائی کی مثال لے لیجئے۔ وہ مسلمان نہیں تھا، لیکن اس کے کردار کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ہر قاری کے تحت الشعور میں ہمیشہ یہی خیال رہتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔

۷۔ **عریانی :۔** داستانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں کس قدر عریانیت پائی جاتی ہے۔ داستان نویس کچھ ایسے ماحول میں سانس لیتے تھے جہاں ان کا احساس جنسیت بہت تیز اور بیدار ہوتا تھا۔ وہ اپنی داستانوں میں بھی اس کا ذکر بڑی آب و تاب کے ساتھ کرتے تھے۔ سننے والوں کا مذاق بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ اس لیے داستان نویس کچھ تو اپنی تشنگی کو بجھانے کی خاطر، اور کچھ سننے والوں کی خاطر جنس سے متعلق ساری باتیں بعض اوقات تشبیہات و استعارات کے پردے میں، اور بعض اوقات بالکل کھلم کھلا بیان کرتے تھے۔ "بوستان خیال" میں ان چیزوں کی نمائش سب سے زیادہ ہوئی ہے۔

۸۔ **داستان :** اگرچہ ایک بے عملی اور آرام طلب سوسائٹی کی پیداوار ہیں، لیکن یہ خود عمل اور زندگی کی ہماہمی سے بھرپور ہیں۔ جنگ و جدل، جذبہ انتقام، مقصد براری کے لیے تگ و دو اور گوہر مقصود کو پانے کے لیے جدوجہد ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان میں ٹھہراؤ کہیں نہیں۔ ہیرو سفر میں جاتا ہے، تو اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اب سب کا جان توڑ کوشش سے مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کرتا ہے۔ ان میں عیاروں کی کارستانیاں دیکھنے کے قابل ہیں۔ طلسمات کا چکر جب چلتا ہے، تو ان کی زد سے کیسے بچ نکلتا ہے، یہ بڑا دلچسپ ہے۔ الغرض

داستانوں میں ہر جگہ زندگی سرگرم عمل نظر آتی ہے۔

۹۔ ہر چند کہ داستانوں میں دور از کار باتیں اور مافوق الفطرت عناصر پائے جاتے ہیں، تاہم ان میں وقت اور معاشرہ کی عکاسی بخوبی ہوتی ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں برصغیر کا جو معاشرہ تھا، اور جو تہذیب رائج تھی، اس کا خاکہ ان داستانوں میں ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند :
"داستان امیر حمزہ کا لکھنوی ترجمہ تو لکھنؤ" کی تہذیب کی ایک ناموس ہے —— امیر حمزہ سے ساحری اور عیاری نکال لیجئے۔ باقی جو رہے گی، وہ لکھنؤ کی تہذیب ہے۔"(۱)

۱۰۔ رومانیت :۔ داستانوں کی فضا عموماً رومانوی ہوتی ہے۔ اس کا تانا بانا کچھ ایسے اشخاص، ماحول اور واقعات سے قائم ہوتا ہے، جن سے ایک رومانوی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ تاج الملوک، بکاؤلی، آزاد بخت، بہزاد، نعمان، جانعالم، مہر انگیز، ایرج، بدیع الزمان، علم شاہ وغیرہ ایسے اشخاص کے نام ہیں، جن سے ہمیں عام زندگی میں کوئی سابقہ نہیں پڑتا۔ ان ناموں کے ساتھ کچھ ایسا تصور ذہن میں قائم ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنی دنیا سے الگ ہو جاتے ہیں۔ جن، پری، دیو، جادو، وغیرہ بھی تو ہمارے لیے حیرت و تعجب کا باعث ہوتے ہیں۔ جگہوں کے نام لیجئے۔ ان کا بھی یہی عالم ہے۔ ختن، چین، یمن، سراندیپ، زیرباد، نیروز، کوچک باختر، بالا باختر، طلسم نادر فرنگ، ہزار برج، نور افشاں، زعفران زار سلیمانی، چاہ زمرد، پردہ ظلمات، گنبد سامری وغیرہ ایسے مقامات ہیں، جو داستانوں ہی کے لیے مخصوص ہیں۔ ان میں سے بعض مقامات پر تو آج ہوائی جہاز سے کوئی پہنچ سکتا ہے، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں یہ ممکن نہ تھا، اس لیے ان مقامات کے نام بھی ہمیں عالم تخیل میں پرواز کرنے کے لیے بہت ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ داستانوں میں واقعات بھی ہمیشہ عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں ہم ان واقعات سے دوچار نہیں ہوتے۔ اس لیے داستانوں کے واقعات بھی وہ جنگل ہیں، جن میں انسان فرار اختیار کر سکتا ہے۔

۱۱۔ ایثار :۔ داستانوں میں ایثار کا مادہ بھی پایا جاتا ہے۔ ہیرو، عموماً شہزادے ہوتے ہیں، وہ سفر کی صعوبتیں اٹھاتے ہیں اور نہ جانے کن کن مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ بہت حد تک اپنے لیے کرتے ہیں، لیکن کچھ دوسروں کے لیے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً باغ و بہار کا دوسرا درویش نیروز کے شہزادے کے لیے اپنی ملکہ بصرہ کے پاس واپس نہیں جاتا، اور صحرا نوردی کرتا رہتا ہے۔ سگ پرست نے اپنے بھائیوں کی شرارتوں کو کس فراخدلی اور شرافت سے برداشت کیا ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ داستانوں سے بعض اوقات ہمیں ایثار اور ہمدردی کا سبق ملتا ہے۔

۱۲۔ تاثیر:۔ اچھے ادب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر ایک گہرا اثر پڑتا ہے۔ داستانیں بھی اس تاثر سے خالی نہیں ہیں۔ یہ بھی قاری کے دل و دماغ پر کچھ عمل کرتی ہیں۔ اس اثر کا ایک رخ اخلاقی بھی ہے۔ داستان پڑھتے پڑھتے ہمارے اندر غیر شعوری طور پر انسانی ہمدردی پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ ہمدردی خاص طور پر اس کے ہیرو اور ہیرو کے ساتھیوں سے ہوتی ہے۔ پوری داستان میں ہم ان کے دکھ درد اور خوشی کا ساتھ دیتے ہیں۔

۱۔ اردو کی نثری داستانیں، صفحہ ۲۴۹

داستانوں کی زبان اور طرز بیان

اردو ادب کی نثری داستانیں اس عہد کی پیداوار ہیں' جب کہ ادب میں تکلف و تصنع کو صرف جائز ہی نہیں' بلکہ کمال سمجھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں لوگ عربی اور فارسی سے اس قدر بے بہرہ نہیں ہوتے تھے' جتنے کہ آج ہیں۔ اس لیے ادب میں تکلف و تصنع بھی ہوتا تھا اور اس میں عربی' فارسی کے الفاظ بھی بکثرت استعمال ہوتے تھے۔ داستانوں میں تو بہرحال تصنع و تکلف کی زیادہ گنجائش نہ تھی۔ اس لیے کہ طوالت کی خاطر ان میں زیادہ محنت اور کاوش سے کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ صرف چند مختصر داستانیں البتہ ایسی ہیں کہ تصنع و تکلف برتا گیا ہے۔ ان میں ایک مرزا رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" ہے۔ طویل داستانوں میں یہ چیز بہت کم ہے۔ کہیں کہیں داستان نویس کو جب اپنی طبیعت کی جولانی دکھانی مقصود ہوتی تھی پر تصنع اور پرتکلف عبارت لکھنے پر اتر آتے تھے۔ لیکن زبان میں عربی' فارسی کے الفاظ تقریباً سب ہی زیادہ استعمال کرتے تھے۔ اس لیے زمانہ کا مذاق ہی ایسا تھا۔ بلکہ وہ عربی فارسی کے الفاظ کا استعمال نہ کرنا اپنے لیے باعث عار سمجھتے تھے' اہم داستانوں کی عام خصوصیت جو ہے' وہ سادگی ہے' بیان تقریباً ہر جگہ سادہ ہوتا ہے' تاکہ سامعین کو داستان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ داستانوں کی زبان میں اگرچہ ذرا قدامت کی بو پائی جاتی ہے' لیکن سادگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ داستانوں میں بیانات کی بڑی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ بزم' جشن' سواری' برات' رقص' موسیقی' شکار وغیرہ داستانوں کے عام موضوع ہیں۔ قدرتی مناظر جو صحرا' ریگستان' باغ سبزہ زار وغیرہ کے بیانات اس قدر شاعرانہ انداز میں ملتے ہیں کہ یہ داستانوں کے لیے طرہ امتیاز بن کر رہ جاتے ہیں۔ داستانوں میں کہیں کہیں جذبات نگاری سے بھی کام لیا جاتا ہے' لیکن یہ رنگ بہت ہلکا ہوتا ہے۔ داستان نویس جذبات کی گہرائیوں میں غوطہ لگانے کے زیادہ قائل نہ تھے' بلکہ محاکاتی انداز میں طوالت کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔

تیسری بات یہ ہے کہ داستانوں میں مزاح و ظرافت کا پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ داستان ہرگز داستان نہ ہوتی اگر اس میں مزاح و ظرافت کی چاشنی نہ ہوتی۔ "داستان امیر حمزہ" اور "بوستان خیال" میں مزاح و ظرافت کا جزو گویا جزو اعظم ہے۔ داستان کا عام تصور اور اس کی جزئیات دونوں میں ظرافت کی کارفرمائی ہے۔ جن' دیو' پری' جادو' جادوگر' طلسمی اشیا ان سب میں مزاح کا پہلو شامل ہے۔ ہمیں یہ سب پڑھ کر حیرت و استعجاب کے ساتھ ہنسی بھی آتی ہے اور ادبی لطف و سرور بھی حاصل ہوتا ہے۔ داستانوں میں عیار تو گویا پیشہ ور ظریف ہیں۔ صرف ہنسنا ہنسانا ہی ان کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ مزاح و ظرافت کو علیحدہ کر کے داستانوں میں ان کا وجود بالکل بے کار ہے۔ ان کے عادات و اطوار' حلیہ حرکت ایسی ہوتی ہے کہ لوگ ان پر بے تحاشا ہنستے ہیں لیکن وہ خود بھی بعض اوقات لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان پر خندہ زن ہوتے ہیں۔ اس طرح داستانوں میں ایک گونہ ادبی چاشنی ملتی ہے۔

اردو ادب کے نثری سرمایے میں داستانوں کی اہمیت اس طرح بھی بہت زیادہ ہے کہ ان داستانوں میں پہلی مرتبہ اردو نثر کا وسیع پیمانے پر استعمال ہوا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں اردو کے نثری ادب کا سرمایہ بہت قلیل تھا۔ ان داستانوں نے اس میں گراں بہا اضافہ کیا۔

ناول

تمہید:- ناول انگریزی لفظ ہے۔ اردو قصے کہانیوں پر جب انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں انگریزی ادب کے اثرات پڑنے لگے' تو یہ نام بھی اردو میں چلا آیا۔ فن کے لحاظ سے ناول اس قصے کو کہتے ہیں' جس میں کسی نقطۂ نظر کے تحت زندگی' سماج اور معاشرہ کی عکاسی کی گئی ہو۔ اردو میں ناول کی بنیاد انیسویں صدی عیسوی میں داستانوں کے ذریعے پڑ گئی تھی۔ مختصر داستانیں خاص طور پر ناول سے قریب ہیں۔ انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" ایسی مختصر داستانیں ہیں جن کا پرتو ناول پر پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کے قصے وجود میں آتے ہیں' جو داستانی ادب کی ترقی یافتہ حکایتیں ہیں' اور ناول سے بہت قریب ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ان قصوں کو اگرچہ بعض لوگ' جن میں ڈاکٹر احسن فاروقی پیش پیش ہیں' ناول نہیں مانتے' بلکہ تمثیل نگاری سے تعبیر کرتے ہیں۔(۱) لیکن اس پر کسی کو اعتراض نہیں کہ وہ اردو ناول کے اولین نقوش ضرور ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد اور ان کی تصانیف خصوصاً ان کے قصوں پر پچھلے صفحات میں بحث کی گئی ہے۔ ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان قصوں کو اگر ناول مان بھی لیا جائے' تو ناول کے فن کو کیا نقصان پہنچ جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ قصے ناول کے جدید اصول اور معیار پر پورے نہیں اترتے' لیکن ناول کے دائرے کو اگر تھوڑی سی وسعت دے دی جائے' تو یہ بھی ناول کہلانے کے مستحق ہو جائیں گے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے یہ قصے ان سے پہلے کی داستانوں سے یقیناً مختلف ہیں۔ ان داستانوں میں رومانیت غالب تھی' فوق الفطرت عناصر کی بھرمار تھی' لیکن قصوں کو ان چیزوں سے پاک کرنے کی پہلی کوشش ڈپٹی نذیر احمد نے ہی کی ہے۔ ان کے زمانے میں مغربی تہذیب اور معاشرت کے ساتھ برصغیر میں مغربی ادب کا بھی نفوذ ہونے لگا تھا۔ اس لیے جدید

صنف ادب "ناول" سے لوگ آشنا ہونے لگے تھے' اور غالباً ڈپٹی نذیر احمد بھی زندگی کے نئے
تقاضوں سے بے خبر نہ تھے لیکن ان کا مقصد شعوری طور پر ناول لکھنا نہ تھا' بلکہ ایسا ادب لطیف
پیدا کرنا تھا' جن کے مطالعہ سے صنف نازک کے اخلاق اور کردار سنورتے' اس لحاظ سے ان
کے وہ قصے مقصدی تھے۔ مولانا کا دل و دماغ خالص مشرقی تھا۔ اس عہد کے دوسرے ادیبوں کی
طرح وہ اپنے آپ کو نئی تہذیب کی رو میں پوری طرح بہانا نہیں چاہتے تھے۔ ان میں قدرے
رجعت پسندی پائی جاتی ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کی یہ رجعت پسندی ناقابل تحسین
نہیں۔ ان کے قصوں میں مذہبی رنگ چھایا ہوا ہے۔ معاشرہ کی اصلاح کے لیے ان کا یہ نقطہ نگاہ
بڑا قابل قدر ہے۔ انہوں نے اپنے قصوں میں مثالی کردار پیش کر کے طبقہ نسواں کو زندگی کے
نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے قصوں میں بہت سی باتیں ایسی ہیں' جو انہیں خالص داستانی ادب سے ممیّز
کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے قصوں کو ایسا روپ دیا ہے کہ انہیں ناول ہی کہنا زیادہ مناسب ہے۔
جمہور نے انہیں ناول ہی کہا ہے' اور ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا اولین ناول نگار مانا ہے۔ ہمیں بھی
ان سے اتفاق ہے۔

اردو کے ادب لطیف کی تاریخ میں ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت گویا ایک موڑ کی حیثیت رکھتی
ہے۔ ان کے قصے قدیم وجدید کا سنگم ہیں۔ ان میں بعض خصوصیات ایسی ہیں' جو پرانے ادب کا
طرہ امتیاز ہیں' لیکن زیادہ باتیں ایسی ہیں' جو عہد نو کے ادب کی صفات ہیں۔ اس لیے اردو ناول
کا آغاز ہم ان ہی سے مانتے ہیں۔ اردو قصے کہانیوں کو سب سے پہلے کس نے ناول کا نام دیا'
اس کا پتا لگانا دشوار ہے' لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے زمانے میں ہی اس کا چرچا ہونے لگا تھا۔

نواب سید محمد آزاد

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے قصوں سے ناول نگاری کی بنیاد ڈال دی تھی۔ ان کے بعد ۱۸۷۸ء
میں ڈھاکا کے نواب سید محمد آزاد نے "نوابی دربار" کے نام سے ایک ناول لکھا۔ جو لکھنؤ کے
مشہور مزاحیہ پرچہ "اودھ پنچ" میں بالا قساط شائع ہوا۔ اس میں زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کا
مرقع کھینچا گیا ہے۔ اس میں ایک عیش پسند اور احمق رئیس کی بدانتظامی اور ان کے مصاحبین کا
ان کو بے وقوف بنا کر لوٹنا دکھایا گیا ہے۔(۲)

"نوابی دربار" میں ناول کی بہ نسبت ڈرامائی شان زیادہ نمایاں ہے۔ "جس طرح دربار کے
پردے میں مردوں کے پیرائے میں نواب' خانساماں' خدمت گار' مصاحب' اہل کار' اور رکھ رکھاؤ
کی خصوصیتیں دکھائی ہیں' اسی طرح عورتوں کے پردے میں بڑی بیگم سے لے کر ادنیٰ اصیل ماؤں

تک کے مختلف اور متفاوت حالات ہوبہو قلم بند کر دیے ہیں۔"(۳)

اس کی زبان میں ہر جگہ سادگی اور روانی ہے۔ محاورے اور بول چال کا لطف بھی اس میں موجود ہے۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں۔ ان تصنیفات کے واقعاتی پہلو پر نظر کرتے ہوئے ان کو ناولیں بھی کہہ دیا گیا ہے' اور یہ غلطی عام ہوگئی ہے کہ مولانا اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کی تصانیف اس قدر کھلی ہوئی تمثیلیں ہیں کہ ان کو ناول نگار کہنے والوں پر تعجب ہوتا ہے۔ "اردو ناول نگاری کی تنقیدی تاریخ صفحہ ۳۔"

۲۔ اردو ناول نگاری' صفحہ ۵۶۔

۳۔ اردو ناول نگاری' صفحہ ۵۶۔

سرشار

حالات زندگی :- اردو ادب میں ناول کی صنف ابھی ابتدائی حالت ہی میں تھی کہ یکایک سرشار جیسے ناول نگار پیدا ہوگئے- پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۷ء یا ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے- عربی فارسی کی تعلیم پانے کے بعد کیننگ کالج، لکھنؤ میں انگریزی پڑھی، لیکن کوئی ڈگری نہیں لی- ۱۸۷۸ء میں منشی نولکشور کے اخبار "اردو اخبار" کے مدیر مقرر ہوئے- الہ آباد ہائی کورٹ میں ایک مرتبہ مترجم کا کام بھی کیا- ۱۸۹۰ء میں وہ حیدر آباد دکن گئے، اور وہاں "دبدبہ آصفی" کی ادارت سنبھالی- مے نوشی کی عادت ایسی پڑی ہوئی تھی کہ آخر جان لیوا ثابت ہوئی- ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد ہی میں ان کا انتقال ہوا-(۱)

ادبی زندگی:- سرشار کو قدرت کی طرف سے ناول نگاری کا خاص ملکہ عطا ہوا تھا- ان کی طبیعت ناول کے لیے بہت موزوں تھی- انہوں نے ہمیشہ ناول ہی لکھا، اور اس کثرت سے لکھا کہ اردو ادب کو مالا مال کر دیا- ان کی تصنیفات میں "فسانہ آزاد" "سیر کہسار" "جام سرشار" "کامنی اور خدائی فوجدار" "کڑم دھم" "بچھری ہوئی دلہن" "طوفان بے تمیزی" "پی کہاں" وغیرہ ہیں لیکن ان کا اصل کارنامہ "فسانہ آزاد" ہے- یہی کتاب ان کی عالمگیر شہرت کا باعث ہوئی- یہ ناول پہلے تو "اردو اخبار میں جسے وہ خود ایڈٹ کرتے تھے بالاقساط شائع ہوتا رہا، لیکن کتابی شکل میں پہلی مرتبہ ۱۸۸۰ء میں چھپا- سرشار کی شہرت "فسانہ آزاد" سے ہوئی، اور ان کے دوسرے ناول صرف ان کے نام سے مشہور ہیں- ان میں کوئی خصوصیت نہیں ہے- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرشار نے اپنی پہلی تصنیف "فسانہ آزاد" کو اپنا سب کچھ دے دیا- دوسری تصنیفات کے لیے کچھ باقی نہ چھوڑا- ان کی تصنیفات میں اولیت اور اہمیت "فسانہ آزاد" ہی کو حاصل ہے- اس لیے ہم یہاں اپنی بحث کو اسی کتاب تک محدود رکھیں گے-

غالباً سرشار پہلے ناول نویس ہیں، جنہوں نے شعوری طور پر انگریزی ناول کے ڈھنگ پر اردو ناول لکھا- انگریزی ناول سے انہوں نے اثر قبول کرکے اردو ناول میں ایک نئی طرح ڈالی- وہ

"فسانہ آزاد" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اس ناول میں جدت یہ ہے کہ اردو کے اور افسانوں کی طرح ایشیائی خیالات سے معرا ہے۔ گو مرزا رجب علی بیگ سرور مبرور یادگار زمانہ اور سخنور رنگین ترانہ استاد مسلم الثبوت تھے۔ گو اس خدائے سخن کا نام سن کر اچھے اچھے زبان دان ان متعصبوں کا ذکر نہیں اپنے کان پکڑتے ہیں، مگر تحفہ معقرہ' فسانہ آزاد'' انگریزی ناولوں کے ڈھنگ پر لکھا گیا ہے' جس میں کوئی امر حسب لیاقت یا حسب عقل محال نہیں۔ اردو فسانوں سے اس کا رنگ نہیں ملتا۔"(۲) لیکن سوال یہ ہے کہ سرشار اپنے اس دعوے میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کی رائے میں ان کو اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ انہوں نے بے شک جن' پری' دیو وغیرہ کے بجائے حیات انسانی کے روزمرہ واقعات بیان کئے ہیں' اور ان کے "فسانہ آزاد" میں اس وقت کے لکھنؤ کی تہذیب و معاشرہ کا عکس ہے' لیکن جن لوگوں نے انگریزی ناولوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے' وہ اسے ناول کہتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں۔(۳)

"فسانہ آزاد" پر مکمل ناول کا اطلاق نہیں ہوتا' بلکہ اس پر "داستان امیر حمزہ" کا سایہ نظر آتا ہے۔ تاہم یہ ڈپٹی نذیر احمد کے قصوں کے مقابلے میں ایک قدم آگے آتے ہے' اور ناول سے قریب تر ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا مقصد محض تعلیم و تربیت تھا۔ سماج کی مرقع کشی اور عشق و محبت اور واردات قلبی سے ان کی کتابیں خالی ہیں' لیکن سرشار نے لکھنؤ کے مٹتے ہوئے تمدن کی جو کامیاب تصویر کشی کی ہے' اس سے انہیں ایک باقاعدہ ناول نگار کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

سرشار ایک زندہ دل اور ظریف انسان تھے۔ اس لیے شوخی و ظرافت ان کے ہاں ایک عام عنصر ہے۔ خوش طبعی' مذاق' دل لگی اور چھیڑ چھاڑ ہر جگہ ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے لوگ "فسانہ آزاد" اور ان کے دیگر ناولوں کو باوجود ان کی ضخامت کے دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ سرشار لکھنؤ میں پیدا ہوئے' وہیں پلے بڑھے۔ اس لیے قدرتی طور پر وہاں کی معاشرت سے ایک انس ہے' اور اس کی مصوری کرتے وقت انہیں قلبی سرور حاصل ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بگڑے ہوئے نظام سے وہ بیزار بھی ہیں۔ تاہم کسی وقت وہ شوخی و ظرافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

پرانی داستانوں کی طرح ان کے ہاں مہمات اور کارہائے نمایاں انجام دینے کا اہتمام ہے' اور عشق و محبت اور چنگ و رباب کے ذکر کے ساتھ تیر و تفنگ اور شمشیر و سنان کی گھما گھمی ہے' لیکن ان کی یہ رزم آرائی اکثر اوقات بزم آرائی سے آگے نہیں بڑھتی۔ ان کے ہاں عشق کا مفہوم ہوس ناکی اور محبت کا مطلب جسمانی تلذذ سے زیادہ نہیں۔ اس میں سرشار کا اتنا قصور

نہیں، جتنا کہ عہد کا ہے۔ اس وقت کا لکھنؤ عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اخلاق کا معیار بہت ہی گرا ہوا تھا۔ ایک دم توڑتے ہوئے تمدن اور سسکتی ہوئی سوسائٹی میں ہر شخص غم دوران کو غم جاناں میں بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسے وقت میں کسی ادیب سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی تحریر میں اخلاق کا معیار قائم رکھے، بیجا ہے۔

سرشار نے اگرچہ واقعیت نگاری کا دعویٰ کیا ہے، اور اپنے قصوں کو زندگی سے قریب تر لانے کا دم بھرا ہے، لیکن اس واقعیت کا رنگ ان کے ہاں ناہموار ہے۔ زندگی کا بھی جو نقشہ کھینچا ہے، وہ بھی کہیں کہیں پرانی داستانوں سے جاملتا ہے۔

سرشار نے کردار نگاری میں البتہ کمال دکھایا ہے۔ وہ شاید اردو کے پہلے ناول نگار ہیں، جنہوں نے اس بات کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کے کردار بڑے دلچسپ اور زندگی سے بھرپور ہیں۔ ان کرداروں میں ہر پیشے، ہر طبقے اور ہر مزاج کے افراد شامل ہیں، جن کی خصوصیت سرشار کے بیانات سے نہیں، بلکہ خود ان ہی کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتی ہیں، خصوصاً خوجی کا کردار تو سرشار کا شاہکار ہے۔ سرشار میں زندگی کو زندہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ جس کردار کو بھی وہ پیش کرتے ہیں، اس کی نبض چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندہ آدمی ہمارے سامنے آگیا۔

سرشار کے مکالمے بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ ہر طبقے کے کردار اپنی اپنی بولی میں بولتے نظر آتے ہیں، ان کے لب و لہجے میں کوئی التباس نہیں ہوتا۔ سرشار تمام پیشوں اور طبقوں کی زبان سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے انہوں نے ہر فرد سے وہی مکالمہ ادا کروایا ہے، جو اس کا اپنا ہے۔ انہیں بیگماتی زبان پر پورا عبور حاصل ہے۔ اس بنا پر اس کے موقع و محل استعمال میں انہوں نے کمال دکھایا ہے۔

سرشار میں ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ بہت عجلت پسند واقع ہوئے ہیں۔ جو کچھ لکھا بہت عجلت میں لکھا، اور اس پر نظرثانی کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اس لیے پلاٹ کی ترتیب و نظام میں بڑی بے قاعدگی ہے۔ ان کی نگاہ ہمیشہ پلاٹ سے زیادہ افراد پر رہتی ہے۔ پلاٹ کی خامی کی وجہ سے کرداروں میں بھی اعتدال نہیں پایا جاتا، اور واقعات میں بے ربطی اور عدم تسلسل کا نقص پیدا ہوگیا۔

سرشار اگرچہ سرور کی طرح مقفی و مسجع عبارت لکھنا پسند نہیں کرتے، لیکن کہیں کہیں اس کا عکس مل ہی جاتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی زبان بڑی بے تکلف، دلکش، پرلطف اور بامحاورہ ہے، اور اپنے اندر ادبی شان رکھتی ہے۔

اردو ناول کی تاریخ میں سرشار کی شخصیت بہت اہم ہے۔ انہوں نے ادب کی اس صنف کو بہت آگے بڑھایا۔ باوجود کوتاہیوں کے' جو ان کے ناولوں میں پائی جاتی ہیں' یہ ماننا پڑے گا کہ انہوں نے اردو ناول کو بہت کچھ دیا۔ اردو ناول کی تاریخ کبھی ان کے ذکر سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

حواشی

۱۔ اردو ناول نگاری' صفحہ ۵۶۔

۲۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ' صفحہ ۷۵۔

۳۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ' صفحہ ۷۸۔

شرر

حالات زندگی :- مولانا عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ نو سال کی عمر میں کلکتہ گئے، اور مختلف اساتذہ سے عربی، فارسی، منطق اور طب کا درس لیا۔ انیس سال کی عمر میں پھر لکھنؤ واپس آئے۔ مولوی نذیر حسین دھلوی سے حدیث پڑھی، پرائیویٹ طور پر انگریزی پڑھ کر اس میں دستگاہ حاصل کی۔ بیس سال کی عمر میں شادی کی۔ ان کا انتقال ۱۹۲۶ء میں ہوا۔

ادبی زندگی :- مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز تو ان کی طالب علمی کے زمانے ہی سے ہوگیا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ مختلف اخباروں میں مضامین لکھتے رہے لیکن باقاعدگی کے ساتھ اس وقت لکھنے لگے، جب ۱۸۸۰ء میں وہ اودھ اخبار، لکھنؤ کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں داخل ہوئے۔ ان کا پہلا ناول "دلچسپ" اور بنکم چندر چیٹر جی کے بنگلہ ناول "درگیش نندنی" کا اردو ترجمہ اسی زمانے کی یادگاریں ہیں۔ ۱۸۸۷ء میں انہوں نے اپنا مشہور ماہنامہ "دلگداز" جاری کیا، جس میں ۱۸۸۸ء سے ناول نویسی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۸۹۱ء میں انہوں نے حیدر آباد دکن جا کر ملازمت کرلی، جہاں سے پھر ۱۸۹۵ء میں انگلستان گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو ۱۸۹۸ء میں حیدر آباد دکن سے اپنا پرانا رسالہ "دلگداز" دوبارہ جاری کیا۔ وہیں ان کا ناول "سکینہ بنت الحسین" شائع ہوا، جس سے وہاں ان کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ آخر مجبور ہو کر وہ ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ واپس آ گئے۔

مولانا شرر نے اردو میں یوں تو بہت سے ناول لکھے، لیکن "فردوس بریں" کے علاوہ کوئی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ ان کے ناولوں میں یہی ناول سب سے زیادہ مشہور ہے، اور خود مولانا کی شہرت کا ضامن بھی بہت حد تک یہی ناول ہے۔

مولانا شرر نے ناول نگاری میں ایک نئی روش کا آغاز کیا۔ انہوں نے ایک واضح نصب العین کے تحت تاریخی ناول لکھنے کی ابتدا کی۔ ان کا ناول "ملک العزیز ورجنا" ۱۸۸۸ء میں "دلگداز میں بالاقساط شائع ہوا۔ آخری قسط میں وہ لکھتے ہیں :

"غالباً اردو میں یہ اپنی طرز کا پہلا ناول ہے۔ ہمارے مسلمان دوستوں نے اس ناول کو حد سے زیادہ پسند کیا۔ اس ناول نے قوم اسلام کے وہ کارنامے دکھائے جو بجھے ہوئے جوشوں اور پژمردہ حوصلوں کو از سرنو زندہ کر سکتے ہیں۔"

"ہمارے قدر افزا اور "دلگداز" کے قدر دان گواہ ہیں کہ اس کا ہر ہر جملہ رگ حمیت اسلامی کو جوش میں لاتا تھا' اور یقین ہے کہ وہ حضرات جنہوں نے غور سے اور شوق سے اس ناول کو اول سے آخر تک ملاحظہ فرمایا ہوگا' ان کے دلوں میں قومی خون جوش مار رہا ہوگا' اور وہ ترقی پر تلے بیٹھے ہوں گے۔ شرر کو تاریخ اسلام سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس بنا پر وہ اپنے تاریخی ناول کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے اسلاف کے شاندار کارناموں کی یاد دلا کر انحطاط کے اسباب پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دیتے رہے' اور عظمت ماضی کی داستانیں دھرا کر ان کے دلوں میں وہ جوش اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے' جو انہیں راہ عمل پر گامزن ہونے پر آمادہ کرے۔ اس لحاظ سے ان کے ناول اصلاحی مقصد کے حامل ہیں۔

تاریخی ناول نگاری کا جذبہ ان میں سر والٹر اسکاٹ کا انگریزی ناول "طلسمان" پڑھ کر پیدا ہوا۔ وہ جب انگلستان اور دیگر ممالک یورپ کی سیاحت کر رہے تھے' اس وقت اسکاٹ کا وہ ناول ان کے ہاتھ لگ گیا۔ اس میں عرب کی اسلامی زندگی کے کچھ سطحی نقوش اجاگر کر کے اسلام کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ شرر نے مذہبی جوش میں آکر اس کے رد میں ایسی تاریخی ناولیں لکھنے کا پختہ ارادہ کیا' جن میں اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی روایات کو زندہ کیا جائے۔ اس طرح ان کی تاریخی ناول نگاری کا محرک گویا اسکاٹ کا وہ ناول ثابت ہوا۔

شرر پہلے شخص ہیں' جنہوں نے اردو ادب میں ناول کے لفظ کو بہت زیادہ رواج دیا۔ وہ اپنے پرچے "دلگداز" میں ناول پر ناول قسط وار نکالتے گئے' جس سے لوگوں میں ناول پڑھنے کا مذاق درست ہوا۔ ان کے کان اس لفظ سے آشنا ہوئے۔ شرر نے "دلگداز" میں ناول پر الگ مضامین بھی لکھے۔ جن میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک "دنیا میں ناول نویسی کی ابتدا" اور دوسرا "ناول"۔

اس کے علاوہ ہردوئی کے حکیم محمد علی طبیب شرر کے مدمقابل ٹھہرے۔ انہوں نے بھی "دلگداز" کے مقابلے میں "مرقع عالم" کے نام سے ایک رسالہ نکالا' اور شرر کے ہر ناول کے جواب میں وہ بھی ایک ناول قسط وار شائع کرتے رہے۔ اس لیے دونوں کے الگ الگ گروہ ہوگئے اور آپس میں چوٹیں ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب میں لفظ ناول خوب رواج

پاگیا' اور لوگ سنجیدگی کے ساتھ اس صنف ادب کی طرف توجہ دینے لگے۔ اس لحاظ سے' شرر ناول کو اردو ادب میں ایک حیثیت دینے کے بانی ہوئے۔(۱)

شرر نے تاریخی ناول تو بہت لکھے اور انہوں نے اپنے طور پر اس امر کی کوشش بھی کی کہ مسلمانوں کے عہد رفتہ کی شاندار داستان لوگوں کے سامنے آ جائے' لیکن وہ اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ تاریخ کے ماخذوں میں ان سے فاش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ انہوں نے دلچسپی پر صحت کو قربان کر دیا' اور خلاف واقعہ امور کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ اپنی خواہش کے مطابق تاریخی واقعات میں الٹ پھیر کیا۔ واقعات کی ترتیب اور پلاٹ کی تنظیم سے انہوں نے بے توجہی برتی' اور بقول جمیل احمد کندھائے پوری: "یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان کے ناولوں میں مقامی رنگ بالکل نہیں پایا جاتا۔ قدیم عرب اور قرون وسطی کے ہندوستان سے متعلق انہوں نے متعدد ناول لکھے ہیں' مگر ان کے کسی ناول کو پڑھ کر اس عہد رفتہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے نہیں آتی' اور قاری اس عہد کی خصوصیات معلوم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ (۲) شرر کے ہاں تاریخ کی ممتاز ہستیوں کے بارے میں صرف اتنی ہی معلومات ملتی ہیں' جتنی کہ کسی تاریخ کی کتاب میں' ان کی خانگی' ذاتی اور روزمرہ زندگی کے متعلق کچھ بھی علم نہیں ہوتا۔

شرر کے ہاں زندگی کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ اس کی جزئیات کا مشاہدہ بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ انسانی نفسیات سے بھی ان کی واقفیت برائے نام ہے۔ اس لیے وہ کردار نگاری میں بڑے ناکام ثابت ہوئے۔ ان کے کردار عام طور پر بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے نام تو عربی ہوتے ہیں' لیکن مزاج اور خصوصیات ہندوستانی و پاکستانی' ان کے کرداروں میں اول سے آخر تک ایک بے کیف یکسانیت اور یکرنگی چھائی ہوئی ہے۔ کہیں کسی کردار میں انفرادیت قائم نہ ہو سکی۔ ان کے دو مختلف کرداروں کو ایک دوسرے سے با آسانی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے سارے کردار ایک ہی سانچے میں ڈھل کر نکلتے ہیں' جن میں دھندلے دھندلے خاکے اور مبہم نقوش ملتے ہیں۔ کسی چیز پر ان کی نظر پڑتی ہے تو نہایت سرعت سے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر گزر جاتے ہیں۔ مذہبی جوش میں آ کر وہ ہیرو کو قوت و عظمت میں طلسمی داستانوں کے ہیرو کی طرح حیرت انگیز بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی ان کی کردار نگاری کا ایک بڑا نقص ہے۔ اس سے کردار کا فطری ارتقا نہیں ہونے پاتا۔

معاشرہ کی عکاسی میں بھی شرر بہت ناکام معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس میں محض تخیل کے زور سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ حقیقت نگاری سے' جو ناول کی بنیادی خصوصیت ہے' لگاؤ نہیں رکھتے۔ وہ اکثر ایسے واقعات اور ایسی باتیں لکھتے ہیں' جو حقیقت سے بہت دور ہوتی ہیں۔ تاریخی ناول

میں واقعات خواہ کتنے ہی پرانے ہوں' ان کا صحیح نقشہ کھینچنا ناول نگار کا فرض ہے۔ مگر شرر کا قلم اس سے عاجز معلوم ہوتا ہے۔ ناول میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ظرافت نگاری بہت ضروری ہے۔ شرر کے ہاں یہ رنگ بھی بہت ہلکا ہے۔

شرر کے ہاں ایک بات البتہ قابل لحاظ ہے۔ وہ ہے ان کی منظر نگاری۔ وہ جو مناظر دکھاتے ہیں' وہ عموماً تازہ اور جاندار ہوتے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں یہ ناظر جزو قصہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ان کی کمزوری ہے۔ جہاں تک مکالمے کا تعلق ہے' وہ ان کے ہاں بہت غیر فطری ہوتے ہیں۔ مکالمے اصل میں ایسے ہونے چاہیں کہ ان سے افراد قصہ پر روشنی پڑے' اور ان کے ذریعے وہ پہچانے جاسکیں' لیکن شرر کے مکالمے ان چیزوں سے عاری ہیں۔

شرر کا طرز بیان سادہ اور عام فہم ضرور ہے لیکن اس میں وہ دلکشی و رعنائی نہیں ملتی' جو ایک اچھے ادب کی پہلی خصوصیت ہے۔ صفحے کے صفحے پڑھ جایئے' شاید ہی کوئی عبارت ایسی ملے' جس کا دل پر ایک خاص اثر ہو۔

فردوس بریں :۔ شرر کے اردو ناولوں میں' جیسا کہ لکھا جاچکا ہے' "فردوس بریں" سب سے بہتر ہے۔ اس کو ایک مکمل اور کامیاب ناول کہا جاسکتا ہے۔ اس کا پلاٹ بڑا منظم اور متناسب ہے۔ واقعات کا بیان بھی خوب ہے۔ کہانی کے آغاز و انجام میں توازن قائم ہے۔ ناول کی تمام منزلیں نہایت خوبی' نفاست اور چابک دستی سے طے ہوتی ہیں۔ اس میں ان کی عام کمزوریوں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی خوبیاں بھی آگئی ہیں' جو قابل تحسین ہیں۔

"فردوس بریں" میں اشخاص قصہ جان دار اور دلچسپ ہیں' خاص طور پر حسین اور علی وجودی' حسین ناول کا نوجوان ہیرو ہے۔ جو اپنی احمقانہ عشق بازی اور مجرمانہ سادہ لوحی میں بھی ایک دلکشی رکھتا ہے۔ علی و جودی فرقہ باطنیہ کا اہم فرد ہے۔ اس پر اس فرقے کی کامیابی کا انحصار ہے۔ ناول کی ہیروئن زمرد ایثار اور وفا شعاری میں بے مثل ہے۔ وہ اپنے ہیرو حسین کی خاطر حور شاہ کی ملکہ بننے سے انکار کرتی ہے' اور دنیاوی بہشت کے عیش و عشرت اور ناز و نعم میں رہنے کی پیش کش کو ٹھکرا دیتی ہے' اور محض عاشق کے انتظار میں کڑھ کڑھ کر دن گزارتی ہے۔ وہ فرقہ باطنیہ کی جملہ سازشی چالوں کو اول سے آخر تک خوب سمجھتی ہے۔ لیکن مصلحت کی خاطر وہ اپنے سادہ لوح عاشق پر افشائے راز نہیں کرتی۔ آخر کار اس کی دانش مندی کام آتی ہے' اور تاتاری خاتون بلغان خاتون کی مدد سے اس جال کو توڑ کر نکلتی ہے' اور ہمیشہ کے لیے اپنے عاشق سے مل جاتی ہے۔

"فردوس بریں" میں مکالمے بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ خاص طور پر علی وجودی اور حسین کے

وہ مکالمے، جس میں حسین جابجا اپنے دلی شبہات کا اظہار کرتا ہے، اور علی وجودی جواب میں اپنی منطق اور علم باطن کی رنگین اصطلاحوں کی مدد سے اسے پے در پے مغالطوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ حسین علی وجودی کا آلہ کار بننے پر مجبور ہوتا ہے، اور ارتکاب گناہ کے بعد احساس ندامت بھی کھو بیٹھتا ہے۔(۳)

شرر نے اپنے اس ناول میں جو منظر کشی کی ہے، وہ بڑی حد تک معتدل، حسین، دلکش اور رنگین ہے۔ خصوصاً جنت کی مرقع کشی بہت خوب ہے۔ اس میں محاکاتی انداز پایا جاتا ہے، جس سے ایک لطیف رومانوی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ قاری تھوڑی دیر کے لیے ایک ایسی دنیا میں کھو جاتا ہے، جہاں وہ اپنے مادی وجود کو بھول جاتا ہے۔ یہ شرر کا کمال ہے، اور ان کی قوت تخیل کی دلیل ہے۔ "فردوس بریں" ایک پتلی سی کتاب ہے، اور شرر نے معلوم ہوتا ہے، اس میں اپنے دوسرے تاریخی ناولوں کے مقابلے میں زیادہ کاوش اور محنت سے کام لیا ہے، اور اسی لیے اس میں وہ خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں، جن کی بنا پر شرر کو شہرت دوام نصیب ہوئی ہے۔

حواشی

۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، صفحہ ۱۲۵

۲۔ اردو ناول نگاری، صفحہ ۶۸۔

۳۔ ماخوذ از اردو ناول نگاری، صفحہ ۷۲۔

مرزا رسوا

ڈپٹی نذیر احمد، سرشار اور شرر کے بعد ناول کی دنیا میں مرزا محمد ہادی رسوا کی شخصیت ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے اردو ناول کو سب سے پہلے فنی خوبیاں عطا کیں۔

حالات زندگی:۔ رسوا ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں والدین کا انتقال ہوگیا۔ تعلیم و تربیت کی ذمہ داری خالہ اور رشتے کے ایک ماموں نے لی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں ان کی سختی سے گھبرا کر اپنے والد کے ایک دوست کے ہاں چلے گئے۔ انہوں نے پرائیویٹ طور پر میٹرک پاس کر کے اوورسیری پاس کی اور کافی عرصے تک اوور سیری کی نوکری کرتے رہے۔ پھر نخاس مشن اسکول، لکھنؤ میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی، اور ۱۸۸۷ء میں دہلی یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر امریکا کی ایک یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری لی۔ کچھ دن رائڈ کرسچین کالج، لکھنؤ میں پروفیسری کی خدمات بھی انجام دیں۔ آخر میں حیدر آباد دکن کا سفر کیا، اور دارالترجمہ، عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازمت کر لی۔ ان کا انتقال وہیں ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ہوا۔

ادبی زندگی:۔ رسوا، سرشار اور شرر دونوں سے زیادہ جدید تعلیم حاصل کئے ہوئے تھے، اور ناول کا زیادہ صاف اور واضح مفہوم لے کر اس پر عامل ہوئے۔ اگرچہ سرشار اور شرر کی طرح رسوا کی تمامتر توجہ ناول نگاری پر نہیں تھی، بلکہ انہوں نے جو کچھ لکھا، تفریح طبع کی خاطر لکھا، لیکن ان میں فنی شعور ان دونوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔

مرزا رسوا نے پانچ طبعزاد ناول لکھے (۱) افشائے راز (۲) اختری بیگم (۳) ذات شریف (۴) شریف زادہ (۵) امراؤ جان ادا۔ ان میں سے افشائے راز" ناکمل رہ گئی۔

اختری بیگم:۔ "اختری بیگم" ایک بری رئیس لڑکی کا قصہ ہے، جس کو اس کی ماں اپنے رشتے کے بھائی خورشید مرزا کے حوالے چھوڑ کر مر جاتی ہے اور یہ وصیت کر جاتی ہے کہ اس کی جائیداد چھپائی جائے۔ یہ کوئی اچھا ناول نہیں ہے۔ قصے کی دلچسپی محض سنسنی خیز واقعات اور

جاسوسی انداز کی وجہ سے قائم رہتی ہے۔ کردار سب بے جان ہیں۔

ذات شریف :- "ذات شریف" میں ایک نواب کا قصہ بیان کیا گیا ہے، جس کو مختلف طریقوں سے لوٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس قسم کا قصہ ناول کے انداز میں مرزا رسوا سے پہلے ڈھاکا کے نواب سید محمد آزلو نے بھی "نوابی دربار" کے نام سے لکھ کر پیش کیا تھا۔ لیکن مرزا رسوا کا ناول "ذات شریف" زبان و بیان کے لحاظ سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کے اکثر ابواب طویل بیانات سے شروع ہوتے ہیں، جو انشا پردازی کا اچھا نمونہ ہیں۔ "شریف زادہ" میں مرزا رسوا کا رجحان مثالیت پسندی کی طرف ہے۔ اس میں ایک آئیڈیل کردار پیش کیا گیا ہے، جس کا نام مرزا عابد حسین ہے۔ عابد حسین بہت معمولی درجے کا آدمی ہے، جو محض اپنی محنت اور دیانت کی وجہ سے ترقی کر کے انجینئر ہو جاتا ہے، اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر باعزت زندگی گزارنے کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے۔ یہ مثالیت پسندی غالباً مرزا رسوا نے ڈپٹی نذیر احمد کی تقلید میں اختیار کی تھی، مگر ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں یہ رنگ بڑا گہرا تھا۔ ان کے ہاں ہلکا ہے۔ پھر بھی دونوں میں تھوڑی سی مماثلت پائی جاتی ہے۔ "شریف زادہ" ایک خشک ناول ہے، لیکن اس میں مرزا رسوا کی فنکارانہ صلاحیتوں کی ایک جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ پلاٹ کی تعمیر میں ان کی توجہ کافی معلوم ہوتی ہے۔ کردار کو انفرادیت بخشنے کا بھی ایک ذرا سا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس میں مرزا جعفر حسین کی بیوی کا کردار کافی جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ تخیل کی رنگ آمیزی بھی نظر آتی ہے۔

امراؤ جان ادا :- مرزا رسوا کا سب سے مکمل اور کامیاب ناول "امراؤ جان ادا" ہے۔ دنیا میں اکثر بڑے فنکاروں میں دیکھا گیا ہے، جو اپنے فن کی نمائش کے لیے بہت کچھ کر جاتے ہیں، لیکن شاہکار صرف ایک ہی چھوڑتے ہیں، اور یہی ایک شاہکار دراصل ان کی شہرت دوام کا باعث بنتے ہیں۔ مرزا رسوا کا بھی یہی حال ہے۔ انہوں نے اردو ادب میں کئی ایک ناول اپنی یادگار چھوڑے ہیں، لیکن ان کا شاہکار صرف ایک ہی ہے اور یہ ان کا ناول "امراؤ جان ادا" ہے۔ مرزا رسوا کا نام اس ناول کی بدولت زندہ ہے، اور ان کے دوسرے ناول ان کے نام سے زندہ ہیں۔ رسوا آج ہرگز رسوا نہ ہوتے، اگر وہ "امراؤ جان ادا" نہ لکھ جاتے۔ اس لحاظ سے انہوں نے صرف اردو ناول پر ہی احسان نہیں کیا، بلکہ اپنے اوپر بھی احسان کیا ہے۔

"امراؤ جان ادا" اس نام کی لکھنؤ کی ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال اور شرافت کا احساس لیے ہوئی طوائف کی آپ بیتی ہے، جو مرزا رسوا کی فرمائش پر اپنے خیالات سناتی ہے۔ وہ ایک غریب مگر شریف مسلمان کی لڑکی تھی۔ زمانے کی چیرہ دستیوں نے اس قعرِ مذلت میں ڈالا۔

امراؤ جان ادا کا اصل نام امیرن تھا۔ اس کا باپ "فیض آباد میں بہو بیگم کے مقبرہ پر جمعدار تھا۔ بڑا نیک، سچا اور دیانتدار آدمی تھا۔ اس کے پڑوس میں دلاور خان نامی ایک بدذات قسم کا آدمی رہتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی حرکت پر گرفتار ہوگیا۔ مقدمہ چلا تو جمعدار نے کورٹ میں اس کے چال چلن اور عادات و اطوار کے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ اس پر اس کو قید ہوگئی۔ قید سے چھوٹ کر آیا تو جمعدار سے بدلہ لینے پر تل گیا لیکن بدلہ اس نے اس طرح لیا کہ اس کی آٹھ سال کی بچی امیرن کو کبوتروں کا لالچ دلا کر پہلے اپنے گھر بند کیا۔ اس کے بعد رات کو اسے بیل گاڑی پر ڈال کر اس ارادے سے گھر سے نکالا کہ مار مور کر کہیں کسی غیر آباد علاقے میں چھوڑ دے گا۔ گاڑی میں اس کے ساتھ اس کا دوست پیر بخش بھی تھا۔ اس نے صلاح دی کہ لکھنؤ لے جا کر اسے بیچ کیوں نہ دیا جائے۔ اچھے خاصے پیسے مل جائیں گے۔ دلاور خان کو یہ بات پسند آئی اور لکھنؤ پہنچ کر پہلے اسے پیر بخش کے بھائی کے گھر میں رکھا۔ پھر ایک مشہور چکلے دار رنڈی خانم کے ہاتھ بیچ دیا، جس نے اس کا نام بدل کر امراؤ رکھ دیا۔ لکھنے پڑھنے اور ناچ گانے کی تربیت ہونے لگی۔ ذہانت اچھی خاصی تھی۔ جلد ہی ادبی مذاق پیدا ہوگیا۔ موسیقی سے بھی طبعی مناسبت تھی، اچھا گانے لگی۔ تعلیم و تربیت کے زمانے میں ایک ڈومنی کا لڑکا گوہر مرزا اس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ پہلے تو بچپنے کی بنا پر دونوں آپس میں لڑتے تھے، لیکن جوان ہونے کے ساتھ جب ان پر زندگی کا راز کھلنے لگا تو آہستہ آہستہ عشق و محبت کی باتیں کرنے لگے۔ پھر ایک رات گوہر مرزا نے زبانی عشق و محبت کو عملی جامہ پہنا دیا۔ خانم کو یہ بات معلوم ہوئی تو رسمی طور پر اس کے رنڈی ہونے کا اعلان کیا۔ یہیں سے اس کی وہ زندگی شروع ہوتی ہے، جس میں ہر کس و ناکس کو یہ حق حاصل تھا کہ امراؤ کے ہاں آ کر اسے داد عیش دینے کا موقع دے۔ بقول خان کے: "بابو، پیسے دو تو یہ گھر تمہارا ہے، ورنہ اپنا راستہ دیکھو۔"

"امراؤ جان ادا" کا پلاٹ بڑا سڈول اور خوبصورت ہے۔ یہ اردو کا پہلا ناول ہے، جس میں پلاٹ کی تعمیر میں ایک خاص سلیقہ برتا گیا۔ یہ ناول کرداری ناول کی قسم کا ہے۔ اس میں ایک مخصوص کردار امراؤ جان ادا کی زبانی اس کی زندگی کے حالات ایک مخصوص ماحول اور معاشرہ میں بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ اس میں مرزا رسوا محض ایک قصہ سننے والے کی حیثیت سے موجود ہیں۔ یا یوں کہئے کہ وہ قصے کی لگام اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہیں کہ کہیں اس کے ارتقا میں کوئی نقص پیدا نہ ہو، یا امراؤ جان کے اگر کہیں بھٹک جانے کا اندیشہ ہو، تو دخل در معقولات کر کے اسے راہ راست پر لائیں۔ ناول میں ہیروئن کی زبانی پوری کہانی کا بیان ہوتا، اور اس میں ناول نویس کا فریق ثانی کی حیثیت سے موجود رہنا مرزا رسوا کی جدت ہے لیکن

جدت بھی وہ جو قابل تحسین ہو۔ رسوا کے اس ناول کی خوبیوں کو ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنی کتاب "اردو ناول کی تنقیدی تاریخ" میں گنایا ہے' ان کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱۔ **حسن تناسب:**۔ "امراؤ جان ادا" کے قصے کے واقعات اس قدر حسن تناسب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں کہ پورا ناول ایک عمدہ خوش نما عمارت کی طرح ہے' جس کے دیکھنے سے دل پر ایک خاص اثر مترتب ہوتا ہے۔ پہلے باب میں ایک مشاعرہ ہے' جس میں امراؤ جان بھی ایک شاعرہ کی حیثیت سے شرکت کرتی ہے۔ اور اپنے ادبی ذوق کا مظاہرہ کرتی ہے۔ آخری باب میں اس نے اپنا فلسفہ حیات بیان کیا ہے۔ ان دونوں بابوں کے بیچ میں پورا قصہ ہے۔ جو ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

۲۔ **ہم آہنگی:** ۔ مرزا رسوا نے مختلف واقعات کو اس طرح سے جوڑا ہے کہ ان میں ایک کامل ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے' کہیں کوئی واقعہ بے جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ان کی فنی صلاحیت کا ثبوت ہے۔

۳۔ **تنوع:** ۔ اس قصے کے واقعات میں ایک حسین اور دلکش تنوع ہے۔ بیسویں واقعات ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے متناسب بھی ہیں اور متضاد بھی' مگر ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر اچھوتا اور نرالا ہے۔ امیرن کے بھگا لے جانے والا واقعہ دردناک ہے۔ خانم کے چکلے والے واقعات خوبصورت اور دلچسپ ہیں۔ ایک مرتبہ امیرن فیضو نامی ایک ڈاکو کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ یہ واقعہ سنسنی خیز ہے۔ غرض ہر واقعہ اپنے اندر ایک کیف رکھتا ہے۔

۴۔ **وحدت تاثر:**۔ باوجود واقعات کے متنوع ہونے کے ان میں ایک کامل ہم آہنگی ہونے کی وجہ سے قصے کی وحدت تاثر میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پورا ناول ایک واحد اثر رکھتا ہے' جو شروع سے بڑی خوبی سے نبھایا گیا ہے۔

۵۔ **تراش و کفایت:**۔ ناول کی ہر بات اور ہر واقعہ کو بڑے غور خوض سے تراشا گیا ہے۔ کوئی حصہ یا کوئی سطر بھی ایسی نہیں' جو بلا ضرورت ہو یا ضرورت سے کم ہو۔ قصے کی ساخت بالکل منطقیانہ انداز پر ہے۔ حشو و زوائد سے بالکل پرہیز کیا گیا ہے۔

۶۔ **موسیقیت:**۔ اس ناول کی ساخت میں ایک خاص قسم کا اتار چڑھاؤ ہے' جو موسیقی کے وزن کی مناسبت سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اس میں ایک خوش آہنگ راگ ہے' جو قصے کے ساتھ دھیمے سروں میں شروع ہوتا ہے۔ اس راگ میں پختگی ہے' اور درد و سوز سے بھرا ہوا۔ خانم کے چکلے سے یہ راگ نہایت زور و شور سے ابھرتا ہے اور مختلف حالات میں پیچ و تاب کھاتا ہوا قصے کے آخری حصے میں ختم ہوتا ہے۔ قصہ ختم کر لینے کے بعد ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ

بہت ہی درد بھرا طویل گیت ابھی سنا' جو امراؤ جان نے گایا-

۷- **شاعرانہ تنظیم :-** پوری کہانی میں ایک شاعرانہ تنظیم پائی جاتی ہے- امراؤ جان ایک اچھی شاعرہ تھی اور ادا تخلص کرتی تھی- اس نے اپنے قصے کے بیان میں شاعرانہ تنظیم کا ثبوت دیا- یہاں ایک پوری کائنات ہے' جس کے آسمان' زمین' ہوا اور پانی واقعات کے تنوع اور کردار کے جذبات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں-(۱)

"امراؤ جان ادا" اردو ناول کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے- اس میں مرزا رسوا نے اپنی تمامتر صلاحیتوں سے کام لے کر ایسا جادو بھر دیا ہے' جس کی مثال بقول ڈاکٹر احسن فاروقی : "شاید یورپ کی ناول نگاری میں بھی کم ملے-"

کردار نگاری :- کردار نگاری میں بھی رسوا نے اپنا کمال دکھایا ہے- "امراؤ جان ادا" کا ہر کردار صاف اور نمایاں ہے' اور اپنی انفرادیت کو قائم کئے ہوئے ہے- اس میں چھوٹے سے چھوٹے کردار بھی نہایت توجہ اور سلیقہ سے واضح کئے گئے ہیں- قصے میں ہر جگہ ان کے الگ الگ خد و خال پہچانے جاسکتے ہیں- اس میں سب سے پہلے جو زندہ جاوید کردار ہمارے سامنے آتا ہے' وہ امراؤ جان ادا کا ہے- کہانی میں اس کے کردار کا ارتقا بڑا فطری معلوم ہوتا ہے' اور اس کا یہی کرداری ارتقا مستحق رحم و ہمدردی بناتا' اور اس کی شخصیت میں عجیب مقناطیسی کشش پیدا کرتا ہے- اگرچہ وہ اتفاق سے برے ماحول میں پھنس کر گمراہی کی راہ پر آگے بڑھنے پر مجبور ہوئی' لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنا ایک مقام پیدا کر لیا- اسے خود داری' شرافت اور عزت نفس کا احساس تھا' جو لوگ اس کے پاس آتے' انہیں لوٹنے کی فکر میں پڑنے کی بجائے' ان کی ذاتی لیاقت اور حسن اخلاق کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتی- اس کے اندر ایک انسان کا دل تھا- وہ انسانیت کی متلاشی تھی- اس لیے یہ دوسری طوائفوں کے مقابلے میں مالی لحاظ سے ہمیشہ گھاٹے میں رہتی تھی- اس کے اسی نفسیاتی رجحان کی بنا پر وہ آگے چل کر طوائف کے پیشے کو ذلیل اور معیوب سمجھنے لگی' اور حجرے کو خیرباد کہہ کر صرف مجرے تک اپنا پیشہ محدود کرلیا- ہر کس و ناکس سے ملنے میں بھی محتاط ہوگئی' اور آگے چل کر اس نے ناچ گانا بھی موقوف کر دیا- اور کربلائے معلیٰ کی زیارت سے مشرف ہو کر نماز روزے کی پابند ہوگئی- اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ کسی اچھے آدمی سے نکاح کر کے گھر گرہستی سنبھالے' لیکن اس خیال سے کہ : "نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی" کہہ کر لوگ طعنہ دیں گے—— اس ارادے سے باز آئی-"

امراؤ جان ادا کے کردار کے بعد دوسرا بڑا کردار جو ہمارے سامنے آتا ہے' وہ خانم کا کردار ہے- یہ کردار بڑا لاجواب ہے- اس کا رعب داب اور سب رنڈیوں پر اس کا کنٹرول اس کی

شخصیت کی خاص خصوصیتیں ہیں۔ خانم ایک جہاندیدہ عورت ہے اور اپنے کاروبار میں مہارت تامہ رکھتی ہے۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ ہے۔ وہ مردوں کی کمزوری سے اچھی طرح باخبر ہے' اور انہیں کیسے لوٹا جاسکتا ہے' اس کا طریقہ معلوم ہے' اونچی سرکاروں میں اس کی رسائی ہے۔ وضع دار بھی اس قدر ہے کہ وہ اپنے دیرینہ آشنا کے ساتھ نباہ کے لیے جاتی ہے' اور اس کے تمام اخراجات برداشت کرتی ہے۔ وہ رنڈیوں کی سردار ہونے کے علاوہ اعلیٰ تہذیب اور اعلیٰ تربیت کی مثال ہے۔ محفل پر رنگ جمانے کے پورے گر جانتی ہے۔ گانے میں بڑے بڑے استادوں کو مات کر دیتی ہے۔

مرزا رسوا نے یہ سب کردار اس طرح بڑھائے ہیں کہ ان میں سے ہر کردار ایک نمایاں حیثیت کا مالک بن گیا۔ یہ رسوا کے فن کا اعجاز ہے۔ اس معاملے میں اردو کا اور کوئی ناول نگار ان تک نہیں پہنچتا۔

"امراؤ جان ادا" میں مکالمے بھی نہایت چست' رنگین اور بلیغ ہوتے ہیں ان مکالموں میں مرزا رسوا بھی حصہ لیتے ہیں' اس لیے لطف اور بڑھ گیا ہے۔

جہاں تک زبان اور طرز بیاں کا تعلق ہے[۱] وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ رسوا کی زبان لکھنؤ کی شستہ اور شائستہ زبان ہے۔ الفاظ معلوم ہوتا ہے' نگینوں کی طرح جڑے ہوتے ہیں۔ محاورے اور روزمرے بھی خالص لکھنوی ہیں۔ طرز بیاں سادہ' بے تکلف اور رواں ہے۔ ہر جگہ متانت اور سنجیدگی قائم ہے۔ پوری کتاب شاعرانہ اور ادبی لطافتوں سے پر ہے۔ ظرافت کی بھی چاشنی ہے۔ جہاں فطری مناظر بیان کئے گئے ہیں' وہ بڑے معتدل اور دلکش ہیں۔ مرزا رسوا چند لفظوں میں کسی منظر کی پوری تصویر کھینچ دینے میں کمال رکھتے ہیں۔

حواشی

۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ' صفحہ ۱۷۴-۱۸۲۔

مولانا راشد الخیری

مولانا راشد الخیری جنوری ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے' اور فروری ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد ان کے حقیقی پھوپھا تھے۔ انہوں نے اردو میں بہت سے ناول لکھے۔ خاص خاص یہ ہیں (۱) بنت الوقت' (۲) منازل السائرہ' (۳) نانی عشو' (۴) جوہر قدامت' (۵) نوحہ زندگی' (۶) عروس کربلا' (۷) صبح زندگی' (۸) شام زندگی' (۹) شب زندگی' (۱۰) سراب مغرب' (۱۱) ماہ عجم' (۱۲) سیلاب اشک' (۱۳) نوبت پنج روزہ' (۱۴) جوہر عصمت' (۱۵) وداغ خاتون' (۱۶) سیدہ کا لال' (۱۷) تحفہ شیطانی' (۱۸) تفسیر عصمت' (۱۹) میلہ میں میلہ' (۲۰) سمرنا کا چاند' (۲۱) آمنہ کا لال' (۲۲) الزہرا' (۲۳) یاسمین شام' (۲۴) محبوبہ خداوند' (۲۵) انگوٹھی کا راز' (۲۶) ستونتی وغیرہ۔

مولانا راشد الخیری نے اپنے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد سے فیض حاصل کر کے ناول نگاری کی بنیاد عورتوں کی زبان پر رکھی۔ ان کو دہلی کی بیگماتی زبان پر عبور حاصل ہے۔ عبارت میں تشبیہ و استعارہ کے ساتھ ساتھ غضب کی رنگینی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نثر میں شاعری کر رہے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے شریف گھرانوں کی معاشرت کی عکاسی کی ہے' اور عورتوں کی بول چال لکھی۔ مولانا راشد الخیری نے عورتوں کی مظلومیت کو اپنا موضوع بنایا۔ لیکن اس میں وہ بعض اوقات حد سے تجاویز بھی کر گئے ہیں۔ وہ عورتوں کی حمایت میں اس قدر رطب اللسان ہیں کہ ان کا بیان مصنوعی معلوم ہونے لگتا ہے۔ ان کے ناول فنی خوبیوں سے معرا ہیں' اور بقول سہیل بخاری : "اردو ناول اردو ہی کی زبان سے شروع ہوا تھا اور اپنی تھوڑی سی عمر میں چند درجے بھی طے کر گیا تھا کہ مولانا راشد الخیری نے اسے طبقہ نسواں کا مرثیہ خواں بنا کر جس منزل سے چلا تھا' اس کو واپس کر دیا۔ (۱)

قاری محمد سرفراز حسین عزمی :- یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے کوئی آٹھ دس ناول لکھے' جن کے نام یہ ہیں۔ (۱) شاہد رعنا' (۲) سعید' (۳) سعادت' (۴) سزائے عیش' (۵) انجام عیش' (۶) سراب عیش' (۷) بہار عیش' (۸) خمار عیش' لیکن ان سب ناولوں کا موضوع

ایک یعنی طوائف ہے۔ ان سے پہلے مرزا رسوا نے اس موضوع پر "امراؤ جان ادا" کے نام سے ناول لکھ کر طوائف کی زندگی سے اردو ادب کو روشناس کرایا تھا، لیکن اس زندگی کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی نہیں ڈالی تھی۔ قاری محمد سرفراز حسین عزمی نے یہ کام انجام دیا۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے طوائف اور طوائف کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ عزمی کا مقصد ان ناولوں سے اصلاح و تبلیغ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک طرف تو نوجوان عیاشی سے باز رہیں اور دوسری طرف طوائفیں بھی اپنی ذلت و پستی کا احساس کر کے شریفانہ زندگی اختیار کریں۔ لیکن ان کا یہ اصلاحی مقصد ان کے ناولوں پر اس قدر چھایا ہوا ہے کہ ان میں فنی خوبیاں ابھرنے نہ پائیں۔ حالانکہ ان کا موضوع بھی وہی ہے جو مرزا رسوا کا ہے۔ فن کے لحاظ سے مرزا رسوا سے ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔"(۲)

حواشی

۱۔ اردو ناول نگاری، صفحہ ۹۲۔

۱۔ اردو ناول نگاری، صفحہ ۹۰۔

پریم چند

سرشار، شرر اور رسوا کے بعد اردو ادب میں ناول نگار کی حیثیت سے پریم چند کا ذکر بہت اہم ہے۔ پریم چند ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، لیکن ناول نگاری پر بھی انہوں نے اپنا سکہ جمایا۔ ان کے چند مشہور ناول یہ ہیں: (۱) بیوہ، (۲) جلوہ ایثار، (۳) بازار حسن، (۴) چوگان ہستی، (۵) نرملا، (۶) گوشہ عافیت، (۷) میدان عمل، (۸) گئودان۔ "بیوہ" کا موضوع اگرچہ بدھوا عورت ہے، لیکن اس میں بیوہ اور سہاگن دونوں قسم کی عورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مذہب کے اصولوں پر راضی ہو جانے ہی میں خیر و عافیت ہے۔ "جلوہ ایثار" میں بھگتی کی جیت دکھائی گئی ہے۔ "بازار حسن" میں آخر کار نیک نفسی کی فتح ہوتی ہے۔ "چوگان ہستی" میں کسان اور مہاجن کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ "نرملا" میں ایک دکھیاری لڑکی نارضامندی کی شادی کے نتیجے میں شمع کی طرح گھل گھل کر جان دے دیتی ہے۔ "گوشہ عافیت" میں کاشتکار اور زمیندار کی آویزش لکھی گئی ہے۔ "میدان عمل" میں ایک کردار کی سیرت کا ارتقا دکھایا گیا ہے۔ "گئودان" میں شہری اور دیہاتی دو الگ الگ دنیاؤں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔(۱) ان میں گئودان بقول ڈاکٹر احسن فاروقی: "پریم چند کے تمام تجربہ زندگی کا نچوڑ، ان کی ناول نگاری کا کمال اور اردو ناول نگاری میں قابل قدر اضافہ ہے۔"

پریم چند کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے۔ انہوں نے اگرچہ اپنے ناولوں میں مواد بیشتر دیہاتی زندگی سے حاصل کیا ہے، اور کسانوں اور دوسرے عام لوگوں کی دکھ بھری زندگیوں کی عکاسی کی ہے، لیکن ان کی نظر سے شہری زندگی بھی نہیں بچی، اس پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا لیکن ان کا کمال اسی دیہاتی زندگی کی عکاسی ہی میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اپنے پہلو میں ایک نہایت دردمند دل لے کر آئے تھے، اس لیے غربت و افلاس کے چنگل میں پھنسی ہوئی دیہاتی زندگیوں کی عکاسی ان سے بڑھ کر کوئی نہ کرسکتا تھا۔ دیہات کے ماحول سے وہ اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے جو کچھ بھی وہ اس کے متعلق لکھتے ہیں، بہت حسین اور دلکش ہوتا ہے۔ ان کے بیانات بڑے

واضح و مکمل ہوتے ہیں۔ وہ جس واقعہ کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

البتہ کہیں کہیں ان کے وہ بیانات بلاضرورت طویل ہو جاتے ہیں' جو ان کے جوش بیان کا نتیجہ ہوتے ہیں اور جنہیں پڑھ کر طبیعت زار و قطار سے اکتا جاتی ہے۔ ان کے ہاں واقعاتی تکرار بھی ملتی ہے' جو ایک بڑا عیب ہے۔

پریم چند کے ناولوں میں دو قسم کے کردار ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو غیر معمولی صفات کے حامل ہیں۔ یہ اپنی مثالیت پسندی اور اصل پرستی کی بنا پر ایک ہی سلسلے سے متعلق معلوم ہوتے ہیں' اور وہ اپنے خیالات' اقوال اور افعال میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ دوسری قسم کے کردار معمولی ہوتے ہیں۔ ان کا دائرۂ عمل لامحدود ہے۔ ان میں تنوع ملتا ہے' جس سے وہ بہت زیادہ موثر اور دلکش ہو جاتے ہیں۔(۲) پریم چند کی کردار نگاری کا کمال ان ہی دوسرے قسم کے کرداروں میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے یہ کردار واقعات سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔

پریم چند کے ہاں مکالمے بڑے جاندار اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ وہ ان کے ذریعے واقعات کو رواں دواں اور واضح کرتے ہیں۔ وہ کرداروں کی سیرت کو بھی ان ہی مکالموں سے اجاگر کرتے ہیں' اور داخلی کیفیات کو سمجھاتے ہیں۔ وہ اپنے کردار سے اچھی طرح مانوس ہیں' ان کی فطرت اور ماحول سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لیے وہ ان کی زبان' لب و لہجہ' انداز تکلم' روزمرہ اور محاورہ کے استعمال میں کہیں غلطی نہیں کرتے لیکن ان کے یہ مکالمے کہیں کہیں ذرا زیادہ طویل ہو جاتے ہیں' اور ان میں تقریریں اور مباحثے ہونے لگتے ہیں۔

پریم چند کی زبان میں بڑی رنگا رنگی ہے۔ ان کے ہاں اردو ہندی کی آمیزش بھی ہے' اور عربی فارسی الفاظ کی چاشنی بھی۔ موقع و محل دیکھ کر انگریزی الفاظ کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ان کے کردار مختلف طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ مولوی کے منہ سے عربی' فارسی کے الفاظ زیادہ نکلتے ہیں۔ پنڈت ہو تو سنسکرت اور ہندی کے الفاظ زیادہ استعمال ہوں گے اور ان پڑھ دیہاتی اپنی مقامی بولی ہی میں بات کریں گے۔ غرض ہر طبقے کے لوگوں کے لیے الگ الگ زبانیں استعمال ہوئی ہیں۔

پریم چند کا طرز بیان بھی بہت صاف اور سادہ ہے۔ اس میں کہیں پیچیدگی نہیں آنے پاتی۔ وہ سادے سادے لفظوں سے بڑے موثر جملے بنا لیتے ہیں۔ ان کی سادگی میں ایک قسم کی پرکاری ہے۔ مقولے اور محاورے بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔

ناول نگاری میں پریم چند کا درجہ بہت بلند ہے۔ ان کا گہرا مشاہدہ' وسیع تجربہ' فطرت انسانی کا غائر مطالعہ' واقعیت نگاری اور سادگی کے ساتھ پرکاری یہ سب خوبیاں ان میں پائی جاتی ہیں۔ وہ ایک خلاق فنکار ہیں' جن کی خوبیاں خامیوں پر بھاری ہیں۔

حواشی

۱۔ اردو ناول نگاری' صفحہ ۹۲۔

۲۔ اردو ناول نگاری' صفحہ ۱۰۰۔

مرزا محمد سعید

مرزا محمد سعید نے اردو میں "خواب ہستی" اور "یاسمین" کے نام سے دو ناول لکھے۔ ان میں مرزا رسوا کی طرح فنی صلاحیت پائی جاتی ہے، مگر رسوا سے ذرا کم درجے کی ان کی یہ صلاحیت تکنیک کے دباؤ میں آ کر پوری طرح ابھرنے نہیں پاتی۔ انہوں نے زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور انسانی نفسیات کا تجزیہ کر کے زندگی کا اہم پہلو نکال لیتے ہیں قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن ان کی انشا پردازی کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ ان کی اس صلاحیت کو نمایاں ہونے میں مانع آتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ انشا پرداز پہلے ہیں اور ناول نگار بعد میں۔

نیاز فتح پوری

نیاز فتح پوری بقول ڈاکٹر احسن فاروقی: "شاید اس وقت سب سے بڑے اردو نثر نگار ہیں۔ نکتہ چینی میں کوئی ان کو پلہ نہیں دکھا سکتا۔ ان کی علوم سے دلچسپی، ان کی سمجھ، ان کی ذہانت اور عملی قوت اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ ان میں ایک خاص انفرادیت ہے، اور اس انفرادیت کا سکہ اردو نثر پر ہمیشہ کے لیے جم چکا ہے۔(۱) انہوں نے اپنے مشہور ماہنامہ "نگار" کے ذریعے ایک مدت تک اردو علم و ادب کی خدمت کی۔

نیاز فتح پوری نے "شہاب کی سرگزشت" اور "ایک شاعر کا انجام" کے نام سے طبعزاد ناول لکھے ہیں، لیکن ان پر ان کی انشا پردازی غالب ہے۔ فنی لحاظ سے ان کے یہ دو ناول کوئی اعلیٰ مقام نہیں رکھتے۔ انہوں نے ان میں شعر اور فلسفے کا امتزاج پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شعر کا تعلق دل سے ہے اور فلسفے کا دماغ سے۔ وہ ان دونوں میں توازن قائم نہ کر سکے۔ ان کے ان ناولوں میں خاص کشش کی چیز ان کی فلسفہ طرازی ہے۔ ورنہ سوائے انشا پردازی کے ناول کی حیثیت سے وہ کوئی خاص کارنامے نہیں ہیں۔ وہ اپنے اچھوتے اور نرالے انداز تحریر سے ہر جگہ ایک امتیازی شان پیدا کرنا چاہتے ہیں، جو انہیں تصنع کی حد تک لے جاتا ہے۔ ان کے مکالموں، فنون لطیفہ کی بحثوں اور مناظر قدرت کے بیانوں سے ان کی انشا پردازی کی ایک شعوری کوشش

ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی تحریر میں بانکپن' شوخی اور رعنائی ہر جگہ نمایاں ہیں' لیکن بعض اوقات وہ نامانوس الفاظ اور عجیب و غریب ترکیبیں بھی استعمال کرجاتے ہیں' جن سے ان کے طرز تحریر میں مولانا ابوالکلام آزاد کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔"(۲)

علی عباس حسینی

علی عباس حسینی ۳ فروری ۱۸۹۷ء کو غازی پور میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ میں حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء میں مشن اسکول الہ آباد سے میٹرک پاس کیا۔ ریڈکرسچین کالج لکھنؤ سے ایف اے اور کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کیا۔ اس کے بعد پرائیویٹ طور پر ایم اے بھی پاس کر لیا۔ ۱۹۲۱ء میں ایل ٹی کیا۔ اور اس زمانے سے سرکاری ملازمت کرنی شروع کر دی۔ ۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ کالج' غازی پور کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔

علی عباس حسینی نے اردو میں دو ناول لکھے : ایک "سرسید احمد پاشا اور دوسرا "شاید کہ بہار آئی۔" ان میں اول الذکر ۱۹۱۹ء میں لکھا۔ یہ ایک رومانی قصہ ہے' جس کے واقعات حقیقی زندگی سے لیے گئے۔ اس میں کردار کا ارتقا بڑے فطری طریقے پر ہوا ہے' اور منظر کشی بہت متوازن اور معتدل ہے۔ مکالمے بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ جگہ جگہ نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے؟ جس سے مصنف کی فطرت انسانی کے گہرے مطالعے کا ثبوت ملتا ہے۔ زبان' سادہ اور لطیف ہے' جو ایک رومانی قصے کے لیے ہر طرح موزوں ہے۔ طرز بیان بھی بڑا دلکش ہے۔ عبارت میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ محاوروں اور روزمروں کا استعمال بڑی خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔ "شاید کہ بہار آئی" میں دو تعلیم یافتہ نوجوان میاں بیوی کی نفسیاتی الجھنیں دکھائی گئی ہیں' جس سے مصنف کی نفسیاتی بصیرت کا پتا چلتا ہے۔ اس میں کورٹ شپ کو اسلامی رنگ میں پیش کر کے ایک جدت پیدا کی گئی ہے۔ پہلے ناول کے پلاٹ کی طرح اس ناول کا پلاٹ بھی حقیقی زندگی پر مبنی ہے۔(۳)

مرزا عظیم بیگ چغتائی

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اردو میں کوئی گیارہ ناول لکھے (۱) کولتار' (۲) شریر بیوی' (۳) چمکی' (۴) خانم' (۵) ویمپائر' (۶) جنت کا بھوت' (۷) تفویض' (۸) شہزوری' (۹) قصر صحرا' (۱۰) کمزوری' (۱۱) فل بوٹ۔ ان میں "خانم" اور "چمکی" زیادہ ممتاز ہیں۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کا دلچسپ موضوع ہمارے معاشرے کے قدیم رسم و رواج پر نکتہ چینی ہے۔ وہ پردے کے مخالف اور کورٹ شپ کے قائل ہیں۔ کورٹ شپ کو تو بلکہ وہ اسلام کی روح اصلی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ماحول میں طلبہ اور

طالبات کی شرارتیں اور دل لگیاں بھی ان کی توجہ کے خاص مرکز ہیں۔ وہ ان باتوں کو ذرا سے تغیر کے ساتھ بار بار پیش کرتے ہیں۔ اس طرح گویا ان کا دائرہ عمل ایک لحاظ سے محدود ہو جاتا ہے لیکن چونکہ وہ علی گڑھ کے ماحول سے اچھی طرح واقف ہیں' اس لیے ان باتوں کی مصوری خوب کرتے ہیں۔ ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے خاندانی وقار اور شرافت کے خوب پروپیگنڈے کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناول "خانم" میں اپنے گھر اور خاندان کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ ان پر یہ اعتراض غالبا اسی ناول کی بنا پر ہے۔

چغتائی کی زبان صاف اردو اور طرز بیان دلکش اور پرکیف ہے۔ ان کی تحریر میں ظرافت کا عنصر دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

شوکت تھانوی

شوکت تھانوی بڑے زندہ دل اور ظریف انسان تھے۔ پیشہ صحافت تھا لیکن تصنیف و تالیف کا کام بھی اتنا کرتے تھے کہ بہت کم لوگ کرسکتے ہیں۔ پان خوب کھاتے تھے۔ لوگوں کو ہنسانا اور لکھنا ہی ان کا کام تھا۔ انہوں نے اردو میں بہت سے ناول لکھے۔ ان کے چند ناول یہ ہیں۔ (۱) کتیا' (۲) گرگٹ' (۳) دل پھینک' (۴) معمہ خاتون' (۵) بیوی' (۶) سوتیا چاہ' (۷) ڈھونگ' (۸) شیطان کی ڈائری' (۹) خدانخواستہ' (۱۰) سپنے' (۱۱) خانم خان' (۱۲) بکواس' (۱۳) بربھس' (۱۴) لاحول' (۱۵) جوڑ توڑ' (۱۶) بقراط وغیرہ۔

شوکت تھانوی بہت ہی زود نویس تھے۔ ان کو زیادہ سوچ بچار کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ناول کے پلاٹ کسی قدر سطحی ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر میں صحافتی انداز نمایاں ہے۔ وہ چلتی ہوئی عام زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ زندگی کے مطالعہ میں وہ گہرائی اور گیرائی کا ثبوت نہیں دیتے۔ ان کے ناولوں میں اگر ظرافت کا عنصر غالب نہ ہوتا تو لوگ شاید انہیں اتنے شوق سے نہ پڑھتے۔ ان کے ناولوں میں ایک یکرنگی چھائی ہوئی ہے۔ جو قاری کے دل پر ایک ہی قسم کا تاثر پیدا کرتی ہے۔

ایم اسلم

ایم اسلم وہ شخص ہیں جن کے ناول ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ وہ اس قدر بسیار نویس ہیں کہ دو سو سے زائد ناول اور افسانوں کے مجموعے مارکیٹ میں نکال چکے ہیں۔ ان کے ناولوں میں عشقیہ' معاشرتی' تاریخی وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق ہیں۔

ایم اسلم اسلامی معاشرت کے دلدادہ ہیں' پردے کے شدید حامی اور مغربی تہذیب کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی روایات کی قدریں زیادہ اہم ہیں' اور ہر جگہ ان ہی قدروں کی تبلیغ اور پرچار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے ناول مقصدیت کے حامل ہیں۔ ان کے ہاں مادی عشق کی بہ نسبت روحانی عشق پر زیادہ زور ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں' ان میں ایک مسلمان کا نقطہ نگاہ سب سے مقدم ہوتا ہے۔

ایم اسلم کی تحریر میں خلوص پایا جاتا ہے۔ بیشتر ناولوں میں ایک ہلکا سا حزن رچا ہوا ہے۔ ان کے مکالمے فطری اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ منظر نگاری' خاص طور پر بدوی یا صحرائی زندگی کی عکاسی میں انہیں کمال حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

نسیم حجازی

نسیم حجازی کو اگر اردو ناول کا شرر ثانی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ان کا بھی دلچسپ موضوع شرر کی طرح مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ ہے۔ انہوں نے جتنے ناول لکھے ہیں' عموماً سب کا موضوع تاریخی ہے۔(۱) سو سال بعد' (۲) داستان مجاہد' (۳) محمد بن قاسم' (۴) آخری چٹان' (۵) شاہین' (۶) خاک اور خون' (۷) یوسف بن تاشقین' (۸) آخری معرکہ وغیرہ سب اسی قسم کے ناول ہیں۔

نسیم حجازی میں مذہبی جوش غالب ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ دنیا کے دیگر مروجہ مذاہب کے خلاف قاری کو اکساتے رہتے ہیں۔ ان کا انداز غیر مسلمان کے لیے باعث تکلیف ہے۔ ان کا مقصد ہمیشہ اپنے مذہب کی تبلیغ ہوتا ہے۔ ان کے مکالمے حد سے زیادہ طویل اور غیر فطری ہیں۔ مثالیت پسندی ان کی ناول نگاری کا طرہ امتیاز ہے۔

حواشی

۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ' ۲۵۳۔

۲۔ اردو ناول نگاری' صفحہ ۱۱۲۔

۳۔ اردو ناول نگاری' صفحہ ۱۱۹۔ ۱۲۰

کرشن چندر

کرشن چندر اردو ادب میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، لیکن انہوں نے کئی ایک ناول بھی لکھے ہیں۔ (۱) شکست، (۲) جب کھیت جاگے، (۳) طوفان کی کلیاں، (۴) دل کی وادیاں سو گئیں وغیرہ۔ لیکن وہ جتنے کامیاب افسانہ نگار ہیں، اتنے کامیاب ناول نویس نہیں۔ ان کا پہلا ناول "شکست" ہے۔ جو بقول ڈاکٹر احسن فاروقی: "ان کی فن ناول نگاری سے شکست کھانے کی صاف مثال ہے۔ "اس کا موضوع سرمائے اور محنت کی کش مکش میں نادار عورت کی تباہی ہے۔ کرشن چندر نے یہ موضوع ترقی پسند ادب(۱) کی تحریک کے زیر اثر اختیار کیا ہے۔ "شکست" کشمیری زندگی کا ناول ہے لیکن کشن پرشاد کول کے الفاظ میں: "اس میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی، جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ کشمیر کی دیہاتی زندگی کی تصویر ہے۔(۲) "جب کھیت جاگے" میں بھی وہی محنت اور سرمایہ کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ "اس میں زمینداروں، مہاجنوں اور مل مالکوں کے ساتھ ساتھ حکومت کے مظالم اور کاشت کاروں اور مزدوروں کے مصائب کا دردناک بیان ہے۔"(۳) کرشن چندر کا یہ ناول بہترین ہے۔

"طوفان کی کلیاں" میں کرشن چندر نے کشمیر کے غریب مزدوروں اور کسانوں پر ڈوگرہ شاہی اور اس کے ایجنٹوں کے مظالم کا حال بیان کیا ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مظالم برداشت کرتے کرتے عوام کا پیمانہ صبر جب ایک دن لبریز ہو جاتا ہے، اور وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں، تو حکومت ان میں مذہب کے نام پر پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کرتی ہے، اور ہندو مسلم کا جھگڑا کھڑا کر کے ان کی طاقت کو توڑ دیتی ہے۔

"دل کی وادیاں سو گئیں" میں کرشن چندر نے مختلف طبقات انسانی کی نفسیات کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ ہر طبقے کا انسان اپنی ایک الگ فطرت رکھتا ہے، اور وہ وقتی طور پر کسی مجبوری کے تحت دوسروں سے مل بھی جاتا ہے، لیکن وہ اپنی اصلیت کو ہرگز ترک نہیں کرتا، بلکہ موقع پاتے ہی اپنے اصلی روپ میں آ جاتا ہے۔ اس میں بھی ایک لحاظ سے طبقاتی کشمکش ہی دکھائی گئی ہے،

جو کرشن چندر کا محبوب موضوع ہے۔

کرشن چندر کی زبان بہت صاف اور سادہ ہے۔ اس میں ہلکے پھلکے ہندی کے الفاظ بڑے اچھے لگتے ہیں۔ ان کے بیان میں درد و سوز بھرا ہوا ہے۔ جذباتی عنصر بھی ان کے ہاں بہت زیادہ ہے، جو بعض اوقات مسحور کن ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں داخلی اور خارجی حقیقت نگاری کا بڑا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں محبت بہت پاکیزہ اور صحت مند ہے۔ وہ ماں، بہن، بیٹی اور وطن سے محبت کرنا سکھاتے ہیں۔

چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

حواشی

۱۔ برصغیر میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں پڑی۔ تاریخ عالم میں انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ بڑا انقلاب آفرین ہے۔ اس عہد میں سائنس نے حیرت انگیز ترقی کی، نئی نئی ایجادیں ہوئیں۔ زندگی کو بہت قریب سے دیکھا جانے لگا۔ جمہوریت و مساوات کا غلغلہ بلند ہوا۔ ہر طرف آزادی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مزدور اور سرمایہ دار میں کشیدگی بڑھنا شروع ہوئی۔ کارل مارکس اور فرائڈ کے نظریات نے انسان کی دو بنیادی ضرورتوں کو زندگی کا سب کچھ قرار دیا۔ "بھوک" اور "جنس" دو ہی چیزیں ہیں، جو ہماری زندگی میں سب سے زیادہ اہم اور مقدم ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم کے بعد محنت اور سرمایے میں تصادم اور شدت اختیار کر گیا۔ فرائڈ کے نظریات کے ماتحت زندگی میں جنس کو تو اہمیت دے ہی دی گئی تھی۔ اب بھوک کا مداوا بھی بڑے زور و شور سے تلاش کیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ باتیں ادب میں بھی راہ پانے لگیں لیکن اس بات کی منظم کوشش کا آغاز پیرس میں ہوا، جب کہ وہاں پہلی بار "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ برصغیر کے نمائندے کی حیثیت سے سجاد ظہیر نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ وہاں سے واپس آ کر انہوں نے برصغیر میں بھی تحریک کی بنیاد رکھی، اور ترقی پسند مصنفین کے نام سے ایک انجمن قائم کی، جس کے اصول و ضوابط وہی تھے، جو پیرس کانفرنس میں بنائے گئے تھے۔ "بھوک" اور "جنس" زندگی کے حقائق ہیں۔ ان کا ہوبہو نقشہ جب تک ادب میں نہ ہو، وہ ادب ادب ہی نہیں۔ یہ تحریک نوجوان ادیبوں میں زیادہ مقبول ہوئی۔ ان لوگوں نے ان دو باتوں کو اپنا موضوع بنایا اور حقیقت نگاری کے نام سے ایسی عریانیت کا مظاہرہ کیا، جو ادب کے لیے باعث ننگ ہے۔ بھوک اور افلاس کا بھی خوب خوب ذکر ہوا۔

۲۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، صفحہ ۲۷۷۔ ۳۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، صفحہ ۲۷۷۔

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی کے دو ناول مشہور ہیں' ایک "ضدی" دوسرا "ٹیڑھی لکیر"۔ "ضدی" میں ایک متوسط طبقے کے نوجوان پورن اور ادنیٰ طبقے کی ایک لڑکی آشا کی محبت کی داستان ہے' جو ٹریجڈی پر ختم ہوتی ہے۔ ناول اصلاحی ہے اور اس کا انجام مصنوعی۔ یہ ناول عصمت کے شایاں شان نہیں۔ ان کا شاہکار اصل میں دوسرا ناول "ٹیڑھی لکیر" ہے۔ یہ ایک کرداری ناول ہے اور سوانحی طرز پر بیان ہوا ہے۔ اس میں ایک معمولی ذہن' معمولی صورت اور معمولی کردار والی اوسط طبقے کی مسلمان لڑکی زندگی کے مختلف مراحل طے کرتی ہوئی' اور مختلف قسم کی دنیا سے گزرتی ہوئی ایک منزل پر پہنچتی دکھائی گئی ہے۔ اس کی زندگی کی مختلف منزلوں میں پیش آنے والے چھوٹے بڑے واقعات سے اس کی سیرت و کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ ناول نگار نے اس میں نفسیات کے اصول کو ملحوظ رکھ کر کردار کو آگے بڑھایا ہے اور ہر مرحلے پر ایک ٹیڑھا پن دکھایا ہے۔ اس کی زندگی کے نقوش ابھارنے میں انہوں نے ترقی پسند ادب کی تحریک کے زیر اثر بڑی بے باکی کے ساتھ جنسی حرکات کو صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ ان کے اس طرز عمل پر زیادہ تر لوگوں کو اعتراض ہے۔ اس اعتراض کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی: انجمن ترقی پسند مصنفین نے جو عوام کی دلچسپی دیکھتے ہوئے اپنا راہ عمل بناتی ہے' عصمت کو اپنے دائرے سے خارج کر دینے کا اعلان کر دیا۔(۱)

عصمت نے اس لڑکی کی پیدائش سے لے کر شادی تک اس کی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ والدین' بھائی بہن' سہیلیوں اور عزیزوں کے علاوہ اسکول اور کالجوں کی ہم جماعت لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اس کے تعلقات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ زبان و بیان کی لطافت' چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملے اور نپے تلے الفاظ اور محاروں کا استعمال اور روزمرہ کی صفائی و شستگی یہ سب ایسی خصوصیات ہیں' جو عصمت کے ہاں بخوبی پائی جاتی ہیں۔ ان کے ناول کی دوسری بعض خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ **واقعیت:** وہ واقعیت نگاری میں بڑی بے باک ہیں۔ انہیں تمام اداروں کی پول کھولنے میں ایک خاص تسکین ہوتی ہے۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہیں۔ بلکہ معاشرے کی برائیوں پر غیر جانبدارانہ تنقید کرتی ہیں۔ وہ فرائیڈ کے نظریہ حیات سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اس لیے ان کے ناول کے بیشتر حصے کو فرائیڈ زدہ کہا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس نظریہ کو فنی آمیزش کے ساتھ پیش کیا ہے اور اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔

۲۔ **نفسیات کا تجزیہ:** انہوں نے نفسیات کی تحلیل و تجزیہ میں بڑی روشن خیالی کا ثبوت دیا ہے۔ اسی بنا پر ان کے ہر کردار میں ایک انفرادی شان پیدا ہو گئی ہے۔

۳۔ **تکنیک:** وہ ناول کی تکنیک سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے فن کی جاذبیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تکنیک کو نہایت خوبی کے ساتھ ہر جگہ برتتی ہیں۔

۴۔ **طنزیہ:** عصمت میں طنز کا ملکہ قدرت سے ودیعت ہوا ہے۔ ان کو اخلاقی، تعلیمی، مذہبی، ادبی غرض ہر قسم کے ڈھونگ سے نفرت ہے اور اس نفرت کو وہ طنز کے ذریعے ظاہر کرتی ہیں وہ اس انداز میں ہماری زندگی کے ان حقائق کو بھی اجاگر کرتی ہیں، جن سے ہم بے خبر رہتے ہیں۔ اس طنز سے ان کا مقصد ایک لحاظ سے اصلاحی ہے۔ لیکن وہ اتنا نمایاں نہیں ہونے پاتا۔

۵۔ **ڈرامائی رجحان:** ان کی فطرت کا رجحان ڈرامائی ہے۔ اسی لیے وہ طویل بیانات میں بہت کم پڑتی ہیں۔ ایک آدھ جملے لکھ کر ہی وہ مکالمے پر اتر آتی ہیں اور اس کے ذریعے واقعات اور کردار کے عادات و اطوار پر روشنی ڈالتی جاتی ہیں۔(۲)

ان سب خصوصیات کی وجہ سے "ٹیڑھی لکیر" بڑی قابل قدر ناول بن گئی ہے۔ اور عصمت کا شمار چوٹی کے ناول نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔

حواشی

۱۔ اردو ناول کی تنقید تاریخ، صفحہ ۲۸۳۔

۲۔ ماخوذ از اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، صفحہ ۲۸۵۔ ۲۸۷۔

عزیز احمد

عام ناول نگاروں کی بہ نسبت عزیز احمد زیادہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں۔ اسی بنا پر لوگ اردو ناول نگاری کے مستقبل کے بارے میں بہت سی امیدیں ان سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ اب یہ امیدیں کہاں تک پوری ہوتی ہیں' اس کا فیصلہ زمانہ کرے گا۔ اب تک انہوں نے اردو ناولوں کو جو کچھ دیا ہے' اس وقت ذیل میں ہم صرف اس کا جزوی طور پر جائزہ لیتے ہیں:

عزیز احمد کے چند اردو ناول کے نام یہ ہیں: (۱) ہوس' (۲) گریز (۳) آگ' (۴) ایسی بلندی ایسی پستی' (۵) شبنم۔

ان میں سے زیادہ اہم اور عزیز احمد کے فنی کمال کا نمائندہ "گریز" ہے۔ اس لیے ہم یہاں اپنی بحث بالفعل "گریز" ہی تک محدود رکھیں گے۔ یہ ایک کرداری ناول ہے' جس میں متوسط گھرانے کے ایک نوجوان نعیم الحسن کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ وہ اولاً اپنے خاندان کی ایک لڑکی بلقیس سے محبت کرتا ہے لیکن اتفاق سے اپنے آئی سی ایس کے لیے منتخب ہو جانے پر اس سے وہ اپنا دل پھیر لیتا ہے' اور بہتر لڑکی کی تلاش کرنے لگتا ہے' لیکن اسے ہر جگہ مایوس ہونا پڑتا۔ وہ ٹریننگ کے لیے انگلینڈ جاتا ہے تو وہاں بھی سخت مایوسی کا شکار ہوتا ہے۔ وہاں اسے پہلی مرتبہ نسلی امتیاز اور سیاسی غلامی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ وہ ہر قسم کی بے اعتدالی کا مرتکب ہو گیا۔ اس لیے کہ غم غلط کرنے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ زندگی کی ہماہمی' تگ و دو اور جدوجہد سے اس کا گریز یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے نوکری کے امتحان میں تو کامیابی حاصل کر لی' لیکن زندگی کے امتحان میں سخت ناکام رہا۔ زندگی کی یہ ناکامی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلقیس نے اس کا انتظار فضول سمجھ کر دوسری جگہ شادی کر لی ہے تو یہاں آکر اس کی فراریت اور شدت اختیار کر جاتی ہے۔

"گریز" میں عزیز احمد نے نعیم الحسن کے کردار کا ارتقا بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔ پوری کہانی گویا اسی ایک کردار کے گرد گھومتی ہے۔ نعیم الحسن ایک ایسا ہیرو ہے' جو اپنے دماغ میں ایک

خاص قسم کا رخنہ لیے ہوئے ہوتا ہے، اور ملک ملک، در در ٹھوکریں کھاتا ہوا پریشان اور ناامید گھر واپس آتا ہے۔ آخر کار یہاں تک نوبت پہنچی کہ اس نے اپنی زندگی کو بے معنی بنا لیا، اور غیر مطمئن، شکی، چڑچڑا اور ہر بات پر اعتراض کرنے والا ایک الجھا ہوا انسان بن کر رہ گیا۔

فلسفہ حیات میں عزیز احمد خاص طور پر فرائڈی نقطۂ نگاہ سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ وہ جنسی حقائق بڑی تفصیل اور بے باکی سے بیان کرتے ہیں، اور اس میں کبھی کبھی وہ حد اعتدال سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں۔ باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجاہل ہونے کے ان کا یہ رجحان بڑا تعجب خیز ہے۔ اس بنا پر "گریز" کا ذہنی اور فکری پہلو بہت ہی پست سمجھا جاتا ہے لیکن عزیز احمد کی اس فطری کمزوری کے باوجود ناول کی تکنیک پر ان کا قابو پا جانا قابل داد ہے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب دونوں جگہوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس سے ان کی نظر میں بلندی، فکر میں گہرائی اور خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور ناول کی تکنیک کو بلند معیار تک پہنچانے میں بڑی مدد ملی۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے "نعیم الحسن کا کردار کچھ بھی سہی، مگر جس طرح اس کی داستان شروع ہوئی، جن جن مراحل اور واقعات سے گزاری گئی، اور جس طرح ختم کی گئی، وہ سب اچھی طرح تراشے ہوئے سڈول اور خوبصورت بنائے ہوئے ایک دوسرے میں منطقی ربط کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، اور ایک خوبصورت شکل سامنے لاتے ہیں۔(۱)

ان کی زبان پر اگرچہ دکن کا کچھ اثر ہے، لیکن ان کا اسلوب بڑا دلکش اور رنگین ہے۔ وہ فن کے اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف ہیں۔

حواشی

۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، صفحہ ۲۹۱

قرۃ العین حیدر

انگریزی ادب سے متاثر ہو کر کافی لوگوں نے اردو میں ناول لکھے' اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق انگریزی اسلوب سے استفادہ کرنے کی کوشش کی' لیکن اس معاملے میں شاید قرۃ العین حیدر سب سے پیش پیش ہیں۔ ان کے ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینہ غم دل" پڑھ کر دیکھیے' انگریزی کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ' محاورات' تلمیحات بلکہ بعض جگہ مکمل جملے ان میں ملیں گے۔ زبان سے قطع نظر ان کا اسلوب بھی انگریزی ہے۔ اس میں شک نہیں' انہوں نے انگریزی ادب کا اچھا مطالعہ کیا ہے' اور انگریزی طرز معاشرت سے اپنے آپ کو اوروں سے زیادہ مانوس کیا ہے' لیکن اردو ادب میں بھی انگریزیت اُس قدر برتنا' جس سے اردو کی کم مائیگی معلوم ہو' کسی طرح قابل تحسین نہیں ہوسکتا' کوئی غیر اہل زبان ان کی تحریریں پڑھ کر صرف یہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ محترمہ نے جن انگریزی الفاظ اور محاورات کا کثرت سے استعمال کیا ہے' ان کے متبادل الفاظ اردو میں نہیں ہیں۔ حالانکہ امر واقعہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ اردو اب اتنی ترقی کرچکی کہ ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کی اس میں پوری صلاحیت موجود ہے۔ مصنفہ کو اگر اس اسلوب سے اپنی انفرادیت قائم کرنی ہے' تو یہ بھی کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ ایک اچھے فن کار کے لیے اس کا فن ہی اُس کی انفرادیت کا کفیل ہے۔

قرۃ العین حیدر کے دونوں ناول اودھ کے تعلقہ دار خاندان کی تاریخ ہیں' جن میں ان کی معاشرت تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اس معاشرت پر مغربی تہذیب کا رنگ بہت گہرا ہے۔ یہاں تک کہ افراد خاندان کے سوچنے کا طریقہ بھی بالکل انگریزی ہے۔(۱)

قرۃ العین کے ہاں کردار کا ارتقا نہیں پایا جاتا۔ کردار جس طرح پہلے شروع ہوتا ہے' آخر تک ویسا ہی رہتا ہے۔ ان کو فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں نہ محض فنون لطیفہ کا بیان ملتا ہے' بلکہ اس کا رچاؤ بھی ملتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے بعد میں اور جو بڑے ناول لکھے' وہ یہ ہیں: (۱) آگ کا دریا' (۲) آخر

شب کے ہم سفر' (۳) کارجہاں دراز ہے' (۴) گردش رنگ چمن۔ ان کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے ناقدین اور مبصرین رسالوں اور اخباروں میں برابر لکھ رہے ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر اگرچہ کم و بیش وہی ہے' جو اوپر بیان ہوا ہے' لیکن یہ امر مسلم ہے' کہ فنی لحاظ سے یہ چاروں ناول زیادہ کامیاب ہیں' اور ان کی کہنہ مشقی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔

حواشی

۱۔ اردو ناول نگاری' صفحہ ۲۴۰۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی انگریزی ادب میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری لئے ہوئے ہیں' اور کئی ایک یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ اس لیے انہوں نے انگریزی ادب کا جو اثر قبول کیا ہوگا' وہ ظاہر ہے۔ انہوں نے "اردو ناول کی تنقیدی تاریخ" لکھی' جس سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی آنکھوں پر انگریزی ادب کی عینک چڑھی ہوئی ہے۔ وہ ہر چیز کو اس ادب کے معیار پر جانچتے ہیں۔ لامحالہ ان کی تنقید بڑی شدید ہے' اور ان کا ناول نگاری کا نظریہ یا معیار بہت اونچا ہوگیا ہے۔ اردو ناول کی پوری تاریخ میں دو چار ناول نگار ہی ایسے ہیں' جو ان کے معیار پر آدھے یا پورے اترے ہیں۔ (پورا کوئی نہیں اترتا)۔ باقی تمام ناول "دریا برد" ہونے کے قابل اور جملہ ناول نگار قابل گردن زدنی ہے' لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ایک شخص دوسروں کے لیے ایک خاص معیار قائم کرے' اور خود بھی اس پر پورا اترے؟ غالبا نہیں' ورنہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ضرور اردو ناول میں ایسے شاہکار تخلیق کرتے' جو خود ان کے بنائے ہوئے معیار پر پورے اترتے ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے اردو میں تین ناول لکھے : (۱) شام اودھ' (۲) زلفیں اور زنجیریں' (۳) رہ و رسم آشنائی' ان میں سے "شام اودھ" میں انہوں نے محنت کی ہے' اور اس میں جان پیدا ہوئی ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے' جس میں لکھنؤ کا زوال پذیر تمدن پیش کیا گیا ہے۔ ان سے پہلے سرشار نے لکھنؤ کی اس معاشرت کا مرقع کھینچا تھا لیکن نقش ثانی نقش اول سے ہر اعتبار سے بہتر ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی میں فنی شعور موجود ہے' اور وہ ناول کی تکنیک سے آگاہ ہیں۔ سرشار کے ناول داستان سے لگا کھاتے ہیں' اور ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول صحیح معنوں میں ناول ہیں۔

اس سے پہلے قرۃ العین حیدر کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ اپنے ناول میں انگریزیت زیادہ برتی ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں ہیں۔ وہ اگر اول نمبر پر تھیں' تو یہ دوسرے نمبر پر ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھنؤ کے ماحول میں پلے بڑھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کی زبان بھی بڑی شستہ اور شائستہ ہونی چاہئے تھی لیکن اتفاق سے وہ ویسی نہیں ہے۔ اس میں ذرا ناہمواری ہے۔ انگریزی الفاظ و محاورات کی شکایات الگ ہیں۔

تبصرہ

اردو ناول کی تاریخ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی قصوں سے شروع ہوتی ہے۔ ان کا پہلا قصہ یا ناول "مراۃ العروس" پہلی مرتبہ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ اردو میں ناول نگاری کی تاریخ قاعدے کے لحاظ سے اسی سنہ سے شمار ہونی چاہیے۔ اس وقت سے لے کر اب تک اردو ادب میں بے شمار ناول نگار پیدا ہوئے۔ ان میں سے بعض اپنے لافانی شاہکار چھوڑ کر اس جہاں سے رخصت ہوئے۔ بعض ابھی تک بقید حیات ہیں، اور کچھ نہ کچھ لکھ رہے ہیں، بعض ابھی نوجوان ہیں۔ یہ لوگ اب تک بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اور جب تک زندہ رہیں گے لکھتے رہیں گے۔ ہم نے پچھلے صفحات میں ان بے شمار اردو ناول نگاروں میں سے صرف بیس ممتاز اور نمائندہ شخصیتوں کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں آدھے سے زیادہ وفات پا چکے ہیں، باقی زندہ ہیں، اور لکھ رہے ہیں، کوئی ست، کوئی تیز۔ ممکن ہے کچھ ایسے حضرات رہ گئے ہوں، جو دوسروں کی نگاہ میں ممتاز ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس فہرست میں ایسے لوگ شامل ہوگئے ہوں، جن کو ممتاز نہیں کہنا چاہیے۔

اردو میں ناول کی بنیاد تو اسی وقت پڑ گئی تھی، جب اس میں داستانی ادب وجود میں آگیا تھا، لیکن ناول کا جو جدید تصور ہمارے ذہن میں ہے، اس کا اولین خاکہ ڈپٹی نذیر احمد نے مرتب کیا ہے۔ ناول کی عمارت کی بنیاد کی پہلی اینٹ انہوں نے رکھی۔ بعض نقاد اگرچہ ان کے قصوں کو ناول کے زمرے میں شمار کرنے پر اعتراض کرتے ہیں، لیکن وہ ناول کے ابتدائی نقوش ضرور ہیں۔ اس لیے ڈپٹی نذیر احمد کو ہم اردو ناول کا بانی کہہ سکتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے بعد اردو کی تاریخ میں سرشار، شرر اور مرزا رسوا آئے، اور انہوں نے اپنی کاوشوں سے اردو ناول کو وہ وقار بخشا جو ابھی تک قائم ہے۔ سرشار نے ناول نگاری کی فطرت میں جلا بخشی۔ شرر نے اس کا سلیقہ ایجاد کیا اور مرزا رسوا نے اس کو فن سے روشناس کرایا۔ ان تینوں ادیبوں نے اپنے اپنے دائرے میں رہ کر اردو ناول کی ایسی خدمت کی کہ جو ابھی

رینگتا ہوا بچہ تھا وہ زندگی کے کئی اہم مراحل جلدی جلدی طے کر کے عالم شباب پہ پہنچ گیا' اور اپنے آپ کو دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب کا ہم پلہ تصور کرنے لگا۔ سرشار نے ایک خاص عہد کے لکھنؤ کی معاشرت اور تہذیب کے پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا' اور "فسانہ آزاد" کی شکل میں اپنا ایسا کارنامہ چھوڑا کہ اردو ناول کی تاریخ کبھی اسے نظرانداز نہیں کر سکتی۔ شرر نے اپنے تاریخی ناولوں کے ذریعے ناول نگاری کے میدان میں ایک دوسری شاہراہ نکالی۔ مرزا رسوا نے "امراؤ جان ادا" لکھ کر ناول کو اس کے فنی لوازمات سے آشنا کیا۔ ان فنی لوازمات کا شمار ہم اس طرح کر سکتے ہیں :

۱۔ پلاٹ اور اس کے مختلف فنی اجزا۔

۲۔ ایک اہم موضوع۔

۳۔ اہم موضوع کے پیش کرنے کے لیے ایک موزوں اور پر کشش آغاز۔

۴۔ الجھن۔

۵۔ ارتقا۔

۶۔ منتہا۔

۷۔ منطقی انجام۔

۸۔ زندگی سے بھرپور کردار۔

۹۔ ایک واضح نقطۂ نظر کی موجودگی۔

۱۰۔ مقصد اور فن کا باہمی توازن۔

۱۱۔ موضوع اور بیان میں مکمل مطابقت اور ہم آہنگی۔

۱۲۔ مصنف کی شخصیت کا گہرا پرتو اور اس کی فکری اور جذباتی صلاحیتوں اور قوتوں کا پورا رچاؤ۔

۱۳۔ مشاہدہ اور احساس کا حسین امتزاج۔(۱)

اوپر کی یہ تیرہ خصوصیات جدید ناول کی مقتضیات ہیں۔ مرزا رسوا سے پہلے ان باتوں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ ان میں سے بعض باتیں ڈپٹی نذیر احمد کے قصوں' سرشار کی "سرگزشت لکھنؤ" اور شرر کے تاریخی ناولوں میں تو ضرور پائے جاتے ہیں اور جن کی بنا پر نقادوں کے اعتراض کرنے پر بھی' وہ ناول کہلانے کے مستحق ٹھہرتے ہیں لیکن یہ سب ان کی شعوری کوششیں نہیں ہیں۔ صرف اپنے آپ غیر شعوری طور پر جو خوبیاں پیدا ہوگئیں۔ مرزا رسوا شعوری طور پر ان باتوں پر عامل ہوئے' اور بہت حد تک کامیاب رہے۔

ان بزرگان ادب کی ادبی خدمات کے بعد اردو ناول کی تاریخ میں کچھ دن کے لیے ایک جمود سا طاری ہوگیا۔ بعد کے ناول نگاروں نے اس صنف ادب کو فنی لحاظ سے ترقی دینے کی بہ نسبت ان پیشروں کی قائم کردہ روایات کی تقلید کرنے پر قناعت کی۔ مثال کے طور پر راشد الخیری نے اپنے پھوپھا کی پیروی میں ایسے ناول لکھے' جن کی خوبیاں یا برائیاں اتنی ہی ہیں' جتنی کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں تھیں۔

البتہ کچھ عرصے بعد ناول نگاری کے میدان میں پریم چند آئے' اور ناول کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولا۔ انہوں نے ایسے ناول لکھے' جو "اردو کی تاریخ میں زندگی اور فن کی عظمت اور بلندی کے بہترین مظہر ہیں۔ پریم چند نے نہ صرف اسے وسعت دی' "بلکہ اپنی فنی بصیرت سے اسے ایک نیا مفہوم عطا کیا' اور اسے ایسے امکانات کا حامل بنایا کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا کوئی موقع اور فکر' احساس اور جذبے کی کوئی پیچیدگی اس کے لیے بیگانہ نہیں رہی۔" (۲)

اردو ناول کی تاریخ میں ۱۹۳۲ء بڑا اہم ہے۔ اس سنہ میں سجاد ظہیر کی کوششوں سے برصغیر میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" قائم ہوئی' جس کا اصل محرک کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت تھا۔ "انجمن ترقی پسند مصنفین کا یہ لائحہ عمل بنا کہ ادب میں بھی اشتراکی مسائل مثلاً طبقاتی کشمکش' محنت اور سرمایہ میں کشیدگی اور بھوک و افلاس کی ترجمانی ہونی چاہیے۔ ادب میں زندگی کا ہوبہو عکس ہونا چاہیے' چاہے وہ کیسی ہی شکل میں ہو' یہیں سے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا غلط تفرقہ وجود میں آیا۔ حالانکہ ادب برائے ادب کوئی چیز ہی نہیں۔ دنیا میں کوئی ادب بھی ایسا نہیں ہے' جس میں زندگی کا عکس نہ ہو۔ زندگی کے ہزاروں پہلو ہیں۔ ہر ادب میں اس کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے ادب میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا امتیاز برتنا بالکل بے بنیاد بات ہے لیکن "انجمن ترقی پسند مصنفین" کو ادب میں اپنی اس جدت پر اصرار تھا۔ بہرحال یہ نظریہ یورپ سے برآمد کردہ تھا' اس لیے ہمارے ملک کے ادیبوں خصوصاً نوجوان ادیبوں کو بہت بھایا۔ انہوں نے اس راہ پر طبع آزمائی کی' اور کافی ناول لکھ ڈالے۔ بڑے ناول نگاروں میں عصمت چغتائی' کرشن چندر اور عزیز احمد نے اس رجحان کو اپنایا۔ عزیز احمد میں یہ رنگ ذرا ہلکا ہے۔ ان کا ناول "گریز" اس کا آئینہ دار ہے۔ البتہ کرشن چندر نے اشتراکی مسائل کو بہت زیادہ اپنایا۔ ان کا کوئی ناول بھی اس قسم کے خیالات سے خالی نہیں۔ وہ ایک لحاظ سے "انجمن ترقی پسند مصنفین" کے صحیح نمائندے اور ترجمان ہیں۔ عصمت چغتائی کی ترقی پسندی کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ انہوں نے زندگی اور معاشرہ کی تصویر کشی میں عینیت سے کام لیا۔ زندگی کے روشن پہلو کو بھی اجاگر کیا' اور اس کے تاریک پہلو کو بھی' نتیجہ یہ ہوا کہ وہ

عریاں نگار مشہور ہوئیں۔

آگے چل کر ترقی پسندی کا دوسرا نام عریانیت قرار پایا۔ جنسی جذبات و میلانات کے اظہار پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس سے رفتہ رفتہ سنجیدہ لوگوں کو ترقی پسندی سے نفرت پیدا ہونے لگی۔ حالانکہ ترقی پسندی بجائے خود کوئی برا رجحان نہیں ہے' بلکہ زمانے کے تقاضے کے مطابق اس پر عمل پیرا ہونا اشد ضروری ہے۔ ورنہ ادب میں جمود پیدا ہو جائے گا۔ انسان کی زندگی حرکی ہے' ادب کو بھی اس کے ساتھ حرکت میں رہنا چاہئے۔

ترقی پسند مصنفین نے ادبی دنیا میں ایک بڑا ہنگامہ تو برپا کر دیا' لیکن یہ صرف وقتی شور و غوغا تک محدود رہا۔ اس کا زور ٹوٹ چکا' اب لوگ ترقی پسند مصنفین کی حقیقت پسندی کو چھوڑ کر اپنی حقیقت پسندی کی طرف آ رہے ہیں۔

حواشی

۱۔ داستان سے افسانے تک' صفحہ ۸۲۔

۲۔ داستان سے افسانے تک' صفحہ ۸۳۔

ڈراما

تمہید:-

ڈرامائی ادب کا تعلق اسٹیج اور تھیٹر سے ہے اور ڈراما تمثیل نگاری کا دوسرا نام ہے۔ تمثیل کو جب تک اسٹیج پر مناسب اور موزوں اداکاری کے ذریعے عملی شکل میں نہ لیا جائے، ڈراما کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسٹیج کی کامیابی اور ناکامی ڈراما کی کامیابی اور ناکامی ہے۔ اس لیے جب ہم ڈراما کا جائزہ لینا چاہیں، تو اسٹیج کی اہمیت کو کسی طرح نظرانداز نہیں کرسکتے۔

اسٹیج

اردو اسٹیج اور تھیٹر کی ابتدائی ساخت و پرداخت کا تعلق ان باشندگان پرتگال سے ہے، جو ۱۴۹۸ء میں سیاسی، معاشی، تجارتی اور تبلیغی مشن کے ساتھ برصغیر آئے۔ یورپین اقوام میں وہ سب سے پہلے افراد تھے، جو کالی کٹ وارد ہوئے، اور تبلیغ و تجارت کرتے رہے۔ یہ لوگ انتہائی درجے کے مذہب پرست واقع ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے گوا پر قبضہ جمانے کے بعد مختلف مشنوں کے ذریعے تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اردو کے ابتدائی ڈرامے جو پرتگیز اور ان تبلیغی مشنوں نے اسٹیج کئے، وہ سب مذہبی ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں۔(۱)

اردو اسٹیج کا رواج اول اول ان ہی لوگوں سے ہوا۔ پرتگیز کے بعد ۱۶۰۰ء میں انگریز آئے اور بہت جلد اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ ان لوگوں نے اپنی سرپرستی میں اردو ڈرامے اسٹیج کرائے۔ تاریخی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ ۱۷۵۰ء میں بمبئی میں ایک تھیٹر موجود تھا، اور اس میں ڈرامے بھی دکھائے جاتے تھے۔(۲) یہ تھیٹر "بمبئی تھیٹر" کے نام سے بمبئی گرین (حال ہارنی مین سرکل) میں تعمیر ہوا تھا۔ اس میں ۱۸۳۵ء تک ڈرامے دکھائے گئے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ پھر ۱۸۴۵ء میں گرانٹ روڈ پر ایک دوسرا تھیٹر اسی نام سے بنایا گیا لیکن گرانٹ روڈ پر ہونے کی وجہ

سے اس کا نام رفتہ رفتہ گرانٹ روڈ تھیٹر پڑ گیا- یہ تھیٹر ۱۸۷۰ء تک باقاعدہ چلتا رہا' اور اس میں اردو ڈرامے اسٹیج کئے جاتے رہے- اس کے بعد کنور جی ناظر نے اپنی نئی اسکیم کے ماتحت یہ تھیٹر ایک لمبی مدت کے لیے کرایہ پر لے لیا-(۳)

حواشی

۱- اردو تھیٹر' جلد اول' صفحہ ۴۴-۴۵-

۲- اردو تھیٹر' جلد اول' صفحہ ۱۴۳-

۳- اردو ڈراما' تاریخ و تنقید' صفحہ ۱۷۷-

تھیٹریکل کمپنیاں

۱۸۷۰ء کے بعد بمبئی میں متعدد اعلیٰ پائے کے تھیٹر قائم کیے گئے، جن کے مالک اور پروپرائٹر سب پارسی تھے۔ اس سے پہلے تھیٹر کی حیثیت پیشہ ورانہ نہ تھی، لیکن اب جو تھیٹریکل کمپنیاں قائم ہوئیں، وہ خالص تجارتی اغراض سے قائم ہوئیں۔ وہ کمپنیاں حسب ذیل ہیں:

اوریجنل تھیٹریکل کمپنی: اس کمپنی کے بانی سیٹھ پسنن جی فرام جی ہیں۔ وہ ایک شاعر بھی تھے اور رنگ و پروین تخلص کرتے تھے۔ اواخر انیسویں صدی عیسوی میں انہوں نے بمبئی میں اپنی اس کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ اس میں وہ خود بھی اداکاری کرتے تھے۔ خورشید جی بالیوانا، کاوس جی کھٹاؤ اور جہانگیر جی اس کمپنی کے دوسرے نامور اداکار تھے۔ حسینی میاں ظریف اس کمپنی کے ڈراما نگار تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں کمپنی نے بڑی شہرت حاصل کر لی۔

وکٹوریہ ناٹک کمپنی: فرام جی کے انتقال کے بعد اوریجنل تھنریکل کمپنی کے شرکا الگ الگ ہوگئے، اور اپنی اپنی کمپنیاں قائم کیں۔ ان میں سے خورشید جی بالی والا نے "وکٹوریہ ناٹک کمپنی" کے نام سے اپنی کمپنی قائم کی۔ بالی والا اپنے زمانے کے بہترین طربیہ اداکار تھے۔ طبیعت میں چھچھورپن نہ تھا۔ ہر جگہ اپنی متانت و سنجیدگی قائم رکھتے تھے۔ پبلک میں بہت دلعزیز تھے۔ وہ اسٹیج پر آتے، تو تھیٹر میں ایک دم سے سناٹا چھا جاتا۔ ۱۸۷۷ء میں دہلی دربار کے موقع پر وکٹوریہ ناٹک کمپنی نے بہت نام اور روپیہ پیدا کیا۔ اسی شہرت کی بنا پر اس نے انگلستان کا سفر کیا، لیکن وہاں اسے کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ بعض اخباروں نے اس کی ہمت افزائی کی۔ ملکہ وکٹوریہ اور ایڈورڈ ہفتم کے حضور میں ڈراما پیش کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے کمپنی کے اداکاروں کے حوصلے بڑھائے۔ بالی وانا کے علاوہ اس کمپنی کے دوسرے مشہور اداکار رستم جی، مس خورشید، مس زہرہ، مس مہتاب وغیرہ تھیں کمپنی کے ڈراما نویس منشی ونائک پرشاد اور طالب بنارسی تھے۔

الفریڈ تھیٹریکل کمپنی: اوریجنل تھیٹریکل کمپنی کے مشہور اداکار کاوس جی کھٹاؤ نے یہ کمپنی قائم کی تھی۔ کاوس جی کھٹاؤ خورشید جی بالیوانا کے مقابلے میں حزنیہ اداکاری میں بڑی مہارت

رکھتے تھے۔ انہوں نے زیادہ تر شیکسپیئر کے ڈرامے، رومیو جولیٹ اور "ہملیٹ" کے اردو ترجمے اسٹیج کئے اور خود علی الترتیب رومیو اور ہملیٹ کے پارٹ بڑی کامیابی سے ادا کئے۔ اس کمپنی کے دوسرے مشہور اداکار منچر شاہ، گلزار خان، ماسٹر موہن، مادھو رام، مس زہرہ، مس گوہر وغیرہ تھیں۔ ۱۹۱۴ء تک یہ کمپنی کاوس جی کی زیر نگرانی چلتی رہی۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا، تو ان کے لڑکے جہانگیر جی نے چار پانچ سال تک کام سنبھالا۔ پھر کلکتے کے ایک مشہور تاجر نے کمپنی خرید لی۔ شروع شروع میں اس کے ڈراما نویسوں میں منشی مہدی حسن احسن تھے۔ بعد میں آغا حشر اور بیتاب بنارسی بھی شامل ہو گئے۔

نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی: یہ کمپنی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے مقابلے میں قائم کی گئی۔ اس کے بانی محمد علی ناخدا تھے۔ سہراب جی کو، جو ایک مشہور اداکار اور فن کار تھے، اس کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ سہراب جی نے اس کمپنی کی ہر طرح مدد کی۔ اس کی روز افزوں شہرت میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ ایک لحاظ سے سہراب جی ہی کمپنی کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ان کی سرکردگی میں کمپنی نے برصغیر کے بڑے بڑے شہروں اور ریاستوں میں گشت کر کے ڈرامے اسٹیج کئے، خوب نام پیدا کیا اور روپیہ کمایا۔ آخر سہراب جی کی ضعیفی کے سبب احمد آباد میں مستقلاً" قیام پذیر ہو گئی۔ اس کمپنی کے مشہور اداکار سہراب جی کے علاوہ عباس علی اور امرت لال کیشمو خیال کئے جاتے ہیں۔

اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی: یہ کمپنی انیسویں صدی کے اواخر میں قائم ہوئی تھی، لیکن ۱۹ میں پنجاب کے دورے میں اسٹیج میں ناگہانی طور پر آگ لگ گئی، اور سب جل کر راکھ ہو گیا۔ اس میں ہزاروں روپیوں کا خسارہ ہوا۔ اس کے پروپرائٹر ایک ممتاز پارسی اداکار سیٹھ اردشیر بل ٹھونٹھی تھے۔ انہوں نے کچھ عرصے کے اندر اپنی محنت اور جانفشانی سے کمپنی کو از سرنو زندہ کیا۔ اس کے ماتحت وقت کے مشہور ڈرامے برصغیر کے مختلف مقامات پر اسٹیج ہوتے رہے۔

جوبلی کمپنی: انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ریاست رام پور میں نواب حامد علی خان نے زرکثیر صرف کر کے تھیٹر کے لیے شاہی شان و شوکت کے ساتھ قلعہ معلی کے سامنے شاندار وسیع عمارت تعمیر کرائی، اور اسٹیج کے جملہ لوازمات کے ساتھ فنکاروں اور اداکاروں کی رہائش کا انتظام کیا۔ ایک عرصے تک اس میں اردو کے بہترین ڈرامے بہترین اداکاروں کے ذریعے اسٹیج ہوتے رہے لیکن کچھ دن بعد نواب کا دل اس طرف سے اچاٹ ہو گیا، تو کمپنی ٹوٹ گئی۔ کمپنی کے ناظم اعلیٰ نواب کے عزیز اور پرائیویٹ سیکرٹری صاحبزادہ محمود علی خان نے ممتاز فنکاروں اور اداکاروں کو لے کر دہلی چلے گئے، اور جوبلی کمپنی کے نام سے اپنی ذاتی کمپنی

کی۔ اس کے بہترین اداکاروں میں سید عباس علی تھے' جو خود ڈراما نویس تھے اور فن اداکاری کے علاوہ خوش گو نغمہ نواز تھے۔ وہ اپنے ڈراما "گل رو زرینہ" میں رستم کا پارٹ ادا کرتے تھے۔ ان کی وجہ سے کمپنی کو بہت شہرت حاصل ہوئی لیکن کچھ عرصہ بعد کمپنی کے مالک کی دلچسپی کم ہوگئی اور سید عباس علی بھی طویل علالت کے باعث کمپنی کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی ناکام ہونے لگی۔ عباس علی کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں بڑا صدمہ ہوا' اور فوراً فیصلہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو' وہ اسٹیج پر آکر "گل رو زرینہ" میں رستم کا پارٹ ادا کریں گے۔ اعلان کروا دیا گیا وہ ایک آپریشن کے بعد زخموں سے چور پڑے تھے۔ ڈاکٹروں نے منع کیا' لیکن وہ باز نہ آئے' وہ اسٹیج پر آئے' رستم کا پارٹ نہایت جوش و خروش کے ساتھ ادا کیا اور شائقین سے داد تحسین حاصل کی لیکن انجام وہی ہوا' جو ہوتا تھا۔ زخموں کے ٹانکے کھل گئے' اور بستر مرگ پر جا کر لیٹے۔ یہ ان کی زندگی کا آخری ڈراما تھا۔ ان کے انتقال کے بعد کمپنی بھی ختم ہوگئی۔

دوسری کمپنیاں

مندرجہ بالا تھئیٹریکل کمپنیوں کے زیر اثر اسٹیج کا رواج اس قدر عام ہوگیا کہ دیکھتے ہی
برصغیر کے کونے کونے میں چھوٹی بڑی لاتعداد کمپنیاں قائم ہوگئیں۔ ان میں سے بیشتر ایسی
خالص تجارتی اغراض سے قائم ہوئیں، اور ان میں جو ڈرامے کھیلے گئے، وہ عموماً کمتر در
تھے۔ کچھ کمپنیاں جو تجارتی مقصد کے ساتھ فن کا بھی لحاظ رکھتی تھی، وہ حسب ذیل ہیں:

- دی راجپوتانہ مالوہ تھیٹریکل کمپنی، جودھپور۔
- لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی، آگرہ۔
- بے نظیر اسٹار انڈیا تھیٹریکل کمپنی، علی گڑھ و آگرہ۔
- انڈین امپیریل تھیٹریکل کمپنی، فتح پور۔
- دی مون آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی، حیدر آباد دکن۔
- میڈن تھیٹرز لمیٹیڈ۔ کلکتہ۔
- شیکسپیئرن تھیٹریکل کمپنی، بمبئی۔
- جمعدار تھیٹریکل کمپنی۔
- امپیریل تھیٹریکل کمپنی۔
- انڈیا امپیریل تھیٹریکل کمپنی۔
- البرٹ تھیٹریکل کمپنی آف پنجاب۔
- حیدر آباد ڈرامیٹک کلب، حیدر آباد دکن۔
- بیاکل بھارت تھیٹریکل کمپنی، میرٹھ۔
- بال روم تھیٹریکل کمپنی، حیدر آباد دکن۔
- دال منڈی تھیٹریکل کمپنی، حیدر آباد دکن۔
- انڈین شیکسپئیر تھیٹریکل کمپنی۔

- سوریہ وجے ناٹک کمپنی' بریلی۔
- گلوب تھیٹر آف پنجاب' لاہور۔
- پریم پرچاری ناٹک منڈلی' پنجاب۔
- سیتا رام تھیٹر۔
- مہاراجہ چرکھاری کی کمپنی۔
- پنجاب ریفارمنگ تھیٹریکل کمپنی' لاہور۔
- سرکاری تھیٹریکل کمپنی' ٹونک۔(۱)

حواشی

۱۔ اردو ڈراما کی تنقید و تاریخ' صفحہ ۱۸۸-۱۹۲۔

ڈراما کے عناصر خمسہ

اردو ادب کے مورخین اور ناقدین نے اردو ڈراما کی بنیاد پانچ عناصر پر رکھی ہے۔ یہ پانچ عناصر حسب ذیل ہیں:

۱۔ **قدیم سنسکرت ڈراما:۔** برصغیر میں زمانہ قدیم سے سنسکرت ڈراموں کا' جو عموماً ہندو دیو مالا پر مبنی ہوتے تھے' کثرت سے رواج تھا۔ یہ ڈرامے بعض صورتوں میں کافی ترقی یافتہ تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان ڈراموں کا اثر اردو ڈراموں پر بھی پڑا' اگرچہ برائے نام ہی سہی۔ سنسکرت ڈراما نگاروں میں کالی داس' مہاراجہ ہرش دیو اور بھوبھوتی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے کالی داس کا ڈراما "شکنتلا" بہت مشہور ہے۔ اور ہندی میں اس کے کئی ترجمے ہیں۔ کالی داس کا ایک اور سنسکرت ڈراما "وکرم اروسی" ہے۔

۲۔ **ہندو مریکل پلے:۔** ہندوؤں کے خاص مذہبی ڈرامے یا مریکل پلے اور دیوتاؤں اور دیویوں کے حالات کے مظاہرے سے بھی اردو ڈراما نے اثر لیا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہندو لوگ رام اور کرشن کی زندگیوں کے واقعات کو مختلف تہواروں کے موقعوں پر مندروں میں ڈراما کی شکل میں اپنے ہم مذہبوں کو دکھایا کرتے تھے' تاکہ وہ اپنی مذہبی روایات سے واقف ہوں' ان کی اچھی اچھی باتیں سیکھیں' اور اپنے دیوتاؤں اور سور ماؤں کے واقعات زندگی سے مفید سبق حاصل کریں۔ چنانچہ دسہرہ کے موقع پر "رامائن مہا بھارت" کے اس حصے کو دکھایا جاتا تھا' جس میں رام چندر جی اپنے حریف لنکا کے راون پر فتح پا کر بھارت ورش واپس آنے کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس قسم کے ڈرامے "رام ناٹک" یا "رامائن" کے نام سے مشہور تھے' اور مذہبی لوگوں خصوصاً عورتوں کو بہت پسند تھے۔ سری کرشن جی کی پیدائش کے موقع پر بھی ہندو ان کے جنم دن "کرشن جنم اسٹمی" کے نام سے مناتے تھے۔ اس تقریب پر مہا بھارت اور کرشن جی کی زندگیوں کے منتخب واقعات تمثیل کی شکل میں پیش کئے جاتے تھے۔ اس قسم کی تقریب کو "کرشن لیلا" کہا جاتا تھا۔ اس کو نوٹنکی یا سنگیت کی طرح پیش کیا جاتا تھا' اور بہروپ اور نقالی کے ساتھ

گانا بجانا ہوتا تھا- "کرشن لیلا" کا مکمل جلوس کی صورت میں کھیلا جاتا تھا- اور مختلف میدانوں اور محلوں میں اسٹیج قائم کر کے پیش کیا جاتا تھا-(۱)

۳- بھانڈوں کی نقلیں:- سنسکرت ڈراموں کا جب زوال شروع ہوا' تو پیشہ ور اداکاروں نے اپنی گزر اوقات کے لیے بھانڈ پن اور نقالوں نے نقالی شروع کر دی- بھانڈوں اور نقالوں کے گروہ عام طور پر بازاروں میں گھومتے پھرتے اور دکانوں کے سامنے یا بازار کے چوک میں نقلیں کیا کرتے تھے- راہ گیران کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور تماشا کے ختم ہونے پر ایک دو پیسہ دے کر ان کی مدد کرتے تھے- بعض نقال ٹولیاں بنا کر میلوں ٹھیلوں میں بانس اور کپڑوں سے تھوڑی سی جگہ گھیر لیتے تھے' اور نقلیں دکھا کر پیسے کماتے تھے- بھانڈوں اور نقالوں کے یہ خاندان زیادہ تر کشمیر سے آئے تھے' جن میں اکثر نقال اور گانے بجانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے- امیروں کی عام تفریحی مجالس اور شادی بیاہ کی محفلوں میں ان کو بلایا جاتا تھا' اور وہ لوگ اپنے کمالات کا مظاہرہ کر کے حاضرین کو محظوظ کرتے تھے- ان میں سے بعض حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی میں بڑی مہارت رکھتے تھے- نقال یا مسخرے امیر لوگوں کی صحبت یا ملازمت میں بھی رہتے تھے' اور اپنی ظریفانہ باتوں اور نقلوں سے مالکوں کا دل خوش کیا کرتے تھے- اردو ڈراموں پر اس قسم کی نقالی' بھانڈ پن اور مسخرا پن کا بھی کچھ اثر پڑا-

۴- اسلامی نظمیں اور روایات:- اردو ڈراموں کا چوتھا عنصر ترکیبی وہ اسلامی نظمیں اور روایات ہیں' جو زمانہ قدیم سے برصغیر میں رائج تھیں- رام بابو سکسینہ کا خیال ہے' یہ اردو ڈراما کا عنصر غالب ہیں- وہ لکھتے ہیں کہ "نظم اردو" عاشقانہ رنگ اور ڈراما نگاری کے لیے ایک خاص استعداد اور موزونیت رکھتی ہے- قدیم ڈراما نہایت موثر' پردرد اور اونچے سروں کی عاشقانہ نظموں میں ہوتے تھے- ان کی نثر مقفی اور شعر دونوں موثر ہیں-"(۲) اس کے علاوہ محرم کی مجالس عزا میں جو مرثیہ خوانی' سوز خوانی اور نوحہ خوانی ہوتی ہے' یا کربلا کے جو واقعات اسٹیج پر ڈرامائی انداز میں پیش کئے جاتے ہیں' ان سے بھی اردو ڈراما نے بہت کچھ حاصل کیا- مرثیہ میں عام طور پر شہدائے کربلا کے مناقب' حریفوں کے مصائب قدرتی و جنگی مناظر' رجز خوانی' گھوڑے' تلوار اور حرب و ضرب کے سامان وغیرہ کی صفت اور رزم و بزم کی فصیح و بلیغ تقریر کی نقشہ کشی کے ساتھ علو تخیل' سلاست زبان' فصاحت بیان' تسلسل و روانی کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے-(۳) اردو ڈراما پر ان باتوں کا بھی کافی اثر ہے-

۵- انگریزی ڈرامے:- اردو ڈراما کے عناصر ترکیبی میں انگریزی ڈراموں اور اسٹیج کا بھی خاص حصہ ہے- انگریزوں کے دور اقتدار میں بمبئی وغیرہ مقامات پر شیکسپیئر کے ڈراموں سے اردو

ترجمے خاص مغربی انداز میں پیش کئے گئے۔ چنانچہ اردو ڈراما کے اسٹیج کی وضع، تھیٹر کی ساخت، پردے، لباس، نشستوں کا طریقہ، تماشے کی تقسیم، پارٹوں کا انتظام یہ سب بالکل انگریزی اصول کے مطابق اور اسی کے زیر اثر ہیں۔ اردو ڈراما کی تقسیم اور تصنیف انگریزی ڈراما کی رہین منت ہے۔ متعدد انگریزی ڈراموں کے ترجموں کے علاوہ طبعزاد تصانیف میں بھی جو اصول اور فنی تکنیک استعمال کی گئیں، وہ خالص مغربی ہیں۔

حواشی

۱۔ اردو ڈراما کی تنقید و تاریخ، صفحہ ۱۸۸۔۱۹۲۔

۲۔ اردو ڈراما "تاریخ" و تنقید، صفحہ ۹۱۔

۳۔ تاریخ ادب اردو (ترجمہ حصہ دوم)، صفحہ ۱۴۴۔

اردو ڈراما کا آغاز و ارتقا

اردو ڈراما کا آغاز ترجموں سے ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ان ترجموں کا ذکر آتا ہے، جو انگریزوں کی سرپرستی میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں کئے گئے۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی اردو نوازی کا ذکر فورٹ ولیم کالج کے باب میں آچکا ہے۔ اردو ڈرامے پر بھی ان کا احسان کم نہیں ہے۔ انہوں نے جہاں انگریزی کے بعض شہ پارے اردو میں ترجمہ کیے، وہاں شیکسپیئر کے دو اقتباسات "شاہ ہنری ششم" اور "ہملٹ" کو بھی اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ دونوں اقتباسات ہندوستانی زبان کے قواعد میں شامل ہو کر ۱۷۹۶ء میں شائع ہوئے۔(۱)

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جب کہ برصغیر کی عام زندگی پر مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات بڑی تیزی سے پڑنے لگے، اور بمبئی میں مغربی طرز کے تھیٹر بھی انگریزوں کی سرکردگی میں قائم ہونے لگے، اور شیکسپیئر کے ڈراموں کے مختلف ترجمے اسٹیج کئے جانے لگے۔ ابتدائی مترجمین میں جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے، مہدی حسن احسن لکھنوی کا نام لیا جاتا ہے۔ مہدی حسن احسن الفرڈ تھیٹریکل کمپنی کے ڈراما نگار تھے۔ انہوں نے "خون ناحق" اور "شہید وفا" کے نام سے شیکسپیئر کے دو ڈراموں کے ترجمے کئے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ یہ ترجمے سب میں بہترین ہیں۔ مہدی حسن احسن نے شیکسپیئر کے ڈراما "دی مرچنٹ آف وینس" کا بھی اردو میں "دلفروش" کے نام سے ترجمہ کیا، جو ۱۹۰۰ء میں اسٹیج کیا گیا۔

"کامیڈی آف ایروس" بھی شیکسپیئر کے مشہور ڈراموں میں سے ہے۔ اس کے اردو میں دو ترجمے "گورکھ دھندا" اور "بھول بھلیاں" کے نام سے ہوئے۔ پہلا ترجمہ نارائن پرشاد بیتاب نے کیا، اور دوسرا لالہ سیتا رام نے۔ بیتاب کے ترجمے میں جابجا تبدیلیاں کی گئی ہیں، اور اصل قصے سے ہٹ کر مقامی شائقین کو خوش کرنے کی غرض سے گانے، مزاحیہ مکالمے اور اسی قسم کی دوسری باتیں اس میں شامل کردی گئیں، جس سے اصل تصنیف کی خوبیاں زائل ہوگئیں۔ سیتا رام شیکسپیئر کے ڈراموں کی خوبیوں کو تو سمجھ گئے تھے، لیکن زبان و بیاں پر قدرت نہ رہنے کے

سبب ترجمے میں بڑی خامیاں رہ گئی ہیں۔

آغا حشر کاشمیری نے "میزر فار میزر" کا ترجمہ "شہید ناز" کے نام سے کیا' جسے نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی' بمبئی نے ۱۹۰۵ء میں اسٹیج کیا' اور کامیابی حاصل کی۔ بیتاب نے "دی ٹامپیسٹ" کا ترجمہ "خداداد" کے نام سے کیا' لیکن اس میں اس قدر تبدیلیاں کر دی گئی کہ اسے ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔ اسے پارسی کمپنی بمبئی نے ۱۸۹۱ء میں اسٹیج کیا۔ "خداداد" کے نام سے اور بھی دو ترجمے ہیں۔ ایک کو منشی کریم الدین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے' اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے "پریکلز" سے ترجمہ کیا۔" دوسرے کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ حسینی میاں ظریف کی تالیف ہے۔ "ایمبیلائن" کے اردو میں تین ترجمے ہوئے۔ ایک "ظلم ناروا" جس کو امپرس تھیٹریکل کمپنی' بمبئی نے ۱۸۹۹ء میں اسٹیج کیا' اس کے مترجم کا نام معلوم نہیں۔ دوسرا' "میٹھا زہر۔" مترجمہ منشی مصطفیٰ سید علی۔ اس کو پارسی کمپنی' بمبئی نے ۱۹۰۰ء میں اسٹیج کیا' اور تیسرا "سیمبلین" مترجمہ عبدالعزیز ان تینوں میں "میٹھا زہر" زیادہ مقبول ہوا۔

"دی وینسنر زتیل" کے اردو میں دو ترجمے ہوئے' ایک محمد شاہ کا ہے' دوسرا آغا حشر کا۔ حشر کا ترجمہ "مرید شک" زیادہ مشہور ہے۔ اسے الفریڈ کمپنی' بمبئی نے ۱۸۹۸ء میں اسٹیج کیا۔ "رچرڈ تھری" کے اردو میں دو ترجمے ہوئے۔ ایک آغا محمد کا ہے' جو غیر معروف ہے' دوسرا آغا حشر نے "صید ہوس" کے نام سے کیا' جو بہت مشہور و مقبول ہوا۔ اس کو پارسی کمپنی' بمبئی نے ۱۹۰۶ء میں اسٹیج کیا۔

شیکسپئر کے مشہور ڈراما "رومیو اینڈ جولیٹ" کے اردو میں پانچ چھ ترجمے ہوئے۔ (۱) "بزم فانی" از مہر حسن (۲) محمد شاہ کا ترجمہ (۳) گلنار فیروز از مہدی حسن (۴) فیروز گلنار" از نظیر بیگ ۵) "گلنار فیروز" از جے ایل سیٹھ ان کے علاوہ (۶) اے بی لطیف کے ڈراما "جنون و وفا کو بھی بعض لوگوں نے "رومیو اینڈ جولیٹ کا ترجمہ بتایا ہے۔ "بزم فانی" کو الفریڈ کمپنی' بمبئی نے ۱۸۹۷ء میں پہلی مرتبہ اسٹیج کیا' محمد شاہ کا ترجمہ ۱۹۰۸ء میں مختلف کمپنیوں نے اسٹیج پر دکھایا' اور خوب روپیہ کمایا۔

"ہملٹ" شیکسپئر کا مشہور ترین اور بہترین ڈراما سمجھا جاتا ہے۔ اردو میں اس کے چار ترجمے ہوئے۔ ان میں سے مہدی حسن احسن کے ترجمے "خون ناحق" کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس کو ۱۸۹۵ء میں اسٹیج کیا گیا۔ اس کے علاوہ امراؤ علی کا ترجمہ "جہانگیر" ۱۸۹۵ء میں' محمد افضل بیگ کا "ہملٹ اور نظیر بیگ کا "واقعہ جہانگیر ناشاد" ۱۹۰۲ء میں اسٹیج کیا گیا۔ ان چاروں ترجموں میں' جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے' احسن کا ترجمہ "خون ناحق" سب سے زیادہ مشہور ہوا۔

"آتھیلو" کے بھی اردو میں چار ترجمے ہوئے- ایک احمد حسین خان کا "جعفر" جو ۱۸۹۵ء میں اسٹیج کیا گیا' دوسرا مہدی حسن احسن کا "شہید وفا" جس کا ذکر شروع میں کیا جاچکا ہے- تیسرا گوپال گوئلی کا "آتھیلو" ۱۹۱۱ء میں اور نظر دھلوی کا "شیر دل" ۱۹۱۸ء میں کھیلا گیا- ان چاروں ترجموں میں "شہید وفا" زیادہ کامیاب رہا- دی امپرس وکٹوریہ کمپنی' بمبئی نے ۱۴ دسمبر ۱۹۱۸ء کو پہلی مرتبہ اسٹیج کیا' اور بہت زیادہ مقبول ہوا-

"کنگ لیر" کے بھی اردو میں چار ترجمے پائے جاتے ہیں- ایک "لیر" مترجمہ لالہ سیتا رام دوسرا "سفید خون" مترجمہ سردار محمد تیسرا "ہارا جیتا" مترجمہ منشی مراد علی اور چوتھا "سفید خون" مترجمہ آغا حشر- "ہارا جیتا" کو وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی' بمبئی نے ۱۹۰۵ء میں اسٹیج کیا' اور آغاز حشر کے "سفید خون" کو پارسی کمپنی' بمبئی نے ۱۹۰۶ء میں کھیلا- "انتونی اینڈ کلوپٹرا" کے اردو میں دو ترجموں کا پتا چلتا ہے- ایک کالی ناگن عرف زن مرید" مرتبہ منشی انور الدین مخلص اور منشی محشر اور دوسرا "کرشمہ شباب عرف مار آستین" مترجمہ" ایم ایچ حیران یہ دونوں ترجمے بہت ناقص ہیں-

سید تفضل حسین نے شیکسپئر کے ڈرامے "ہنری فیفتھ" کا "تسخیر فرانس" کے نام سے اور "جولیس سیزر" کا اسی نام سے اردو میں ترجمہ کیا- زبان و بیان کے لحاظ سے یہ دونوں ترجمے بہت عمدہ ہیں' اور دوسرے اردو ترجمہ کے مقابلے میں ایک خصوصیت کے حامل ہیں- ان میں شیکسپئر کے دونوں ڈراموں کو بلا کم و کاست منتقل کیا گیا' اور مصنف کے اصلی خیالات کو حتی المقدرو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے- ان میں کردار کے نام اور مقامات کے نام بھی اپنی اصلی حالت پر قائم رکھے گئے ہیں- "تسخیر فرانس" "رسالہ الناظر" لکھنؤ میں بطور ضمیمہ جولائی' ۱۹۱۳ء سے دسمبر ۱۹۱۳ء تک شائع ہوتا رہا- بعد میں باہتمام محمد حسین محوی الناظر پریس لکھنؤ سے کتابی صورت میں شائع ہوا- "جولیس سیزر" ۱۹۲۳ء میں حیدر آباد سے زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہوا-(۲)

مندرجہ بالا ترجموں کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے شیکسپئر کے ڈراموں کے اردو میں مختلف نام سے مختلف اوقات میں ترجمے کئے' جن کی صحیح کیفیات معلوم نہیں ہوئیں- لیکن ان ترجموں سے اردو دان طبقے میں ڈراما کا مذاق درست ہوا' جس نے آگے چل کر طبع زاد اردو ڈراما بھی لکھے گئے-

شکنتلا:- اردو ڈراما کی تاریخ میں "شکنتلا کو بڑی اہمیت حاصل ہے- اصل "شکنتلا" سنسکرت میں ہے' اور مہاکوی کالیداس کی تصنیف ہے- پہلے اس کا ترجمہ ہندی میں ۱۷۱۶ء میں

شاہ فرخ سیر کے زمانے میں نواز نامی درباری شاعر نے کیا۔ ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر کاظم علی جوان نے آسان اور سلیس اردو میں اس کا ترجمہ کیا' جو ۱۸۰۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔(۳)

نواز کا ترجمہ کبت اور دوھوں میں تھا' اس لیے اس کا بجنسہ ترجمہ مشکل تھا۔ جوان نے سلیس اردو میں ترجمہ کیا' اور جہاں مناسب سمجھا اصل کبت اور دوھوں کو شامل کیا' لیکن اس کی حیثیت ادبی زیادہ اور ڈرامائی کم ہے۔ اسٹیج کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہے۔ اس لیے زیادہ مقبول بھی نہ ہو سکا۔

"شکنتلا" کے علاوہ کالی داس کے اور ایک سنسکرت ڈراما "وکرم اروسی" کا بھی ۱۹۰۷ء میں مولوی محمد عزیز مرزا نے اردو میں ترجمہ کیا' جو شمسی پریس' آگرہ سے شائع ہوا۔ اس کی بھی حیثیت بہت حد تک ادبی ہے۔ اسٹیج کے لیے کار آمد ثابت نہ ہوا۔(۴)

حواشی

۱- اردو تھیٹر' جلد اول' صفحہ ۲۱۹۔

۲- اردو میں ڈراما نگاری' صفحہ ۱۲۷-۱۲۹۔

۳- اردو ڈراما- تاریخ اور تنقید' صفحہ ۱۱۳۔

۴- اردو ڈراما- تاریخ اور تنقید' صفحہ ۱۱۳۔

اردو میں طبع زاد ڈرامے

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی تحقیق کے مطابق اردو کا سب سے پہلا ڈراما نویس ڈاکٹر بھاؤ دا جی لاڈ ہیں۔ وہ مرہٹہ ہیں۔ انہوں نے "راجہ گوپی چند اور جالندھر" لکھ کر ہندو ڈرامیٹک کور کے مرہٹہ ایکٹروں کے ذریعے ۱۸۵۳ء میں اسٹیج کیا۔ یہ ڈراما بہت پسند کیا گیا۔(۱) ڈاکٹر نامی نے اگرچہ کوئی صراحت نہیں کی، مگر ان کے انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے، وہ ڈراما طبع زاد ہی ہوگا۔

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھنؤ عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا تھا، نوابان اودھ خصوصاً واجد علی شاہ کے عہد (۱۸۴۷ء-۱۸۵۶) میں دولت کی فراوانی سے یہ کیفیت عروج پر تھی۔ اس لیے فنون لطیفہ، شعر و نغمہ اور رقص و سرود کو خوب سرپرستی ملی۔ ان دنوں تفریح کا ایک ذریعہ وہ سبھائیں بھی تھیں، جو حویلیوں اور احاطوں سے سڑکوں "گلیوں اور کوچوں تک ہر ممکن اہتمام کے ساتھ دکھائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی دولت مند اور سرمایہ دار اجرت پر ناٹک منڈلیاں بلاتے اور عوام کی تفریح و تفنن کا سامان بہم پہنچاتے۔ کبھی لوگ اپنے تفریحی ذوق کی تسکین کے لیے خود منڈلیاں بناتے اور رہس اور سبھائیں پیش کرتے تھے۔ ان ہی میں ایک سبھا "اندر سبھا" کے نام سے مشہور تھی، جو ہر طبقہ میں کافی مقبول تھی، اور مختلف جدتوں کے ساتھ عام طور پر کھیلی جاتی تھی، "اندر سبھا" کتنے ہی آدمیوں نے لکھی، اور صرف لکھنؤ میں کتنی ہی مرتبہ کھیلی گئی، اس کا پتا لگانا ناممکن ہے۔(۲)

ذیل میں واجد علی شاہ کے رہس اور امانت اور مداری لال کی اندر سبھاؤں کے بارے میں مختصر کیفیات درج کی جاتی ہیں:

حواشی

۱- اردو تھیٹر- جلد اول، صفحہ ۱۹۱- ۱۹۲-

۲- اردو تھیٹر- جلد اول، صفحہ ۲۲۹-

واجد علی شاہ کا دور

نواب واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء-۱۸۵۶ء) فنون لطیفہ کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے- وہ خود اپنے محل میں رقص و سرود کی محفلیں منعقد کرتے' ماہرین فن کو اپنے ہاں ملازم رکھتے' اور بہ نفس نفیس ان کو فنی تربیت دیا کرتے- وہ خود ماہر فن تھے- انہوں نے رہس کے نام سے "راس لیلا" کے انداز پر گانے بجانے کے جلسوں میں "کرشن لیلا" کی تمثیل و اداکاری بھی رائج کی اور اس مقصد کے لیے زرکار و مرصع ساز و سامان اور لباس کی تیاری میں لاکھوں روپے صرف کئے' اور ان مجالس کو باقاعدہ اسٹیج پر پیش کیا-

"رہس" پہلے محض کرشن' رادھا اور گوپیوں کے ناچ گانے تک محدود ہوتے تھے' اور رقص کے مختلف انداز اس رنگ میں پیش کئے جاتے تھے- واجد علی شاہ نے انواع و اقسام کے ناچ گیتوں اور ان کے دلکش انداز ایجاد کئے- مختلف انداز کے چھتیس "رہس" بھی خود انہوں نے اپنی نگرانی میں تیار کرائے' جو قیصر باغ کے شاہی اسٹیج پر دکھائے جاتے تھے- ان رہسوں میں خالص رقص و نغمہ کی نمائش اور فنی کمال کے مظاہرہ کئے جاتے- ان رہسوں کی پیش کش کے دوران میں واجد علی شاہ نے اپنی ایک مثنوی "افسانہ عشق" کو بھی اسی طرز پر تیار کرایا تھا- بعض ناقدین کے خیال میں اردو ڈراما کا یہی نقش اول ہے' جو "رہس" یا "اوپرا" کی شکل میں پیش کیا گیا- اس لحاظ سے اردو کے پہلے ڈراما نگار واجد علی شاہ قرار پاتے ہیں اور ان کے بعد امانت نے اندر سبھا" کا دوسرا نقش پیش کیا-(۱)

"رہس" دراصل خاص متھرا کا فن ہے- لکھنؤ میں اس کا رواج واجد علی شاہ کے عہد میں ہوا- قیصر باغ میں جوگیوں کا میلہ پہلے سے لگتا تھا- پری خانہ بھی قائم ہو چکا تھا- رہس کے لیے صرف ساز و سامان کی ضرورت تھی- کئی لاکھ روپیہ صرف کر کے ساز و سامان تیار کرایا گیا- ڈیڑھ سو حسین و جمیل عورتوں کو منتخب کر کے ان کو پریوں کا لباس اور زیور پہنایا گیا- ان کے جڑاؤ پر بھی تیار کرائے گئے' اور ان کے نام بھی پریوں ہی کے سے رکھے گئے- باقاعدہ رقص و

سرود کی تعلیم دی گئی۔ ایکٹنگ موقع اور محل کے لحاظ سے بتائی گئی۔(۲)

واجد علی شاہ نے متذکرہ بالا' رہس کے علاوہ "رادھا کنہیا" کی داستان پر ایک اور "رہس" لکھا' جس میں کرشن اور رادھا کے علاوہ چاروں سکھیاں اور بارہ رہس والیاں شریک تھیں۔

اردو ڈراما کے آغاز میں واجد علی شاہ کی ایجاد پسندی اور فنی جدتوں کو بڑا دخل ہے۔ اگرچہ "رہس" کو مکمل ڈرامائی تشکیل تسلیم نہیں کیا جاسکتا' تاہم اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ضرور ہے۔

حواشی

۱۔ اردو تھیٹر۔ جلد اول' صفحہ ۱۹۔۱۹۲۔

۲۔ اردو تھیٹر۔ جلد اول' صفحہ ۲۲۹۔

۳۔ اردو ڈراما۔ تاریخ و تنقید' صفحہ ۱۱۸۔۱۱۹۔

امانت

سید آغاز حسن امانت لکھنوی (م ۱۸۵۸ء) کی اندر سبھا' سب سے زیادہ مشہور ہے۔
"اندر سبھا" کی تالیف کا سبب بزبان مولف حسب ذیل ہے۔۔۔
"ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی' یگانہ ازلی' رفیق' شفیق مونس و غم خوار قدیمی جانثار' شاگرد اول' موزوں طبیعت متخلص بہ عبادت عاشق کلام امانت انہوں نے از راہ محبت کہا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسہ رھس کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہئے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہوئے' اور خلق میں شہرت پائے۔"(۱)

امانت کی "اندر سبھا" جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے' نظم میں ہے۔ اسے انہوں نے یکم اگست ۱۸۵۲ء کو لکھنا شروع کیا' اور ڈیڑھ سال میں اختتام کو پہنچایا۔ اس زمانے میں عام طور پر جو سبھائیں رائج تھیں' وہ سب مثنوی کے طور پر تھیں۔ گانے ان میں زائد ہوتے تھے۔ امانت نے بھی اپنی "اندر سبھا" میں وہی رنگ اختیار کیا۔(۲) اس کی زبان بہت سلیس اور فصیح ہے' اگرچہ اس کے بعض گانے ہندی زبان میں ہیں" لیکن وہ ٹھمری اور دادرے ہیں' جن کی عام زبان ہر زمانے میں یہی رہی ہے۔ فنی تکنیک کے اعتبار سے بھی اس کو بڑی حد تک مکمل ڈرامہ مانا گیا ہے۔(۳) اس لحاظ سے اردو ڈراموں میں اس کو اولیت حاصل ہے۔ "اندر سبھا" امانت کی زندگی میں ہی خاصی مقبول ہوگئی تھی' اور اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے تھے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں باہتمام مرزا مہدی علی خاں لکھنؤ سے نکلا' اور دوسرا ۱۸۵۵ء میں زیر انتظام علی بخش خان شائع ہوا۔ ان کے علاوہ کریمی پریس بمبئی' کی "اندر سبھا امانت' مطبوعہ ۱۸۸۷ء بھی بہت اہم ہے۔ یہ ایڈیشن مصور ہے' اور اس میں ۱۷ تصویریں ہیں۔

مداری لال

مداری لال ان پڑھ آدمی تھے۔ ان کی طرف جو "اندر سبھا" منسوب ہے' وہ اصل میں کئی آدمیوں کی مشترکہ تصنیف ہے لیکن چونکہ انہوں نے اسے جلسے کی صورت میں پبلک کے سامنے

پیش کیا تھا' اس لیے ان کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ "اندر سبھا" آٹھ سو تیس اشعار پر مشتمل ہے۔ مکالمے بے حد طویل ہیں۔ ایک ہی بات کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس لیے امانت کی "اندر سبھا" کے مقابلے میں یہ بہت کم درجے کی ہے۔ اس میں زبان کی وہ چاشنی اور بیان کی وہ سلاست اور فصاحت نہیں پائی جاتی' جو امانت کی اندر سبھا کی خصوصیت ہے۔

شیخ احمد حسین وافر جہانگیر نگری:- جہاں تک طبع زاد ڈراموں کا تعلق ہے' وہاں ڈھاکا کے شیخ احمد حسین وافر جہانگیر نگری کا ذکر بھی ضروری ہے۔ انہوں نے بھی واجد علی شاہ یا اندر سبھائی دور میں "بیمار بلبل" کے نام سے ایک ڈراما لکھا' جو ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا' گوکہ اس سے پہلے اسٹیج کیا گیا۔ اگرچہ اس ڈراما کا تعلق نادر سبھائی دور سے ہے' لیکن اس کے کردار تمام اسی دھرتی کے اشخاص ہیں۔ ان کا مکالمہ اور برتاؤ وغیرہ کا طریقہ ہم جیسے لوگوں کی طرح ہے۔ اس میں دیو' پریاں اور دیگر مافوق الفطرت عناصر نہیں پائے جاتے۔ اگرچہ کتاب کے مکالمے بالعموم منظوم ہیں لیکن منثور مکالمے بھی کافی ہیں۔ زبان و بیان میں قدامت کی چھاپ ضرور ہے۔

ڈراما نیز مصنف کے نام میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مختلف لوگوں نے مختلف طریقے سے لکھا ہے۔ البتہ مطبوعہ نسخے میں' جس کی ایک ہی کاپی ڈھاکا یونیورسٹی لائبریری کے "شفا الملک حکیم حبیب الرحمن سیکشن" میں موجود ہے' ڈراما کا نام: "بیمار بلبل" اور مصنف کا نام: شیخ احمد حسین وافر جہانگیر نگری درج ہے۔ سنہ اشاعت ۱۸۸۰ء ہے۔ اس اندر و نایاب کتاب کو' جو کہ تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے' ڈاکٹر محمد کلیم سہسرامی' پروفیسر راج شاہی یونیورسٹی نے بڑی کاوش اور جانفشانی سے نئی ترتیب اور ایک تحقیقی اور انتقادی مقدمے کے ساتھ ایڈیٹ کیا ہے' اور مغربی بنگال اردو اکادی' کلکتہ نے اسے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا ہے۔

حواشی

۱۔ اردو تھیٹر' جلد اول' صفحہ ۲۳۰۔

۲۔ اردو تھیٹر' جلد اول' صفحہ ۲۳۰۔

۳۔ اردو ڈراما۔ تاریخ و تنقید۔ صفحہ ۱۳۰۔

اس عہد کے بعض دوسرے ڈراما نگار

رونق بنارسی : انہوں نے اردو میں جو ڈرامے لکھے، وہ یہ ہیں : (۱) بے نظیر بدر منیر (۲) لیلیٰ مجنوں، (۳) انجام الفت، (۴) پورن بھگت، (۵) سیف سلیمان عرف معصوم معصومہ، (۶) حاتم بن طے، (۷) عاشق کا خون، (۸) فسانہ عجائب عرف جان عالم انجمن آرا، (۹) طلسم زہرہ، (۱۰) ستم ہامان عرف فریب عزرائیل، (۱۱) انصاف محمود شاہ عرف ظلم عمران، (۱۲) عجائب پرستان عرف بہارستان عشق، (۱۳) ظلم اظلم، (۱۴) خوابگاہ عشق، (۱۵) خواب محبت، (۱۶) چندا حور خورشید نور، (۱۷) نگین بکاؤلی، (۱۸) نقش سلیمانی، (۱۹) فریب فتنہ، (۲۰) نور الدین اور حسن افروز، (۲۱) گھڑی میں گھڑیال، (۲۲) چمبیلی گلاب۔

ان ڈراموں میں سے اکثر ایسے ہیں، جو دوسرے ڈراموں میں ردو بدل کر کے تیار کئے گئے ہیں۔ لیکن بعض طبع زاد بھی ہیں۔ رونق غالباً پہلے ڈراما نویس ہیں، جنہوں نے نثر کے مکالمے میں پرزور شعر خوانی کا انداز شروع کیا۔ وہ پارسی وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی میں اداکار کی حیثیت سے ملازم تھے۔ ۱۸۸۶ء میں اسٹیج پر اداکاری کے دوران میں حواس کھو بیٹھے، اور وہیں خودکشی کرلی۔

حسینی میاں ظریف :۔ ظریف کے نام سے جو ڈرامے منسوب ہیں، وہ یہ ہیں : (۱) نتیجہ عصمت، (۲) خدا دوست، (۳) چاند بی بی، (۴) تحفہ دلکشا، (۵) بابل بیمار، (۶) شیریں فرہاد، (۷) فریب فتنہ، (۸) ہوائی مجلس، (۹) حسن افروز، (۱۰) حاتم طائی، (۱۱) بدر منیر، (۱۲) ناصر و ہمایوں، (۱۳) ماتم ظفر، (۱۴) بزم سلیمان، (۱۵) چراغ الہ دین، (۱۶) خداداد، (۱۷) نیرنگ عشق، (۱۸) اکسیر اعظم، (۱۹) لیلیٰ مجنوں، (۲۰) عشرت سبھا، (۲۱) فرخ سبھا، (۲۲) علی بابا، (۲۳) گوپی چند۔

لیکن کثیر التصانیف ہونے کے باوجود ظریف کے بارے میں ناقدین کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ ان کی ڈراما نگاری زیادہ تر نقالی پر منحصر تھی۔ انہوں نے امانت کی تقلید میں دوچار ڈرامے لکھے، مگر ان میں کوئی خاص خوبیاں نہیں ہیں۔ اس کا اسلوب تحریر مرزا رسوا کے الفاظ میں : ''بمبئی کے مچھلی بازار کی بول چال کا نمونہ ہے۔'' شعر و شاعری کا عام انداز بہت پست اور ادنی

درجے کا ہے۔ وہ زیادہ تر پسنن جی فرام جی کی پارسی اورجنل کمپنی کے لیے جوڑ توڑ کے ڈراما تیار کرتے رہے۔ ان کا نقطۂ نگاہ اصل میں فنی اور ادبی سے زیادہ تجارتی تھا۔ اس لیے ظاہر بات ہے' ان میں فنی اور ادبی خوبیاں تلاش کرنا عبث ہے۔

حافظ محمد عبداللہ :۔ ان کے ڈرامے یہ ہیں : (۱) جشن پرستان' (۲) فرخ سبھا حافظ' (۳) ستم ہاماں' (۴) انجام ستم' (۵) فتنہ خانم' (۶) پولیس ناٹک' (۷) عاشق جانباز' (۸) انصاف محمود' (۹) ہیر رانجھا' (۱۰) نور جہاں' (۱۱) ذخیرہ عشرت' (۱۲) زہرہ و بہرام' (۱۳) افسانہ غمگین' (۱۴) عشق مہر انگیز و قباد' (۱۵) سخاوت حاتم طائی' (۱۶) سوانح قیس مفتوں' عرف عشق لیلیٰ مجنوں۔

عبداللہ نے سب سے پہلے لائٹ آف انڈیا میں اداکاری شروع کی' اور اس کمپنی کے لیے ڈراما بھی لکھتے رہے' لیکن ان کے ڈرامے زیادہ تر دوسرے مصنفین کے ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔

مرزا نظیر بیگ :۔ ان کے یہ ڈرامے زیادہ مشہور ہیں : (۱) نل دمن' (۲) ماہی گیر' (۳) سروش سخن' (۴) نیرنگ عشق حیرت انگیز عرف عشق شہزادہ بے نظیر و مہر انگیز' (۵) گلستان بے بہا' (۶) طلسماتی پتلہ عرف سحر سامری جمشیدی' (۷) ستم عشق و الفت' (۸) ابوالحسن' (۹) گلشن پاکدامنی عرف چند روالی لاثانی۔ ان میں آخر الذکر ڈراما سب سے زیادہ مقبول و مشہور ہوا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا اور ۲۱ واں ایڈیشن ۱۹۱۹ء میں طبع ہوا۔ دوسرے ڈراموں میں وہی کیفیت پائی جاتی ہے' جو اس عہد کے مصنفین کی عام روش تھی۔

طالب بنارسی :۔ ان کے مشہور ڈرامے یہ ہیں : (۱) گوپی چند' (۲) نازاں' (۳) نگاہ الفت' (۴) ہریش چندر' (۵) وکرم دلاس' (۶) دلیر دل شیر' (۷) لیل و نہار۔ انہوں نے دوسروں سے نسبتاً کم لکھا ہے' اور اس لیے شاید بہتر لکھا ہے۔ معاصرین میں ان کا درجہ بلند ہے۔ انہوں نے جب ڈراما نگاری شروع کی' اس وقت "اندر سبھا" کی فرسودہ تقلید جاری تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے اس روش کو ترک کر کے ڈھاکا کے شیخ احمد حسین وافر کے "بیمار بلبل" کے اسلوب پر' جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے' نظم کے ساتھ نثر کا مکالموں میں اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ ڈراما میں ہندی گانوں کے بجائے اردو گانے رائج کئے۔ ان کے ڈراموں میں مزاح اور طرب کا عنصر غالب ہے۔

منشی مہدی حسن احسن :۔ انہوں نے شیکسپیئر کے کئی انگریزی ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کر کے پیش کیا ہے' جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان کے علاوہ ان کی خاص تصانیف یہ ہیں : (۱) چندر وائی' (۲) چلتا پرزہ' (۳) کنگ تارہ' (۴) شریف بدمعاش۔

احسن ۱۸۹۷ء میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی میں ملازم ہوئے' اور اپنا ڈراما چندر وائی اسٹیج کیا۔ اس وقت سے ۱۹۰۴ء تک وہ مسلسل اردو ڈراما لکھتے رہے۔ اسٹیج اور ڈراما کی دنیا میں اس وقت

احسن ۵ رعب چھایا ہوا تھا۔ احسن نے جب لکھنا شروع کیا' اس وقت اسٹیج پر قدامت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے جدت و ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی' لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ اپنے دور کے باوقار انشا پرداز تھے۔ نثر اردو میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے تھے' اور ان کی رنگین نوائی اور خوش بیانی مستند تھی لیکن تجارتی نقطۂ نگاہ سے ان کی طرز بیکار تھی۔ عوام کو اس قسم کی ادبی خوبیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کو تفریح طبع منظور ہوتا تھا۔ اس لیے لامحالہ احسن کو بھی زمانے کے مذاق کا ساتھ دینا پڑتا' اور ان کے ڈرامے بھی عموماً قدیم انداز کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئے۔ تاہم ان کی بدولت نظم و نثر دونوں کا پایہ بلند ہوگیا۔ مکالموں میں خاص طور پر نثر کا حصہ غالب ہوا' اور ہندی کی جگہ سلیس اردو کا اضافہ ہوا اور نسبتاً اردو ڈراما سنجیدہ نظر آنے لگا۔ انہوں نے فنی نزاکت اور تکنیک کے پہلوؤں پر بھی غور کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بدولت اردو ڈراما ایک نئے موڑ کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

احسن کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ اردو اسٹیج کو ادبی رنگ میں رنگا جائے' مگر پارسی سیٹھوں نے طرز عام سے ہٹ کر کوئی نیا تجربہ کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ آخر احسن کی خوددار طبع نے ڈراما نویسی اور اسٹیج کو خیرباد کہہ کر کنارہ کشی اختیار کرلی۔

بیتاب بنارسی : ان کی تصانیف یہ ہیں : (۱) قتل نظیرن' (۲) حسن فرنگ' (۳) کرشن اوتار' (۴) کسوٹی' (۵) میٹھا زہر' (۶) زہری سانپ' (۷) پھوٹ کا پھل' (۸) علی بابا' (۹) توبہ شکن' (۱۰) گورکھ دھندا' (۱۱) مہا بھارت' (۱۲) رامائن' (۱۳) پتی پرتاپ' (۱۴) کرشن سداما' (۱۵) گنیش جنم' (۱۶) مدر انڈیا' (۱۷) سماج' (۱۸) سیتا' (۱۹) شکنتلا۔

ان میں "قتل نظیرن" "زہری سانپ" امرت" گورکھ دھندا" میٹھا زہر" "مہا بھارت" "رامائن" اور کرشن سداما خاص شہرت کے مالک ہیں۔

"قتل نظیرن" دہلی کی ایک طوائف نظیرن کے قتل کی داستان ہے۔ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی نے ۱۹۰۱ء میں اسٹیج کیا۔ اس کے بعد سے بیتاب الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے باقاعدہ ڈراما نگار بنے۔ ان کا ڈراما "مہا بھارت" سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں دہلی میں اسٹیج کیا گیا۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں اور مقدس روایتوں کو ڈراموں کی شکل میں ڈھالنے میں بیتاب کو بڑی مہارت تھی اور یہی ان کی امتیازی خصوصیت بھی سمجھی جاتی ہے۔

بیتاب کو ہندی پر عبور حاصل تھا۔ سنسکرت سے بھی واقفیت تھی۔ ان کے ڈراموں میں بعض جگہ ہندی گیت اور نہایت شیریں اور موثر ہیں لیکن بعض جگہ جہاں ہندی سنسکرت اور عربی فارسی ترکیبیں ملی ہوئی ہیں' وہاں ثقالت اور بے لطفی پیدا ہوگئی ہے۔

آغا حشر

آغا حشر نے شیکسپئر کے انگریزی ڈراموں کے جو ترجمے کئے' ان کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ اردو میں ان کے ڈرامے یہ ہیں: (۱) آفتاب محبت (۱۸۹۷ء)' (۲) مار آستین' (۳) خواب ہستی' (۴) خوبصورت بلا' (۵) سلور کنگ (۱۹۱۰ء)' (۶) یہودی کی لڑکی' (۷) شیر کی گرج (۱۹۲۱ء)' (۸) ہندوستان قدیم و جدید (۱۹۲۲ء)' (۹) ترکی حور (۱۹۲۳ء)' (۱۰) پہلا پیار (۱۹۲۳ء)' (۱۱) آنکھ کا نشہ (۱۹۲۳ء)' (۱۲) دل کی پیاس' (۱۳) رستم سہراب' (۱۴) عشق و فرض' (۱۵) شیریں فرہاد' (۱۶) عورت کا پیار' (۱۷) خود پرست' (۱۸) شام جوانی' (۱۹) تصویر وفا' (۲۰) نعرہ توحید' (۲۱) جرم نظر' (۲۲) میٹھی چھری' (۲۳) ٹھنڈی آگ وغیرہ۔

آغا حشر طرز قدیم کے ممتاز ڈراما نگار شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے فن ڈراما میں کئی کمالات دکھائے ہیں' اس اعتبار سے اپنے پیشروؤں اور معاصرین سب میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ حشر بجائے خود اردو ڈراما نگاری کے ایک مستقل ادارہ ہیں۔ انہوں نے اپنی کوششوں سے اردو ڈراما اور تھیٹر کو نئی زندگی بخشی۔

حشر کی ڈراما نویسی کا آغاز یوں ہوا کہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں ان کے وطن بنارس میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی' جس کے منشی احسن لکھنوی ڈراما نگار تھے۔ ان کا ڈراما چندرا وتی اس وقت اسٹیج کیا جا رہا تھا۔ حشر کا ان سے تعارف ہوا۔ احسن کو چندرا وتی پر بڑا ناز تھا۔ ایک مرتبہ حشر کے منہ سے نکل گیا: "اس سے اچھا ڈراما میں لکھ سکتا ہوں۔" احسن کو بڑا ناگوار گزرا' لیکن اسے انہوں نے حشر کے بچپنے پر محمول کیا لیکن آغا حشر نے جو کچھ کہا تھا' سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس لیے ۱۸۹۷ء میں احسن کے "چندرا وتی" کے جواب میں "آفتاب محبت" لکھا' اور بنارس کے ایک کتب فروش بسم اللہ خان کے ہاتھ دس روپے پر فروخت کر دیا۔ ڈراما چھپا' مگر کہیں اسٹیج نہیں ہوا۔

حشر اس کے بعد بمبئی چلے گئے اور کاؤس جی کھٹاؤ کی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی میں ڈراما نویس کی

حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ چونکہ ان کی تعلیم مکمل نہ ہوئی تھی۔ اس لیے نہایت محنت سے مطالعہ کی مدد سے اس خامی کو دور کرنے میں منہمک ہوگئے۔ ان کی بے مثل ذہانت، دماغی قوت اور حافظہ نے بہت جلد ان کی اس کمزوری کو دور کر دیا۔ ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء میں ان کا تعلق اردشیر دادبھائی کی کمپنی سے ہوگیا۔ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے حیدر آباد دکن میں خود اپنی تھیٹریکل کمپنی قائم کی لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ ٹوٹ گئی۔ ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی کے نام سے لاہور میں ایک اور کمپنی قائم کی۔ اس طرح وہ زندگی بھر ڈراما اور تھیٹر کی خدمت انجام دیتے رہے۔

حشر آزاد خیال، خوددار، بے تکلف، خوش طبع، صاف گو، بذلہ سنج، رنگین مزاج، بامروت اور بادہ ناب کے پرستار تھے۔ دوستوں کی خاطر مدارات میں کبھی کمی نہیں کرتے تھے۔ آغا حشر کی شباب کی رنگینیاں اور سرمستیاں آخر وقت تک قائم رہیں، اور یہی ان کی قبل از وقت موت کا باعث بھی ہوئیں۔

آغا حشر ۱۸۷۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں لاہور میں انتقال کیا۔

حشر کا دور قدیم اردو ڈراما اور اسٹیج کی شاندار ترقی کا دور تھا۔ ان کے پرزور قلم نے صرف ڈراما کی زبان و بیان کو پاک صاف نہیں کیا، بلکہ اردو ڈراما کو فنی لوازمات سے بڑی حد تک مالا مال کر دیا۔ اردو میں تمثیل نگاری کو عام معاشرتی مسائل اور زندگی کے حقائق سے آشنا کرکے ایک نئے رخ کا آغاز کیا۔ ان کا انداز تحریر واقعی طور پر قدامت کے دور میں ترقی و عروج کا انقلابی قدم تھا۔ قدیم اسٹیج ڈراموں کے سلسلے میں حشر کی ذات ایسی تھی، جس نے اس عہد کی مبتذل ڈراما نگاری کی پامال اور فرسودہ روش میں فنی ارتقا کی اعلیٰ کاریگری کے کامیاب نمونے پیش کئے۔(۱)

حواشی

۱۔ اردو ڈراما۔ تاریخ و تنقید، صفحہ ۲۴۶-۲۴۷۔

قدیم اردو ڈراموں کی بعض اہم خصوصیات

قدیم اردو ڈراموں کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں :

۱۔ **نام**:۔ ڈراما کی پہلی خصوصیت ان کے نام میں پنہاں ہے۔ ایک قسم کے نام وہ ہیں جو "لیلیٰ مجنوں"، "شیریں فرہاد"، "نل و من"، "ہیر رانجھا" وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ نام عاشق و معشوق کے ناموں کو یکجا کر کے رکھ دیے جاتے ہیں، جس سے بدیہی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں ہیرو اور ہیروئن کے عشق و محبت کی داستان بیان ہوگی۔ دوسرے جو "چلتی دنیا"، "کایا پلٹ، دو رنگی دنیا"، "حسن کا بازار" وغیرہ ترکیب پر رکھے جاتے ہیں، اور جن میں ڈراما نگار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی دورنگی، زمانے کی بے ڈھنگی یا اس قسم کے کسی مضمون کو ڈراما کا موضوع بنایا جائے۔ تیسری قسم وہ جو ذرا سنسنی خیز ہوتے ہیں۔ مثلاً "خونی قاتل"، "باپ کا گناہ"، "گناہ کی دیوار" وغیرہ۔ ان میں سماج کے جرائم پیشہ لوگوں کی عبرت ناک داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔

۲۔ **بیرونی روایات**:۔ قدیم ڈراموں کی ایک خصوصیت ان میں بیرونی اور غیر ملکی روایات کا خواہ مخواہ اور زبردستی عمل دخل ہونا ہے۔ ڈراما نگار نے خواہ اپنے ملک سے کبھی باہر قدم نہ رکھا ہو، یا تاریخ کے ذریعے بھی دوسرے ممالک کے بارے میں کماحقہ آگاہی حاصل نہ کی ہو، لیکن ڈراموں کے پلاٹ وہ ضرور غیر ملکی واقعات سے حاصل کریں گے۔ یہ طریقہ غیر فطری ہے۔ "لیلیٰ مجنوں" اور "شیریں فرہاد" وغیرہ کے پلاٹ ہندوستانی واقعات سے نہیں لئے گئے، بلکہ ایران اور عرب کی روایات سے ماخوذ ہیں۔ صرف ایران و عرب پر ہی موقوف نہیں، بلکہ مصر و روما، چین و افغانستان سے بے شمار واقعات کو بھی ڈرامائی شکل میں پیش کیا گیا۔

۳۔ **عشق و محبت**:۔ قدیم ڈراموں کا موضوع عام طور پر عشق و محبت ہوتا ہے۔ ان میں دوسری کسی چیز کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ ڈراما نگار کا نصب العین صرف عشق و محبت کی داستان بیان کرنا ہوتا ہے، اس لیے ڈراما کا سارا ماحول اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ ہیرو

ہیروئن اور عاشق و معشوق کے بغیر اور کسی شخصیت کا وجود قابل توجہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ڈراما کبھی طربیہ ہوتا ہے اور کبھی المیہ' ڈراما میں ایک آدھ رقیب بھی ہوتا ہے' جو ہیرو اور ہیروئن کے درمیان روڑے اٹکاتا ہے' لیکن اس کے کردار کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔

۴۔ یکرنگی :۔ تیسری خصوصیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام ڈراموں میں یکرنگی پائی جائے۔ جب سب کا موضوع عشق و محبت ہی ہو' اور قصے کی ترتیب کا ایک ہی طریقہ ہو تو یکرنگی کے بجائے ان میں تنوع پیدا نہیں ہوسکتا۔

۵۔ گانے:۔ ڈراموں میں ہر منظر کے شروع میں سہیلیوں کا آنا اور گانا گانا لازمی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ڈراما ناقص سمجھا جاتا ہے۔ یہ گانے عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تحت اللفظ ادا کیا جاتا ہے' جو اکثر باوقار اور صاحب وجاہت کردار اسٹیج پر آکر سناتا ہے۔ اس کا مقصد زیادہ تر شان و شوکت اور طمطراق کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے ہندی الفاظ کا استعمال کم ہوتا ہے؟ بلکہ زیادہ تر شاندار فارسی ترکیبوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے غزل کے طرز پر۔ اس کے لیے کوئی شخصیت مخصوص نہیں۔ تیسرے راگنیوں کے راگوں میں' یہ عموماً منظر کے شروع میں سہیلیاں مل کر گاتی ہیں۔

۶۔ مقفع اور مسجع عبارت :۔ قدیم ڈرامے بیشتر نظم پر مشتمل ہیں۔ ان میں کہیں کہیں نثر کے ٹکڑے بھی ہوتے ہیں' جن کی عبارت مقفع و مسجع ہوتی ہے۔ اس سے تصنع اور تکلف پیدا ہوجاتا ہے۔ اس قسم کی عبارت میں ایک عجیب عیب تو یہ ہے کہ خواہ مخواہ طول پیدا ہوجاتا ہے' ذرا سی بات کو گھما پھرا کر بیان کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے تکرار پیدا ہوتی ہے۔ ایک بات جو ابھی بیان کی گئی ہے' محض قافیہ کی رعایت سے دوبارہ بلکہ سہ بارہ کہنی پڑتی ہے۔

۷۔ پست مزاح :۔۔ اردو کے قدیم ڈراموں میں مزاح و ظرافت کا عنصر تو شامل ہے' لیکن وہ ابتذال کی حد تک گرا ہوا ہے۔ ڈراما نگار کو عوام کے مذاق کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ڈراما دیکھنے والوں میں ان ہی لوگوں کی تعداد عموماً زیادہ ہوتی تھی' جو اعلیٰ قسم کا مزاح و ظرافت پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے ان کی بدمذاقی سے ڈراما نگاروں کو بھی لامحالہ بدمذاق ہونا پڑا۔ اس طرح زوال پذیر معاشرہ میں ادب بھی زوال پذیر ہوگیا۔

۸۔ ناصحانہ انداز :۔ پرانے اردو ڈراموں میں ایک قسم کا ناصحانہ انداز بھی پایا جاتا ہے' گو کہ وہ ذرا ہلکا ہے۔ ڈراما نگار عموماً ہر ڈراما میں کوئی نہ کوئی غایت' کوئی نہ کوئی نصیحت اور کوئی نہ کوئی اخلاقی درس دینا چاہتے ہیں۔ بسا اوقات رقیب اور ہیرو کے تصادم سے یہ پہلو اجاگر کیا جاتا ہے' یا شرابی یا بدکار کی بری عادتوں کا اظہار کرکے حاضرین کے دلوں پر اس کی برائیوں کا نقش جمانا

مقصود ہوتا ہے۔

۹۔ کردار نگاری:۔ قدیم ڈراموں کے کردار کو دو گروپ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو ہیرو اور ہیروئن کے نام سے مشہور ہے' دوسرا وہ جسے رقیب کہتے ہیں۔ ڈراما نگار ہیرو اور ہیروئن کے کردار میں دنیا کی ساری خوبیوں کو بھر دیتے ہیں' اور رقیب کے کردار میں ہر قسم کی برائی کو۔ حالانکہ فطرتاً ایسا نہیں ہوتا۔ دنیا میں کوئی انسان بھی پورا فرشتہ نہیں ہے' اور نہ ہی کوئی انسان پورا شیطان۔ اچھے اور برے پہلو سب میں ہوتے ہیں' کسی میں اچھے پہلو زیادہ ہوتے ہیں' کسی میں برے پہلو۔ اس لیے کردار نگاری کو اگر فطرت سے قریب تر کرنا ہو تو ان باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے' لیکن ہمارے ڈراما نگار ان باتوں کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں' اور ہیرو اور ہیروئن کو تو تمام خوبیوں کا مجسمہ بنا دیتے ہیں اور رقیب کو برائیوں کا کامل ترین نمونہ۔

۱۰۔ زبان و بیان کی شتر گربگی:۔ پرانے زمانے کے ڈراما نگار اکثر کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اس لیے زبان و بیان میں شتر گربگی پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں نے زبان و بیان کی خوبیوں کا خیال نہیں رکھا۔ ان ڈراما نگاروں میں بہت سے ایسے ہیں' جنھوں نے ڈراما اور تھیٹر کی دنیا میں زندگی کا آغاز اداکاری سے کیا۔ بعد میں جب اس میں پختہ ہوگئے تو اپنے آپ کو ماہر فن سمجھنے لگے اور ڈراما نویسی شروع کر دی۔ ان کے ڈراموں میں اسٹیج کی ضرورتیں تو بہت حد تک پوری ہو جاتی تھیں' لیکن ادبی شان مطلق پیدا نہیں ہوتی۔ مرزا رسوا نے اس قسم کا ایک ڈراما دیکھ کر اپنے ڈراما' "مرقع لیلیٰ مجنوں" میں لکھا: "حیران تھا کہ یہ کس شہر کی بولی ہے' جو ان لوگوں کی زبان سے سنتا ہوں۔ سمجھ میں تو آتی ہے' مگر اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ ایک شفیق سے معلوم ہوا کہ یہ نظم دہلی لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ بمبئی کے مچھلی بازار کی بول چال ہے۔ میں نے دل میں کہا' شکر ہے خدا کا کہ اس مہملات کو ہماری زبان سے کوئی تعلق نہیں۔"(۱)

حواشی

۱۔ اردو میں ڈراما نگاری' صفحہ ۹۵-۱۱۴۔

عہد زوال

اردو ڈراما کی ترقی و عروج کا زمانہ جو کچھ ہے، وہ یہی ہے جو پچھلے صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے۔ یہ زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے لے کر آغا حشر کی وفات ۱۹۳۵ء تک سمجھنا چاہیے۔ اسی زمانے کو اردو ڈراما کے مورخین دور قدیم سے تعبیر کرتے ہیں، جس سے یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ اس کے بعد اردو ڈراما کا ایک ایسا دور ہے، جسے عہد زریں کہا جاسکتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اردو ڈراما کا وہ قدیم دور ہی اپنی تمامتر خامیوں اور برائیوں کے باوجود عہد زریں ہے۔ اس لیے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد جو زمانہ شروع ہوتا ہے، اس میں زندگی کی قدریں بدل گئی ہیں۔ اردو ڈراموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے وہ نگاہ اولیں باقی نہ رہی، اور ان کو دل پر پتھر رکھ کر سمجھنے کے لیے وہ مذاق نہیں رہا۔ نگاہ بدلی، مذاق بدلا، ڈراموں کا پرسان حال کون ہوتا۔ اس لیے ڈرامے کا جدید دور زوال کا دور ہے لیکن اس دور میں بھی بعض ڈراما نگار ایسے پیدا ہوئے، جن کی تخلیقات کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، ذیل میں ان ہی میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

سید امتیاز علی تاج:۔ سید امتیاز علی تاج دور جدید کے مستند ادیب، افسانہ نگار اور کامیاب ڈراما نویس ہیں۔ انہوں نے پارسی کمپنیوں کے عروج کے زمانے میں اردو میں کئی ڈرامے لکھے لیکن چونکہ وہ مروجہ روش سے ہٹ کر تھے، اس لیے تجارتی نقطہ نگاہ سے مالکان کمپنی نے ان میں بعض تبدیلیاں کرنے کی فرمائش کی۔ مصنف نے انکار کر دیا چنانچہ وہ ڈرامے اسٹیج نہ ہو سکے۔

سید امتیاز علی تاج نے ۱۹۲۲ء میں اپنا مشہور ڈراما "انار کلی" لکھا۔ یہ ڈراما ان کا شاہکار ہے، اور دور جدید کا نقش اول ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ڈراما کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ "انار کلی" فنی عروج اور دلکش ادبیت کے لحاظ سے بے مثل کارنامہ ہے۔ زبان کی خوبی، مکالموں کی چستی اور برجستگی اور ڈرامائی کیفیت لاجواب ہے، لیکن یہ بھی ان ہی وجوہ کی بنا پر اسٹیج نہ ہوسکا، جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔

حکیم احمد شجاع:- حکیم احمد شجاع ڈراما نگاری میں آغا حشر کے پیرو ہیں۔ ان کا انداز وہی ہے، جو آغا حشر کا تھا بلکہ وہ اس فن میں آغا حشر ہی کے مداح اور مقلد ہیں، اور اپنے آپ کو حشر کا شاگرد خاص تصور کرتے ہیں۔ ان کا پہلا ڈراما "باپ کا گناہ" بقول ان کے آغا حشر کی وساطت سے الفریڈ تھیٹریکل کمپنی، بمبئی نے اسٹیج کیا۔ یہ ڈراما ۱۹۲۲ء میں دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع ہوا۔ ان کا دوسرا ڈراما "بھیشم پرتگیہ" اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی نے اسٹیج کیا۔ ان کے دوسرے ڈرامے یہ ہیں: "کارواں حیات"، "رات کا گناہ"، "حسن کی قیمت"، "آخری فرعون"، "جان باز"، "بھارت کا لال"، "دلہن"۔ ان کے علاوہ تین بنگلہ ڈراموں کے ترجمے "مینا"، "سنتوش" اور "تارا" ہیں۔

حکیم احمد شجاع نہایت باذوق انسان ہیں۔ افسانہ نگاری اور ڈراما نویسی دونوں میں درک حاصل ہے۔ اداکاری سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ ۱۹۳۵ء کے بعد اسٹیج اور تھیٹر کا زوال شروع ہوا تو وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئے، اور شب و روز فلمی کہانیاں، اور مکالمے لکھتے رہے۔

شوق قدوائی:- انہوں نے اردو نظم میں مثنوی کے انداز پر دو ڈرامے لکھے۔ ایک "میکفرن دلوی" دوسرا "قاسم و زہرا" دونوں کی حیثیت ڈراما سے زیادہ مثنوی کی ہے۔ انہوں نے یہ دونوں ڈرامے میں اصلاح لانے کی غرض سے لکھے، لیکن خود اصلاح کے محتاج رہ گئے۔ ان کو ڈراما کے فن سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اصل میں ایک شاعر تھے۔ وہ صرف شاعری کی حد تک رہتے تو اچھا تھا۔ ڈراما کی قلمرو میں داخل ہونا ان کے لیے درست نہ تھا۔ ایک بات البتہ ہے ان کے ڈراموں میں فصاحت زبان اور سلاست زبان قابل داد ہے۔ مکالموں کا انداز بڑا دلکش ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی:- مولانا نے "زود پشیمان" کے نام سے اصلاحی انداز میں ایک معاشرتی ڈراما لکھا ہے، جس میں کم سنی کی شادی کے نقائص بڑی خوبی سے نمایاں کئے گئے ہیں لیکن اس کی شان یا حیثیت محض ادبی ہے۔ اسٹیج کے لوازمات کو اس میں ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ مولانا ایک بلند پایہ ادیب اور فلسفی ہیں، اور اردو ادب میں ایک خاص طرز تحریر کے مالک ہیں۔ اس لیے زبان و بیان کے لحاظ سے "زود پشیمان" بہت خوب ہے۔ مکالموں میں بڑی برجستگی پائی جاتی ہے، اگرچہ کہیں کہیں یہ مکالمے خطابت کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں، اور بیان میں طول پیدا ہو جاتا ہے۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی:- ان کے دو ڈرامے "مراری دادا" اور "راج دلاری" زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے آخر الذکر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے منظور بھی کیا جاچکا ہے۔ ان کا طرز تحریر بہت شوخ، زبان بامحاورہ اور خیالات پاک صاف ہیں۔ البتہ ان میں اتنی کمزوری ضرور ہے کہ اپنی آزاد خیالی کو اس کی منطقی حد تک نہیں پہنچا سکے۔

تبصرہ

اردو ادب کی جتنی صنفیں ہیں، سب کا تاریخی لحاظ سے ایک آغاز ہے، اس کے بعد ارتقائی منازل طے کر کے انہیں ایک زمانے میں عروج حاصل ہوا۔ پھر ان میں زوال بھی آیا، لیکن ایسا زوال کسی میں نہیں آیا، جیساکہ اردو ڈراما میں آیا۔ زوال کے بعد بھی دوسری اصناف ادب نے کسی نہ کسی دور میں نئی زندگی حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن ڈراما کی معلوم ہوتا ہے صورت حال ہی بالکل جداگانہ ہے۔ اس میں جو زوال آیا، تو پھر ابھرنے کی کوئی امید ہی نظر نہیں آتی۔ ڈراما اور اسٹیج کی جگہ آج فلم نے لے لی۔ فلم کا رواج ہی ڈراما کے زوال کا اصلی اور واحد سبب ہے۔ فلم میں موجودہ دنیا کے لوگوں کے تمام تفریحی تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سب اس طرف جھک گئے۔ اسٹیج جو پرانے زمانے کی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی قدردانی اب دل و جان سے کوئی نہیں کرنا چاہتا۔ ڈراما کے ناقدین اس صنف ادب کے زوال کے کئی دوسرے اسباب بھی بتاتے ہیں، لیکن ہمارے خیال میں پردہ سیمیں کے علاوہ اور کوئی بات ایسی نہیں، جس کو ڈراما کے زوال کا حقیقی سبب بتایا جا سکے۔ ڈراما کے مستقبل کے بارے میں بھی بعض خوش آئند باتیں کرتے ہیں، لیکن یہ بھی شاید ان کی خوش فہمی کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو ڈراما کا کبھی ادب سے گہرا تعلق نہیں رہا جو کچھ لکھا گیا، اسٹیج کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا۔ اسٹیج نہیں رہا تو ڈراما بھی نہیں رہا۔

افسانہ

تمہید:

اردو میں قصہ کہانی کی صنفوں میں پہلے داستان وجود میں آئی۔ اس کے بعد انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ناول نویسی کا رواج ہوا' لیکن افسانہ نگاری کی ابتدا سب سے بعد بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے' افسانہ ناول ہی کی مختصر شکل ہے' اور اسی کے خمیر سے اس کا وجود ہے' لیکن سید وقار عظیم کی رائے میں یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ اس میں کوئی صداقت نہیں' اس لئے افسانہ کی ابتدا ناول سے نہیں' بلکہ ایسی بہت سی ملی جلی مختصر چیزوں سے ہوئی' جو صدیوں پہلے انگریزی اور فرانسیسی میں رائج تھیں۔ ان میں اور افسانہ میں بعض حیثیتوں سے مماثلت ہے۔(۱) سید وقار عظیم نے افسانوی ادب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جو کچھ لکھا' ان کی عمر بھر کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ہمیں بھی ان سے اتفاق کرنا چاہیے' لیکن ہم صرف اتنا کہیں گے کہ جہاں افسانہ کی بنیاد ان چیزوں پر ہے' جو صدیوں پہلے یورپ میں رائج تھیں' وہاں اس نے ناول سے بھی بہت سی چیزیں اخذ کی ہیں' ورنہ افسانے کا آغاز ہم جس ترقی یافتہ شکل میں دیکھتے ہیں' وہ ناممکن تھا۔ دوسری اصناف ادب کی طرح اس کے بھی ایام طفولیت ہوتے' اور اس کا بھی تدریجی ارتقا ہوتا لیکن کہاں! وہ روز اول ہی میں جواں بن کر میدان میں آ نکلا۔ اردو افسانہ کی تاریخ میں منشی پریم چند اولین افسانہ نگار ہیں' ویسے ایک کامیاب ناول نگار بھی ہیں۔ انہوں نے ناول پہلے لکھا' افسانہ بعد میں۔ ناول اور افسانہ میں مماثلت نہ ہوئی' اور افسانے کو ناول سے مدد نہ ملتی' تو پریم چند شاید بہترین افسانہ نگار نہ بنتے' بلکہ ان کے افسانے اس صنف کے ابتدائی نقوش ہوتے۔ سید وقار عظیم نے اپنی رائے کے ثبوت میں لکھا ہے کہ "دنیا کے بہت سے اچھے اچھے ناول نگار کامیاب افسانہ نگار نہیں بن سکے۔"(۲) دنیا کے اچھے اچھے ناول نگاروں کا تو ہمیں پتا نہیں' البتہ اردو کے ناول نگاروں کے بارے میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اوپر ہم نے پریم چند کی مثال پیش کی ہے۔ ان کے علاوہ بھی

بہت سے ادیب ایسے ہیں، جو ناول اور افسانے دونوں لکھتے ہیں، اور بعض دونوں میں کامیاب بھی ہیں۔

"اردو افسانہ ایک ایسی مختصر فکری داستان ہے، جس میں کسی ایک خاص واقعہ، کسی ایک خاص کردار پر روشنی ڈالی گئی ہو، اس میں پلاٹ ہو، لیکن اس پلاٹ کے واقعات کی تفصیلیں اس طرح گتھی ہوئی ہوں، اور اس کا بیان اس قدر منظم ہو کہ وہ ایک متحد اثر پیدا کر سکے۔ اس کے اختصار کا معیار یہ ہے کہ اس کے پڑھنے میں ہمیں آدھ گھنٹے تک کا وقت لگے۔(۳)

"اردو افسانہ نویسی کا سنگ بنیاد تو حقیقت میں اسی دن سے پڑ گیا تھا، جب سے آزاد کی "نیرنگ خیال" منظر عام پر آئی جس میں ایک ایسی نئی طرز نگارش کی طرح ڈالی گئی، جو حقیقت میں افسانوی ادب کی ایک شاعرانہ شکل تھی۔"(۴) لیکن باقاعدہ افسانہ نگاری پریم چند سے شروع ہوئی۔ پریم چند کے ساتھ ساتھ سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر یلدرم نے بھی افسانہ نگاری کے فن میں اپنے جوہر دکھائے۔ اردو کے بالکل ابتدائی افسانہ نگار یہی تین بزرگ ہیں۔(۵)

حواشی

۱۔ فن افسانہ نگاری صفحہ ۱۳-۱۴۔

۲۔ فن افسانہ نگاری، صفحہ ۱۶۔

۳۔ فن افسانہ نگاری، صفحہ ۱۵۔

۴۔ ہمارے افسانے، صفحہ، ۱۷-۱۸۔

۵۔ فن افسانہ نگاری، صفحہ ۱۶۔

پریم چند

پریم چند نے اردو میں ناول بھی لکھے' اور افسانے بھی' اور دونوں اصناف ادب میں وہ ایک کامیاب فنکار ثابت ہوئے لیکن ناول کی بہ نسبت انہوں نے افسانے زیادہ لکھے۔ ان کا قلم اسی میدان میں زیادہ چلتا رہا۔ بقول سید وقار عظیم : (۱) ہمارے ذہن میں مختصر افسانہ کا جو جدید تصور ہے' وہ سب سے پہلے پریم چند نے دیا ہے' اور جن جن مختلف چیزوں سے افسانہ' افسانہ بنتا ہے' وہ سب ایک ایک کر کے پریم چند ہی نے سکھائی ہیں۔ انہوں نے غالباً ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء میں افسانہ لکھنا شروع کیا اور تیس بتیس سال تک' جب تک وہ زندہ رہے' مسلسل لکھتے رہے۔ اس دوران میں افسانہ ترقی کے ان سارے مراحل سے گزرتا دکھائی دیتا ہے' جنہیں اس کی فنی زندگی کا موڑ اور سنگ میل کہنا چاہئے۔ پریم چند کا افسانہ افسانہ نگاری کی روایت کی مکمل تاریخ ہے۔(۲)

پریم چند نے اردو میں کثرت سے افسانے لکھے۔ ان میں ایک خاص تعداد ایسے افسانوں کی ہے جو ان کے مشاہدہ کی باریک بینی' احساس اور جذبہ کی نزاکت اور فن کی دلکشی کی بنا پر اردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ **قومیت :۔** پریم چند قومیت کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی ہر اس چیز کو پرستارانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں' جو اسے دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے دل میں ہر اس چیز کی قدر ہے' جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے۔ ان کی آنکھوں میں ہر اس خیال سے خوشی' عظمت اور احترام کی جھلک پیدا ہوتی ہے' جس میں روحانی بلندی شامل ہو۔ پریم چند برصغیر کی بہادر قوم راجپوتوں کی روحانی قوتوں' ان کی بہادری' جان بازی' وطن پرستی اور ایثار کے جذبات کا بڑے سچے دل سے احترام کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے بہت سے افسانوں کے پلاٹ راجپوتوں کی زندگی سے متعلق ہیں۔ کہیں کسی راجپوت عورت کی بہادری' ایثار اور قربانی دکھائی گئی ہے' کہیں وطن پرستی' محبت اور احسان کے دلفریب مرقعے پیش کئے گئے ہیں' کہیں آن اور عزت کے احترام کے لیے جان بازی کا سبق سکھانے کے لیے کسی راجپوت کا سچا قصہ بیان کیا

گیا ہے۔ "وکرماوت" "رانی سارندھا" "راجہ ہردول" "گناہ کا اگن کنڈ" میں پریم چند نے اسی جذبہ قومیت کی عکاسی کی ہے۔(۳)

۳۔ **مقامی رنگ کی آمیزش :۔** پریم چند کے افسانوں میں برصغیر کی عام زندگی کی رنگ آمیزی بہت گہری ہے۔ دیہاتی زندگی کی عکاسی ان کے ہاں سب سے زیادہ ہے۔ اس زندگی کے واقعات پریم چند نے اس قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔

دیہاتی کن کن روحانی تکلیفوں کے شکار رہتے ہیں' کس طرح زمیندار' مہاجن' پولیس' پٹواری اور تحصیل والے ان کی زندگیوں کو دکھ درد اور پریشانیوں میں مبتلا کرتے ہیں' اور کیسے کیسے وہ ان ساری مصیبتوں کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتے ہیں' ان سب کے حالات و کیفیات کا بیان بڑے درد انگیز لے میں پریم چند کے افسانوں میں ملتا ہے۔

۴۔ **فطرت انسانی کا مطالعہ :۔** انسانی فطرت یا نفسیات کا مطالعہ پریم چند کا بہت گہرا ہے' جس کی بنا پر ان کے افسانوں میں ایک آفاقی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ انسانی فطرت دنیا کے تمام ممالک میں قریب قریب ایک ہی قسم کی ہے۔ ایک ہی نوع کے واقعات سے ہر ملک میں یکساں طور پر لوگ تعجب' حیرت و استعجاب' رنج' خوشی' غصہ' حسد' نفرت' رشک' رقابت جیسے فطری جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ سے پر ہیں۔ فطرت انسانی پر غور و فکر سے انہوں نے اس قدر کام لیا کہ وہ ان کے طرز بیاں کی ایک خاص خصوصیت بن گئی ہے۔ اسی بنا پر ان کے ہاں حقیقت شعاری کی ایسی بہترین مثالیں پیدا ہوگئیں ہیں' جن میں ہر جگہ عالمگیر حقائق اور عام فطرت انسانی کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔

۴۔ **مثالیت پسندی :۔** پریم چند کے افسانوں کے کردار عموماً مثالی ہوتے ہیں' جن کے اعمال کو کوئی اپنے لیے بہترین نمونہ بنا سکتا ہے' اور ان کی فطرت سے سبق لے کر اپنے آپ میں ایک خاص حسن پیدا کرسکتا ہے۔ اس قسم کے کرداروں میں رانی سارندھا بے حد نمایاں ہے۔ لیکن ان کے افسانوں کے کردار خواہ مثالی ہوں' خواہ حقیقی' ان میں سے ہر ایک کے لیے کرداری ارتقا کا ہونا ضروری ہے۔ پریم چند ان کرداروں کو عموماً افسانے کے شروع میں پیش کر کے ان کی خصوصیات بنا دیتے ہیں' پھر ان خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے یا انہیں حقیقت کا لباس پہنانے کے لیے خود کردار کی زندگی کے ایسے واقعات پیش کرتے ہیں' جن سے وہ خصوصیات زیادہ واضح اور روشن ہیں' اور حقیقی معلوم ہوں۔ "بڑے گھر کی بیٹی" "گناہ کا اگن کنڈ" اور "نمک کا داروغہ" ان کی کردار نگاری کے اچھے نمونے ہیں۔

۵۔ **تفصیل :۔** افسانوں میں تفصیلات بری سمجھی جاتی ہیں۔ اس لیے ان کے بجائے تخیل

آفرینی سے زیادہ کام لیا جاتا ہے' لیکن پریم چند کے افسانوں کا خاص حسن ان کی تفصیلات میں ہے۔ ان کی یہ تفصیلات ایک لحاظ سے تخیل آفرینی کی کمی کو پورا کرتی ہیں۔

۶۔ **طرز بیان کی شگفتگی :۔** پریم چند کے افسانوں کی ایک خاص خصوصیت طرز بیان کی شگفتگی ہے۔ وہ ہر چیز کو نہایت آسان' سادہ اور پر لطف زبان میں بیان کرتے ہیں۔ پڑھنے والا جہاں ایک طرف افسانے کا لطف اٹھاتا ہے' وہاں طرز بیان کی شگفتگی سے بھی محظوظ ہوتا ہے۔ ہندی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا شیریں امتزاج' تشبیہات و استعارات کا مناسب استعمال اور انسانی نفسیات کا فنکارانہ تجزیہ' یہ باتیں ایسی ہیں کہ ان کے افسانوں کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہیں۔(۱)

حواشی

۱۔ ہمارے افسانے' صفحہ ۸۹۔۹۹۔

سلطان حیدر جوش

سلطان حیدر جوش نے پریم چند کے تقریباً ساتھ ہی اردو میں افسانہ لکھنا شروع کیا تھا لیکن طبیعت اور مزاج کے فرق نے دونوں کو الگ الگ راہ پر ڈال دیا۔ پریم چند نے برصغیر کی دیہاتی زندگی کی عکاسی کرنا اور اس کے روشن و تاریک ہر پہلو پر روشنی ڈالنا اپنا فرض سمجھا' اور سلطان حیدر جوش نے مغرب کی کورانہ تقلید کے خلاف آواز اٹھانا اپنا دین اور ایمان تصور کیا۔ جوش کے افسانے خالص معاشرتی اور اصلاحی ہیں۔ پریم چند کے افسانے بھی اصلاحی اغراض و مقاصد کے حامل ہیں' لیکن ان کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے۔ ان کو مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات میں برصغیر کی تاریخ' تہذیب' روایات اور معاشرتی و اخلاقی قدروں کا جو زیاں نظر آتا ہے' اسے وہ مختلف سطحوں پر بے نقاب کرتے ہیں' اور بیک وقت سیاست دان' مدبر' مصلح اور مبلغ سب کے منصب ادا کرتے ہیں لیکن ان کی بہ نسبت جوش اپنے اصلاحی مقاصد کو صرف سماجی زندگی کے لیے محدود رکھتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے لوگوں کو صرف یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مشرق اور مغرب کے طرز معاشرت میں جو بین فرق ہے' اس بنا پر مشرقیت مغربیت میں یا مغربیت مشرقیت میں کبھی مدغم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے مشرق کے رہنے والے مغربی طرز معاشرت اختیار کرنے کی کوشش کریں تو اس کے برے اثرات فرد اور جماعت دونوں پر یکساں طور پر مرتب ہوں گے۔ "جوش کے جو افسانے "فسانہ جوش"" کے نام سے شائع ہوئے' ان سب کا انداز خالص اصلاحی' بلکہ کہیں کہیں تبلیغی ہے' اور پڑھنے والا یہ سمجھنے کے باوجود کہ افسانہ نگار نے جو کچھ اپنے افسانے میں کہا ہے' اس کے پیچھے ایک بلند قومی مقصد اور ایک واضح تہذیبی و اخلاقی نصب العین موجود ہے' اس کے حد درجہ مصلحانہ' واعظانہ' بلکہ مبلغانہ انداز سے ایک الجھن سی محسوس کرتا ہے۔"(۲)

سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں طنز و مزاح کی ہلکی سی چاشنی پائی جاتی ہے' جو ان کے تبلیغی مقاصد کی خشکی کو دور کرتی ہے۔ ان کا یہ طرز بیان ان کے افسانوں کے دوسرے مجموعے

جس میں "ہاں نہیں" "خواب و خیال" اور "عالم ارواح" شامل ہیں، زیادہ نمایاں ہے۔ ان افسانوں میں زندگی اور فن کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے، اور افسانے کے مستقبل کو خوش آئند بناتا ہے۔ جوش کی تحریروں میں زبان کا لطف، بیان کا زور، روزمروں اور محاوروں کا چٹخارہ اور استہزا کی لطیف چاشنی بے حد مزہ دیتی ہے۔ ان کے طرز بیان کی یہ دلکشی تقریباً ان کے سارے افسانوں میں پائی جاتی ہے۔

حواشی

۱۔ داستان سے افسانے تک، صفحہ ۱۷۹۔

سجاد حیدر یلدرم

اردو میں افسانوی ادب کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا' اور دو چار آدمی افسانے لکھ رہے تھے' اس لیے اس کا سرمایہ اتنا وافر نہ ہوا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم نے اپنے ترجموں کے ذریعے ان کو مالا مال کرنا شروع کیا۔ انہوں نے ترکی اور فارسی زبانوں سے اچھے اچھے افسانوں کے اردو میں ترجمے کر کے افسانوی ادب کو رومانویت اور شاعرانہ لطافتوں اور خوبیوں سے روشناس کرایا۔ ان کے ترجمے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا' بلکہ اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم نے طبعزاد افسانے بھی لکھے' جن میں ان کا نقطہ نگاہ خالص فنی ہے۔ انہوں نے اردو ادب میں ایک سچے فن کار کی حیثیت سے یہ نعرہ بلند کیا کہ ادب اور ادیب کو زندگی کے ان جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے' جن میں پھنس کر ادیب کو مصلح و مبلغ اور ادب کو پندو موعظت کا آلہ کار بننا پڑتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادب اور زندگی کا رشتہ بڑا استوار اور پائیدار ہے' لیکن زندگی کے تمام پہلو ایسے نہیں ہیں کہ انہیں ادب کا موضوع بنایا جا سکے۔ زندگی میں عشق و محبت کا نغمہ ہی اصل میں وہ نغمہ ہے' جو ادب میں گونجنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔(۱)

سجاد حیدر یلدرم کے طبع زاد افسانوں کا پہلا مجموعہ "خیالستان" خالص فنی نقطۂ نگاہ کا علمبردار ہے۔ اس کے افسانے "خارستان و گلستان"' "سودائے سنگین" "حکایت لیلیٰ مجنوں" اور "چڑیا چڑے کی کہانی" فن کے احساس و اظہار کی عمدہ مثالیں ہیں۔ خیال کی رعنائی' بیان کی رنگینی' تشبیہوں' استعاروں اور ترکیبوں کی ندرت' مختلف اجزاء میں حسن ترتیب' آغاز و انجام کا تیکھا پن ایسی مشترک خصوصیتیں ہیں' جو ان افسانوں میں کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ ان فنی خوبیوں پر زیادہ توجہ دینے کے ساتھ ساتھ سجاد حیدر یلدرم نے زندگی کی عکاسی کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں ایسے جذبات و احساسات کی عکاسی پائی جاتی ہے' جن سے پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان افسانوں کا مجموعی اثر پڑھنے کے بعد بھی دلوں پر قائم

رہتا ہے۔ ان کے افسانے "میرے آستانے والے"، "جہاں پھول کھلتے تھے"، "ایک مغنیہ سے التجا"، "میں چاہتا ہوں"، "کلوپیٹرا"، "قاہرہ کو دیکھ کر"، "میرے بعد"، ویران صنم خانے" میں اس قسم کے جذبات و احساسات کی عکاسی شاعرانہ انداز میں بڑی شدت کے ساتھ کی گئی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں نفسیات کو بھی کافی دخل ہے۔ وہ نفسیات کو پورے افسانے پر طاری رکھتے ہیں۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے الگ نہیں ہوتے۔ ان کا نفسیاتی نقطہ نظر افسانے کے ہر حصے میں یکساں طور پر نمایاں رہتا ہے۔(۲)

پریم چند، سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر یلدرم شروع کے پختہ افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے افسانے میں زندگی اور فن کے ایک لطیف امتزاج کی جو طرح ڈالی تھی، وہ بعد کے افسانہ نگاروں کے لیے بطور شمع راہ کے کام آئی۔ بعد کے لکھنے والوں نے ان کے نقش قدم پر چل کر افسانے کو اردو ادب کی ایک باوقار صنف بنا دیا۔ اردو افسانے کی عمر کوئی زیادہ طویل نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اس قلیل عرصے میں اس کا اس قدر ترقی کر جانا ہمارے لکھنے والوں کا اعجاز ہے لیکن اس سلسلے میں پریم چند، سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر یلدرم کی خدمات ہی سب سے زیادہ قابل قدر ہیں۔

پریم چند اور ان کے دو ساتھیوں کے بعد افسانہ نگاروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوگیا۔ سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ ذیل میں صرف چند نمائندہ افسانہ نویسوں اور ان کی خدمات کا مختصر طور پر جائزہ لیا جاتا ہے۔

حواشی

۱۔ داستان سے افسانے تک، صفحہ ۱۸۱۔

۲۔ ہمارے افسانے، صفحہ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔

سدرشن

مہاشے سدرشن جذبات نگار افسانہ نویس کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ وہ شاعری کی طرح افسانے میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں انسانی جذبات کی بڑی کامیابی کے ساتھ مصوری کر سکتے ہیں۔ "جس کا دل کڑھا رہا ہو، جس کی آنکھیں اشک باری کر رہی ہوں، جس کا دماغ پریشان ہو، اس کے لبوں پر مسکراہٹ ایسی خوفناک معلوم ہوتی ہے، جیسی "شمشان میں چاندی"" "ششو پال نے آگ میں پڑے ہوئے پتے کی طرح گرم ہو کر جواب دیا"" اس کی آنکھیں اس طرح کھلی ہوئی تھیں گویا روح کی تمام تر قوتیں آنکھوں میں جمع ہو کر کسی بات کا انتظار کر رہی ہیں"" "انسانی دل ایک اتھاہ ساگر ہے، جہاں کنول کے پھولوں کے ساتھ ساتھ خونیں جونکیں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں، "ایمان مجھے ہوا سے ہلکا اور پانی سے پتلا معلوم ہونے لگا" یہ سب ایسے جملے اور فقرے ہیں، جو سدرشن کے افسانوں کو شاعری کا حسن و لطافت بخشتے ہیں۔

سدرشن کے افسانوں میں اکثر شہر کے رہنے والوں، پڑھنے لکھے ملازم پیشہ لوگوں اور معمولی حیثیت کے تاجروں کی زندگی کے مرقعے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان پر مقامی رنگ بہت گہرا ہوتا ہے۔ ان کے افسانے "شاعر"" "اپنی طرف دیکھ کر"" "خانہ داری کا سبق"" "ترک نمود"" "صدائے جگر خراش"" "تبدیلی قسمت"" "دو دوست" اور "فریب دولت" اس قسم کی زندگیوں کے آئینہ دار ہیں۔ سدرشن نے ان افسانوں میں برابر افسانوی وفا شعاری کا ثبوت دیا ہے، اور اسی زندگی کی مصوری کی ہے، جس سے وہ خود اچھی طرح واقف ہیں۔(۱) سدرشن نے پریم چند سے متاثر ہو کر دیہاتی زندگی کے معاشرتی پہلو کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے، لیکن اس میں پریم چند کی طرح کامیاب نہیں ہیں۔

سدرشن کے ہاں انسانی نفسیات کا تجزیہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اگرچہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے پورے افسانے کی بنیاد کسی نفسیاتی نقطہ نظر پر رکھی بلکہ یہ کیا کہ افسانہ بیان کرتے کرتے واقعات کے بیچ میں ایک تیسرے شخص کی حیثیت سے کوئی نفسیاتی تنقید کر دی، ان کی

نفسیاتی تنقید بھی دوسرے افسانہ نگاروں سے کسی قدر مختلف ہے- ان کی نگاہ میں دنیا بہت غرض پرست' بے وفا' اور سفلی ہے' جہاں انسان حرص و ہوا کے پرزور تھپیڑوں سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا- اس لیے وہ حیات انسانی میں حسن اخلاق پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں- دنیا کے بارے میں اپنے مندرجہ بالا نظریہ کی بنا پر وہ افسانوں میں مختلف پیرایوں میں دولت و ثروت اور جاہ و حشمت سے نفرت اور غربت و قناعت سے محبت کرنے کی ترغیب دیتے ہیں- ان کا خیال ہے' جو لوگ دولت اور ثروت اور جاہ و حشمت پر جان دیتے ہیں' ان کے پیچھے اندھے بن کر دوڑتے ہیں' وہ کبھی حقیقی خوشی' دائمی سرور اور ابدی روحانی سکون حاصل نہیں کرسکتے-(۲)

سندرشن کا طرز تحریر بے حد پیارا ہے- جذبات نگاری کے رجحان نے ان کے بیان میں اور اثر پیدا کر دیا ہے- تشبیہات و استعارات میں بڑی پاکیزگی ہے- چونکہ وہ ہندی سے بھی واقف ہیں' اس لیے ان کے اردو افسانوں میں ہندی طرز تحریر کی بھی جھلک ہے-

حواشی

۱- ہمارے افسانے' صفحہ ۱۰۲-

۲- ہمارے افسانے' صفحہ ۱۰۴-

نیاز فتح پوری

اردو افسانے میں نیاز فتح پوری "رومان پسند" کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کو رومان سے اس قدر لگاؤ ہے کہ افسانے میں کسی مخصوص سماج یا معاشرہ کا مرقع کھینچنا اور اس میں مقامی رنگ یا کسی مقصد کو شامل کرنا ہرگز انہیں گوارا نہیں۔ وہ رومان کی آغوش میں سکون تلاش کرتے ہیں۔ وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ افسانے کی نزاکت اور حسن کو کسی شاعرانہ بات سے نقصان پہنچے۔ ان کے خیال میں افسانے میں حسن و عشق کی داستانوں کے علاوہ اور کسی شے کا دخل نہ ہونا چاہئے۔ محبت اور عورت افسانے کا سب سے زیادہ دلکش اور دل فریب موضوع ہے۔

(۱) نیاز کے افسانوں میں کوئی معاشرتی یا اصلاحی مقصد نہیں ہوتا۔ وہ افسانے کی نزاکت پر اس قسم کے مقاصد کا بوجھ ڈالنا فن کے منافی سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ افسانوں میں مرد اور عورت کی محبت کے ایسے مظاہر پیش کرتے ہیں، جن پر معاشرے کی قیود و پابندیوں کا عکس نہیں ہوتا۔ وہ محبت کو صرف محبت کی خاطر عزیز رکھتے ہیں، اور اسے فن کی خاطر افسانے کا اہم جزو بناتے ہیں۔ انہوں نے محبت کو زندگی کے جال میں پھنسانے کی بجائے اس سے محض تخیل کی دنیا آباد کی ہے، اور اس تخیل کی مدد سے انہوں نے افسانوں میں بے حد رنگینی اور نشاط انگیز دنیا کی تصویریں پیش کی ہیں، لیکن ایسے فن کار کی طرح جو تخیل کی دنیا بسا کر بھی فن کی حدود سے باہر نہیں نکلتا۔ ان کے افسانے "زائر محبت"، "حمرا کا گلاب" اور "کیوپڈ اور سائکی" حسن تخیل اور رنگینی فن کی دلکش مثالیں ہیں۔(۲)

رومانیت پسندی کی وجہ سے نیاز اپنے افسانے کا موضوع ایسے واقعات کو بناتے ہیں، جو کلاسیکی حیثیت سے ایک رومانی درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ ان واقعات میں ان کی فطری شعریت اور بلند شاعرانہ صلاحیت کی بنا پر نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں، اور ہر جگہ ایک نیا لطف پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ افسانے کا پلاٹ محض تخیل کے زور سے بھی پیدا کرتے ہیں اور اس میں رومانی عناصر شامل کر کے اپنا رنگ ملا لیتے ہیں۔ اس تخیل میں وہ ہمیشہ افسانوی دلکشی اور رومانی

فریب کا خیال رکھتے ہیں۔(۳)

نیاز کے رومانی افسانوں میں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ عورت کی دلکشی سے ان کے ہر قصبے میں رومان اور کیف پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے خیال میں عورت محبت کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ مرد اور عورت میں محبت فطری ہے۔ اس لیے یہ چیز انسان میں پرستش کی حد تک موجود ہونی چاہئے۔ کوئی دل ایسا نہیں ہے، جو جبلی طور پر محبت کے جذبات لے کر نہ آیا ہو۔ اس لیے انسان خود بخود عورت سے محبت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ نیاز جو کچھ لکھتے ہیں، ایک ہی رنگ میں ڈوب کر لکھتے ہیں، اس لیے کہ ان کے افسانوں میں واحد تاثر پایا جاتا ہے۔ ان کے بعد کے افسانوں میں البتہ رومانیت اور کلاسیکیت کی بہ نسبت حقیقت اور نفسیات کا زیادہ مظاہرہ ہوا ہے۔ ان میں نفسیات کے گہرے نقوش اور تصورات کے علاوہ کردار کا ارتقا، جذبات و تحریکات کی جنگ، خیالات و احساسات کے فطری نمونے زیادہ نظر آتے ہیں۔ تاہم ان کے افسانوں کی دلچسپی اور دلکشی میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔

حواشی

۱۔ ہمارے افسانے، صفحہ ۱۰۶۔

۲۔ داستان سے افسانے تک، صفحہ ۱۸۸۔

۳۔ ہمارے افسانے، صفحہ ۱۰۷۔

مجنوں گورکھپوری

مجنوں گورکھپوری کا انداز اپنے ہم عصروں سے ذرا جداگانہ ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع بھی محبت ہے' لیکن اس میں ان کا نقطہ نگاہ نہ تو سجاد حیدر یلدرم جیسا ہے' نہ نیاز کی طرح کا۔ ان کے نزدیک محبت کی اہمیت محض اس لیے نہیں کہ وہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے' اور نہ وہ رومان کو صرف رومان کی خاطر عزیز رکھتے ہیں۔ وہ محبت کو ایک فلسفیانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ زندگی کے حقائق کا مشاہدہ کر کے انسان کی بے بسی اور اس کے درد و غم کی فلسفیانہ تاویل پیش کرتے ہیں۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کے افسانوں پر ایک قسم کی قنوطیت چھائی ہوئی ہے۔ "انھوں نے عورت اور مرد کی محبت کے ایسے افسانے لکھے ہیں' جن میں مردوں اور عورتوں نے مذہب' ملت اور طبقاتی اونچ نیچ کے فرق اور اختلاف یا سماجی رشتوں کی نزاکت کی پروا کئے بغیر محبت کا رشتہ جوڑا ہے' لیکن سماج کے قانون ہمیشہ ان کی راہوں میں حائل ہوئے ہیں' اور ان کی محبت کو حزن و غم یا مرگ بے بسی پر ختم کیا ہے۔(۱)

مجنوں کے فلسفیانہ نقطہ نگاہ کی وجہ سے ان کے افسانوں کے کردار عموماً پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو ادب اور فلسفہ سے دلچسپی ہے' اور ہر ایک شاعری اور فنون لطیفہ کا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے محبت کے بیان میں فلسفیانہ اور شاعرانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔(۲)

مجنوں کے افسانوں میں بڑی لطافت اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ ہمیشہ دلچسپ ہوتے ہیں' اور پڑھنے والا ایک لمحہ کے لیے بھی ان میں دلچسپی کی کمی محسوس نہیں کرتا۔ کہیں کہیں جب فلسفیانہ خیالات کا اظہار' ان کے قائم کئے ہوئے نظریوں کا بیان کرداروں کے مکالموں میں ہونے لگتا ہے' تو البتہ ذرا خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان مخصوص مکالموں سے قطع نظر ان کے افسانے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لیے وہ اپنے افسانوں کا آغاز کسی کردار کی زبانی کرواتے ہیں' جس میں آپ بیتی کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔

مجنوں کے افسانوں پر، جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، قنوطیت چھائی ہوئی ہے، ان کا ہر افسانہ حزن و الم کی ایک داستان ہے، جس میں کسی نہ کسی کشتۂ محبت کی المناک کہانی دھرائی گئی ہے۔ وہ افسانے کی ابتدا بالکل شروع سے نہیں کرتے، بلکہ پہلے واقعات بیان کرنے لگتے ہیں۔ اس لیے افسانے کے انجام کے متعلق شروع سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔

مجنوں کے افسانوں میں ادبی شان ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ ان کے کردار چونکہ عموماً شاعر، فلسفی اور پڑھے لکھے ہوتے ہیں اس لیے ان کی زبان سے مکالموں کی شکل میں جو کچھ نکلتا ہے، اس میں ادبیت اور شعریت ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں "خواب و خیال"، "شکست بے صدا"، "سمن پوش"، "تم میرے ہو" اور "من درچہ خیالم و فلک در چہ خیال" بہت اچھے ہیں۔(۳)

حواشی

۱۔ داستان سے افسانے تک، صفحہ ۱۸۸۔

۲۔ ہمارے افسانے، صفحہ ۱۱۹۔

۳۔ ہمارے افسانے، صفحہ ۱۲۰-۱۲۱۔

علی عباس حسینی

علی عباس حسینی کا بھی دلچسپ موضوع پریم چند کی طرح دیہاتی زندگی ہے لیکن ان میں اور پریم چند میں بہت فرق ہے۔ پریم چند دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں' دیہات میں رہنے والوں کی زندگی کی اہم مشکلات اور دشواریوں کو بیان کرتے ہیں۔ حسینی کو دیہاتیوں کی مادی زندگی' یا جسمانی تکالیف کے نمایاں کرنے سے کوئی واسطہ نہیں' بلکہ وہ ان کے اندرونی جذبات کی' جو ہر انسان کے دل میں موجود ہیں۔ عکاسی کرتے ہیں' تاکہ دوسروں میں درد اور تڑپ پیدا ہو۔ حسینی کے پہلو میں ایک نہایت دردمند دل موجود ہے' جس کے ذریعے وہ "دیہات کی زندگی میں درد و غم کے ان گنت مرقعے تلاش کر لیتے ہیں' اور ان میں اپنے دل کی تڑپ' کسک اور درد و غم کی تاثیر شامل کر کے دوسروں کو بھی اپنا شریک غم اور ہمدرد بنا لیتے ہیں۔ اس قسم کے درد اور کسک پیدا کرنے کی شعوری کوشش سے ان کے افسانوں پر عموماً حزن و الم کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں میں درد و غم پیدا کرنے کے لیے انسانی بے بسی کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو رونا آجائے۔ حسینی کبھی کبھی افسانہ لکھتے وقت شاعرانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں' جس سے اس کی دلکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

حسینی کے افسانوں کے پلاٹ عموماً سادہ ہوتے ہیں' اور ان میں صرف ایک واقعہ یا نفسیاتی پہلو پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ نفسیات کا عمل ان کے افسانوں کے ان حصوں پر زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے' جہاں کوئی جذبہ اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ جاتا ہے' اور انسان کے دل پر زیادہ سے زیادہ اثر کرتا ہے۔

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے' حسینی کے افسانوں میں کردار شروع سے آخر تک ارتقا کی ساری منزلیں طے کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے خیالات اور جذبات کو یا تو مکالموں کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں' یا خود اس گفتگو سے جو کردار منتہا میں پہنچ کر اپنے آپ سے کرتے ہیں۔

علی عباس حسینی کے افسانوں میں فنی خوبیوں کے علاوہ زبان و بیان کی دلکشی بھی پائی جاتی ہے۔ "رفیق تنہائی" "بھو کی ہنسی" "سکھی" اور "بوڑھا اور بالا" ان کے اچھے افسانوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔(۱)

حواشی

۱۔ ہمارے افسانے' ۱۲۲۔۱۲۷۔

عظیم بیگ چغتائی

عظیم بیگ چغتائی ایسے افسانہ نگار ہیں' جنہوں نے اپنے بے شمار افسانوں میں زندگی کے ہر پہلو کو ظرافت کے دلکش اور شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اردو کے افسانوی ادب میں سرشار اور منشی سجاد حسین کے بعد کوئی لکھنے والا ایسا نہیں ملتا' جس نے اپنی تحریر میں طنز و مزاح اور ظرافت سے زیادہ کام لیا ہو۔ عظیم بیگ چغتائی نے اس خلا کو پورا کیا۔ انہوں نے زندگی کو اس کی ساری گہما گہمی میں ڈوب کر اور اس کے ہنگاموں میں شریک ہو کر دیکھا ہے۔ ان کی باریک بین نظر کے لیے ان کے گرد و پیش میں ایسے واقعات کی کمی نہیں ہے۔" جنہیں یہ واقعات آئے دن پیش آتے ہیں۔ انہیں ان کرداروں کی بے بسی اور بے چارگی پر کسی غم کا افسوس ہونے کے بجائے ایک لطف محسوس ہوتا ہے۔(۱)

عظیم بیگ چغتائی کے افسانوں میں بظاہر کوئی اصلاحی مقصد نہیں ہوتا' لیکن حقیقت میں ان کے ہر واقعہ اور کردار کے پیچھے کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد ضرور چھپا ہوتا ہے۔ وہ رنج و غم کا ذکر کر کے دوسروں کو رلا کر' یا واعظ اور ناصح کی طرح پڑھنے والوں کو اپنی خطابت کے جوش سے متاثر کر کے اس اصلاحی مقصد کو پورا کرنا نہیں چاہتے' بلکہ اس کے لیے وہ اپنا زیادہ دلکش بھرپور تاثیر ظرافت کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کے بیان کا سب سے بڑا جوہر سادگی ہے۔(۲)

حواشی

۱۔ ہمارے افسانے' ۲۶۶۔

۲۔ ہمارے افسانے' صفحہ ۱۶۵۔۱۶۷۔

ترقی پسند تحریک

۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک جن جن افسانہ نگاروں نے معاشرتی' اخلاقی' اصلاحی' نفسیاتی' فلسفیانہ یا خالص رومانی افسانے لکھ کر شہرت حاصل کی یا اردو افسانے کے ارتقا میں حصہ لیا ان کا مختصر ذکر پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۰ء سے اردو افسانے کی تاریخ میں ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہے' جس کو آگے چل کر ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا ہے۔

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم کے بعد سے دنیا میں ایک عجیب انقلاب رونما ہونے لگا تھا' اور زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ برصغیر میں بھی اس انقلاب کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ زندگی کے ڈھانچے اب خالص معاشرتی رہنے کے بجائے معاشی بنیادوں پر قائم ہونے لگے۔ شہروں میں کارخانوں کی ابتدا اور رفتہ رفتہ ان میں اضافے اور کثرت سے سرمایہ اور محنت کا نیا مسئلہ وجود میں آیا۔ پھر شہری زندگی کے اس صنعتی انداز سے دیہاتی زندگی کے معاشی نظام میں بھی تیزی سے تغیر پیدا ہونے لگا۔ کسان اور مہاجن کے قدیم رشتے میں بھی اب رخنہ پڑنے لگا۔ ملک بھر میں عدم تعاون کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ ہندو' مسلمان اور سکھ سب ایک ہی محاذ پر متحد ہو کر ایک غیر ملکی طاقت کا مقابلہ کرنے لگے۔ غرض ہر طرف ایک عجب ہنگامہ تھا' جو کم ہونے کے بجائے روز بروز تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہر سو بے چینی اور افراتفری کا عالم تھا۔ ۱۹۳۰ء کے عالمگیر معاشی بحران کے بعد سے کشمکش حیات میں اور اضافہ ہوگیا۔

ان تمام حالات سے اردو ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس میں بھی ان باتوں کی رنگ آمیزی ہونے لگی۔ لیکن یہ رنگ آمیزی اردو شاعری میں زیادہ ہونے لگی۔ اردو افسانہ بھی اپنے حوصلے کے مطابق اس نئے رنگ کو اپنے اندر بھرنے لگا۔ اردو افسانوں میں اس طرز عمل کے نمایاں خد و خال ۱۹۳۰ء سے نظر آنے لگے۔ جب کہ چند پرانے افسانہ نگار مثلاً پریم چند' علی عباس حسینی' وغیرہ اپنے افسانوں کے خالص دیہاتی اور معاشرتی پس منظر میں ملک کے معاشی اور سیاسی حالات کا بھی عکس دکھانے لگے۔ پریم چند شروع سے افسانہ نویسی کی قیادت کرتے آ رہے

تھے۔ نئے زمانے میں بھی اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھی۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں اپنا لافانی شاہکار "کفن" لکھ کر ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔ "کفن" فن افسانہ نگاری کی روایت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ "کفن" کا موضوع بھی وہی دیہاتی زندگی ہے' اور اس کا پس منظر بھی دیہاتی معاشرت ہے لیکن اس میں انہوں نے اپنی بے پایاں فنکارانہ صلاحیت سے کام لے کر کچھ ایسا رنگ بھر دیا' جو دوسروں کے لیے شمع راہ کا حکم رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے ایک مخصوص معاشرے' ایک مخصوص معاشی اور سیاسی نظام میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والے دو انسانوں کی زندگی کے داخلی اور خارجی کوائف بیان کئے ہیں۔ اس میں عہد نو کی پکار ہے۔

اردو افسانہ نگاری میں پریم چند کی قیادت "کفن" تک ہی ختم نہیں ہوتی۔ وہ اپنے بڑھاپے میں بھی دوسرے ترقی پسند مصنفین کی ہر طرح ہمت افزائی کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ برصغیر میں ترقی پسندی کی تحریک کو ایک باقاعدہ اور منظم شکل دینے کے لیے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہوئی' تو اس کی صدارت کا فرض پریم چند نے انجام دیا۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں ادب کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

"ہماری کسوٹی پر اب وہ ادب پورا اترے گا' جس میں تفکر ہو' آزادی کا جذبہ ہو' حسن کا جوہر ہو' تعمیر کی روح ہو' زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو' جو ہم میں حرکت' ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے' سلائے نہیں' کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہے۔"(۱)

پریم چند نے اردو افسانے میں ترقی پسندی کا آغاز کر دیا۔ دوسرے بھی ان کے نقش قدم پر گامزن ہونے لگے۔ ترقی پسندی کے نعرے لگانا بہت آسان تھا۔ اس پر عمل کر کے ادب میں کوئی صحیح راہ متعین کرنا نہایت دشوار تھا۔ فنی بصیرت سے کام لے کر اس کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھا۔ یہ پریم چند کا اعجاز تھا کہ انہوں نے زمانے کے نئے رخ کو پہچان کر دوسروں کے لیے افسانے میں ایک مثال قائم کر دی تاکہ نوجوان ادیب اس کی پیروی میں زندگی کی ترجمانی کر سکیں۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جن لوگوں نے افسانے لکھ کر اردو ادب میں اپنا مقام پیدا کیا' ان میں سے بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

حواشی

۱۔ داستان سے افسانے تک' صفحہ ۲۳۲۔

انگارے کے مصنّفین

اس سلسلے میں سب سے پہلے "انگارے" کا ذکر لازمی ہے۔ یہ دس افسانوں کا مجموعہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا' جس کے ایک سال بعد ہی انجمن ترقی پسند مصنّفین کا قیام عمل میں آیا۔ "انگارے" کے افسانوں میں پانچ افسانے سجاد ظہیر کے ہیں' دو رشید جہاں کے' دو احمد علی کے' اور ایک محمود الظفر کا۔ سجاد ظہیر اور احمد علی کے افسانے مغرب کے افسانوں کے اس فن کی مثالیں ہیں' جو لارنس اور جوائس کے اثر سے اردو میں داخل ہوا۔ اس نوع کے افسانوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں پلاٹ اور کردار نہیں ہوتے۔ پھر بھی ان میں اتنی باتیں ہوتی ہیں کہ پلاٹ اور کردار کے افسانوں میں ممکن نہیں۔ ان میں متعدد تصویریں ایک دوسرے میں گھل مل کر پڑھنے والے کے ذہن پر ایک نقش قائم کرتی ہیں۔ ان افسانوں میں بے ربط اور بے سلسلہ بے شمار مناظر پیش کئے گئے ہیں' جن میں غریبی' قوم' حکمت' گل و بلبل کی شاعری' مذہب کی اجارہ داری' دوزخ' جنت' خدا' رسول' لوگوں کے چھوٹے بچے عقیدے--- ارباب نشاط' جنس کی بھوک' موت' آزادی اور خالی پیٹ' غرض ہر اس بات کا ذکر ہے' جس کا تعلق برصغیر کی زندگی سے ہے۔ "انگارے" کے افسانوں میں مغرب کے فن اور مشرق کی زندگی کے چھوٹے بڑے بہت سے اہم مسائل کا فنی امتزاج ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں برصغیر کی مذہبی' سماجی اور سیاسی زندگی اور اس زندگی کی پیدا کی ہوئی عجیب و غریب شخصیتوں اور ذہنیتوں کی تیکھی تصویریں ہیں' جن میں رو رعایت کہیں نہیں ہر جگہ آزادی اور بے باکی خیال ہے۔ اس مصوری میں تلخ طنز اور شدید احساس کی رنگ آمیزی ہے۔ اس تلخ طنز نے کہیں کہیں تمسخر اور جھنجلاہٹ اور بعض جگہ ابتذال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے اردو کے افسانوں میں اتنی وسعت' اتنی صاف گوئی اور بے باکی نہیں ملتی۔ "انگارے" کے مصنّفین نے فنی جسارت سے کام لے کر زندگی کے ان پہلوؤں کو طشت از بام کر دیا ہے' جن کی طرف سے اب تک قصداً اعراض برتا جاتا تھا۔ پردہ داری کے بجائے پردہ دری ان افسانوں کا شیوہ قرار پائی۔ "انگارے"

کے ان افسانوں نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے اردو افسانہ نویسی میں ایک باغیانہ روش کی ایجاد کی۔(۱)

پریم چند کا افسانہ "کفن" اور "انگارے" کے یہ افسانے ترقی پسند ادب میں رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان میں بڑا فرق یہ ہے کہ "ایک نے مستقبل کے افسانے کو ایک سنجیدہ' دھیمی سبک رو لیکن دیرپا بغاوت کی راہ دکھائی' اور دوسرے نے جارحانہ انداز فکر و نظر کو انقلاب کا پیش خیمہ سمجھنے کی روش عام کی۔ ایک میں ایسی گہرائی ہے' جس نے انسانی فطرت کی پوشیدہ تہوں تک رسائی حاصل کی' اور دوسرے کی نظر زندگی کے ہر خارجی پہلو کے رگ و پے کا جائزہ لینے اور اس کے ساتھ عمل جراحی کرنے پر اصرار کرتی ہے۔ فن کے پرستار دونوں ہیں لیکن ایک نے فن کے ماضی کو سامنے رکھ کر اسے زیادہ حسین اور زیادہ بامعنی بنانے کو فن کی خدمت جانا ہے' دوسرے نے ماضی کی روایت کے سارے رشتوں کو کاٹ کر فن کے ایک آزادانہ مسلک کی پیروی اور تلقین کی ہے۔"(۲)

موضوع اور فن کے نقطہ نظر سے "کفن" اور "انگارے" میں جو باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں' انہیں برصغیر میں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی قیام کے بعد سے زیادہ پھلنے اور زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

حواشی

۱۔ داستان سے افسانے تک' صفحہ ۲۲۸-۲۳۱

۲۔ داستان سے افسانے تک' صفحہ ۲۳۱

کرشن چندر

کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا آغاز ایک شدید قسم کی جذباتی رومان پرستی سے ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے "طلسم خیال" میں تخیل کی رنگینی اور رعنائی سے ایک ایسی طلسمی فضا پیدا کی ہے، جس میں گم رہ کر انسان بے قراری اور بے چینی کی خلش سے نا آشنا نظر آتا ہے لیکن رفتہ رفتہ ان میں تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ "نظارے" کے افسانوں میں رومان کے بجائے زندگی کے تلخ حقائق کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان میں رومان بھی ہے لیکن زندگی کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے۔ "ان داتا" میں حقیقت پسندی کا یہ رجحان شراب دو آتشہ بن کر ابھر آیا ہے۔ اس میں رومان پسند کرشن چندر پوری طرح حقیقت پسند اور تلخ نگار بن گئے ہیں۔ ان کے ذہنی، فکری اور جذباتی انقلاب نے ان کے افسانوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ "سفید پھل"، "ٹوٹے ہوئے تارے" اور "ان داتا" اسی قسم کی آتش نگاری کے مظہر ہیں۔(۱) ان کے افسانوں میں حسن، فطرت اور عورت کی رومانی کشمکش کے علاوہ کسان، لگان، نمبردار، رشوت، بیوی بچوں کی ذمہ داری، بڑی فصل، مزدوری کی تلاش اور اس کے لیے دربدر کی ٹھوکریں، سیٹھ، طوائف، فلسفی، کلرک، نام، جگہ مشین گنوں کی تڑاتڑ، بنگال کا قحط، چین کی آزادی، سامراج، فاشیت اور بین الاقوامی دنیا میں معاشی کشمکش اور جدوجہد جیسے مسائل بکھرے پڑے ہیں۔(۲)

کرشن چندر کی ولادت وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ، پنجاب میں ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو ہوئی، اور ان کا انتقال ۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو ہوا۔

حواشی

۱۔ داستان سے افسانے تک، صفحہ ۲۳۲۔

۲۔ داستان سے افسانے تک، صفحہ ۲۳۷۔

راجندر سنگھ بیدی

ترقی پسندی کے زمانے میں راجندر سنگھ بیدی سب سے زیادہ جذباتی افسانہ نگار ہیں۔ اس جذباتیت کی بنا پر انہوں نے اپنے افسانوں کی ابتدا لفاظی اور منظر کشی سے کی ہے۔ ان کے افسانوں کے آغاز میں شعوری طور پر یہ کوشش ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کو حیرت و استعجاب میں ڈالا جائے۔ جمالیاتی ذوق کی آسودگی بھی ان کے فن کا مطمع نظر ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے شروع میں فن کا احساس زیادہ رہتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ وہ احساس کم ہوتا جاتا ہے، اور آخر میں ایک منزل ایسی آتی ہے جہاں وہ فن کے بجائے اپنی کہانی کی عظمت کو سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔(۱)

احمد علی

احمد علی کا ذکر اس سے قبل "انگارے" کے مصنفین کے سلسلے میں ضمنی طور پر آچکا ہے۔ ان کے افسانوں میں بھی فنی ارتقا پایا جاتا ہے "بادل نہیں آتے" اور "مہاوٹوں کی ایک رات" فن افسانہ نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ انہوں نے ان افسانوں میں زندگی اور فن کے گہرے اور قریبی رشتہ کی اہمیت کو محسوس کیا۔ ان کا یہ احساس "شعلے" کے افسانوں میں زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ "شعلے" کے افسانے، جن میں تصویر کے دو رخ اور "استاد شمو خان" خاص کر اہم ہیں جو زندگی اور فن کے رشتے کو مضبوط بناتے ہیں۔ احمد علی کی افسانہ نگاری کی آخری منزل میں زندگی کے حقائق کی نفسیاتی تاویلیں زیادہ ہوئی ہیں۔ یہاں آکر افسانے کے فن کی گرفت ذرا ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ "قید خانے" کے افسانے اس منزل کی نمائندگی کرتے ہیں۔(۲)

اوپندر ناتھ اشک

اشک کے ابتدائی افسانوں میں رومانیت غالب ہے۔ ان میں محض دلچسپی کا خیال زیادہ رکھا گیا ہے لیکن ان کی اس رومانیت میں توازن قائم ہے، اور فن کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ "کونپل" اور "قفس" کے افسانے اس دائرے میں آتے ہیں۔ ترقی پسند دور میں آکر اشک کو

زندگی کے حقائق اور اس کی تفصیلات سب سے زیادہ عزیز ہو جاتی ہیں۔ "چٹان" کے افسانے زندگی کی وسعت، فن کی نزاکت اور فکر کی گہرائی کے حامل ہیں۔(۳)

احمد ندیم قاسمی

دور ترقی کے افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی ایک ممتاز شخصیت رکھتے ہیں۔ شروع میں ان کا رجحان رومان کی طرف تھا، اور تخیل اور تصور سے زیادہ کام لیتے تھے، لیکن بعد میں وہ حقیقت پسندی کی طرف مائل ہوگئے، اور مشاہدے اور تجربے پر زیادہ زور دینے لگے۔ شاعرانہ انداز بیان کو ترک کر کے ایجاز و ایمائیت کی طرف اور خالص جذباتی طرز کو چھوڑ کر فکر کی وسعت اور گہرائی کی طرف زیادہ راجع ہوئے۔ اس سے ان کے فن کی عظمت میں بڑا اضافہ ہوگیا۔(۴)

حواشی

۱۔ داستان سے افسانے تک صفحہ ۲۳۴۔

۲۔ داستان سے افسانے تک، صفحہ ۲۳۴۔

۳۔ داستان سے افسانے تک، صفحہ ۲۳۴۔

۴۔ داستان سے افسانے تک، صفحہ ۱۳۵۔

سعادت حسن منٹو

قدرت کو جب کسی انسان کو نوازنا منظور ہوتا ہے' تو وہ اس میں کوئی خاص ملکہ ودیعت کر دیتی ہے تاکہ دنیا میں وہ اپنے ملکہ کی بدولت کارہائے نمایاں انجام دے سکے۔ سعادت حسن منٹو کو افسانہ نویسی کا ملکہ عطا ہوا۔ انہوں نے اپنی اس خاص صلاحیت سے کام لے کر افسانے کی دنیا میں وہ نیرنگیاں دکھائیں' جن کی مثال نہیں ملتی۔ پریم چند نے جس صنف ادب کا ڈول ڈالا تھا اسے منٹو نے عروج پر پہنچایا۔ منٹو یقیناً ایک بہت بڑا افسانہ نگار ہے۔ انہوں نے افسانہ لکھنا شروع کیا تو افسانوی دنیا میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ برصغیر کا شاید ہی کوئی پڑھا لکھا ایسا ہو' جس نے منٹو کا نام نہ سنا ہو' اور ان کا کوئی افسانہ نہ پڑھا ہو۔

منٹو اپنی حقیقت نگاری' نفسیاتی موشگافی' دوربین و دور رس نگاہ' جرات آمیز اور بے باکانہ حق گوئی' سیاست' معاشرت' اور مذہب کے اجارہ داروں پر تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور چٹخارہ دار فقروں کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے ہیں' لیکن ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر انہوں نے جو مخصوص اور منفرد انداز میں نظر ڈالی ہے' اس کی وجہ سے ان پر لعن طعن بھی کافی کی گئی ہے۔ دنیا کی ہر دوسری چیز کی طرح منٹو بھی نہ محض اچھے ہیں اور نہ محض برے۔ ان کے افسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مظاہر ہیں' اور نہ محض برائیوں کے حامل۔ بلکہ ان میں اچھے اور برے دونوں پہلو موجود ہیں۔(۱)

منٹو نے زندگی کا بڑا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا۔ ان کی دور رس نگاہ اور ہمہ گیر مشاہدہ سے زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھٹا' کلرک' مزدور' طوائف' رند خرابات اور زاہد پاک باز' کشمیر' بمبئی' دہلی' لاہور' فلم اسٹوڈیو' کالج' بازار' گھر' ہوٹل' چائے خانے جنگ آزادی کے نقشے' جیل خانے' مارشل لاء سینوں کو چھیدنے والی برچھیاں اور گولیاں' سیاسی جلسے' جلسوں پر فوجوں کی گولہ باری' گلیوں اور بازاروں میں مسلح فوجوں کا راج' لوگوں کو ایک نئے قانون کی خواہش' بچے' جوان' بوڑھے' عورتیں' مرد اور ان سب کی ذہنی الجھنیں' اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور

اس کے گوناگوں مظاہر منٹو کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ اچھے اور برے سب ہی کچھ ان میں شامل ہیں لیکن منٹو نے جس کا بھی ذکر کیا ہو، جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہو، اس پر بھرپور نظر ڈالی ہے، اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔

ان تمام باتوں کے علاوہ حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا، جس چیز نے انہیں وہ بڑائی عطا کی، جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار ان کا ہمسر نہیں، وہ ان کا فن ہے۔ منٹو نے افسانے کی تکنیک اور اس کے مبادیات اور مطالبات کو بہ حد کمال پورا کیا۔ فنی نقطہ نگاہ سے سب سے پہلے جو بات منٹو کے افسانوں میں پائی جاتی ہے، وہ وحدت تاثر ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ انہیں افسانے کے ذریعے صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اتارنی ہے اور جاگزیں کرنی ہے تاکہ افسانہ پڑھ چکنے کے بعد اس کے دل و دماغ پر ایک واحد تاثر قائم ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے منٹو جو وسیلے اختیار کرتے ہیں، ان میں سے ایک اہم وسیلہ افسانے کی دل کش تمہید ہے۔ تمہید ان الفاظ یا جملوں کو کہتے ہیں، جن سے افسانے کا آغاز کیا جاتا ہے، افسانے کی تمہید فن افسانہ نگاری کی بڑی اہم، بڑی دشوار منزل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے سفر کی ابتدا اگر پوری طرح قدم جما کر ہمواری اور استواری کے ساتھ کی ہے، تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جائے گا، اور قاری اس کا ساتھ دینے لگیں گے۔ منٹو نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ موزوں اور مناسب تمہید کے ذریعے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائیں۔ انہوں نے جتنے افسانے لکھے ہیں، ان کی تمہید میں ایک ایسی دلکشی پائی جاتی ہے کہ قاری اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور پاتا ہے۔

کامیاب افسانے کے لیے جیسے دلکش تمہید بہت اہم ہے، ویسے اس کے انجام کا اچھا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ افسانے کا انجام ایسا فطری ہونا چاہیے، جو اس کے فنی ارتقا کا لازمی نتیجہ ہو۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں اس اہم پہلو کا لحاظ رکھا۔ انھوں نے اس "انجام" سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے، اور افسانے کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔

افسانے کے آغاز اور انجام کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے، ان کی طرف بھی خاص توجہ ضروری ہے۔ ورنہ افسانے کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا لابدی ہے۔ منٹو کو ان مراحل کا پورا احساس ہے، اور بیچ کے تمام مراحل سے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے گزرتے ہیں۔ ان کا افسانہ شروع ہو کر بڑی دھیمی لیکن نپی تلی چال سے بڑے نرم لیکن توانا قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے، اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے، پڑھنے والے کے دل و دماغ پر

ان کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس دھیمی اور جچی تلی رفتار سے وہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے، جہاں قاری ایک طرح کا سکون اور ایک قسم کی مسرت محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ احساس ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے۔(۲)

افسانہ نویسی میں منٹو کی کامیابی کا ایک راز ان کا خاص انداز تحریر ہے۔ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی اس خوبی سے بیان کرتے ہیں، جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے۔ انہوں نے "اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روز مرہ کی بول چال کے جملوں سے، ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے، جو دوسروں کی نظر میں بالکل حقیر اور بے حیثیت ہیں، اور ایسے چلتے ہوئے فقروں سے، جن میں سنجیدگی و متانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور موثر سے موثر بات کہنے کا کام لیا ہے، اور ہر جگہ اس سادگی اور عمومیت کو تصور آفرین، فکر انگیز اور خیال افروز بنایا ہے۔"(۳)

انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں آوردہ نام کو نہیں، بلکہ ایسی آمد ہے، جو ان کی شخصیت کے زور اور ان کے بے لوث خلوص کی مظہر ہے۔ ان کے پورے اسلوب پر یہی بے تکلفی اور بے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔

پلاٹ اور کردار کے ذکر میں منٹو پوری تفصیل سے کام لیتے ہیں اور ایسی جزئیات کا بیان کرتے ہیں، جن سے پلاٹ کی تعمیر اور کردار کی خصوصیات کو نمایاں کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ وہ ہمیشہ پلاٹ یا کردار کے نقوش و تاثرات کی وضاحت کے لیے ایسی جزئیات کا انتخاب کرتے ہیں، جنہیں دوسرے عموماً غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کردیتے ہیں۔ یہی ساری باتیں ہیں، جو مل جل کر منٹو کے حق میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں۔ اور انفرادیت اور عظمت بھی۔ لیکن ان میں اگر اسکینڈل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی اور وہ اگر پڑھنے والوں میں کبھی کبھی ایک ہنگامہ اور گرما گرمی پیدا کر دینے کے لیے چونکا دینے والی باتیں کہنے اور لکھنے پر اصرار نہ کرتے اور جنسی جذبات کا حد سے بڑھ کر تجزیہ کرنے کی کوشش نہ کرتے، تو وہ یقیناً اس سے بھی بڑھ کر بڑے فن کار ہوتے۔

سچی کہانیاں

افسانے پر بحث کے سلسلے میں ایک انوکھی چیز کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ وہ ہے' "سچی کہانی" یا "سچی کہانیاں"۔ اسے افسانے کی ایک قسم سمجھ لیجئے یا اور کچھ۔ مگر افسانوی ادب میں ہے یہ اس کی انوکھی بات اور نرالی چیز' اور اسے بھی اتفاق ہی کہہ لیجئے' کہ اردو میں اس کا موجد اور خاتم بھی ایک ہی شخص ہے۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز تاریخی طور پر ۱۹۳۶ء میں ہوا' گو کہ اس کے اثرات اس سے بھی کئی سال ادھر سے نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے۔ "سچی کہانیوں" کا سلسلہ بھی اسی زمانے کے لگ بھگ شروع ہوا' اور کافی عرصے تک چلتا رہا۔ لیکن "سچی کہانیوں" کا ترقی پسند تحریک سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ بالکل الگ اور جداگانہ مکتب خیال ہے۔ اس کے موجد اور بانی ڈاکٹر عندلیب شادانی ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی

ڈاکٹر عندلیب شادانی کوئی ۳۵ سال تک ڈھاکا یونیورسٹی میں اردو اور فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہ چکے' اور انہوں نے علم و ادب کی خاموشی کے ساتھ خدمت کی۔ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں : لیکن پیشہ ور نہیں۔ ان کی شاعری کا ذکر ہم حصہ نظم میں کریں گے۔ وہ ایک اچھے محقق اور نقاد بھی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتابیں "تحقیقات"' "دور حاضر کی غزل گوئی" اور متفرق تحقیقی اور تنقیدی مضامین ایک خاص انداز و نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ لیکن ہمیں یہاں صرف ان افسانوں سے بحث ہے' جنہیں ان کی جدت پسند طبع نے "سچی کہانیاں" نام دیا ہے۔

سچی کہانیوں کا سلسلہ انہوں نے ۱۹۳۴ء سے شروع کیا۔ یہ افسانے پہلے دہلی سے شاہد احمد دہلوی کے مشہور رسالے "ساقی" میں چھپتے رہے۔ جس میں انہوں نے اپنا اصلی نام نہیں چھپوایا' ان کے بلکہ سارے افسانے پریم پجاری کے فرضی نام سے شائع ہوتے رہے۔ یہ افسانے اتنے دلچسپ ثابت ہوئے کہ لوگوں نے انہیں بہت پسند کیا۔ مگر پریشان تھے کہ یہ پریم پجاری آخر کون ہے؟ عندلیب شادانی سے تو لوگ واقف تھے' لیکن پریم پجاری کے نام سے کوئی واقف نہ تھا۔

ایک عرصے کے بعد جب وہ راز کھلا تو ارباب ذوق ایک دوسرے سے ہنس کر کہتے: "ارے بھئی' یہ پریم پجاری تو ڈاکٹر عندلیب شادانی نکلے' ہمارے پرانے دوست- یہ تو سچ مچ پریم اور محبت کے پجاری ہیں- اس لیے کہ زندگی کے راز اس کے سچے پجاری پر ہی کھلتے ہیں-"

سچی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سچی کہانیاں" کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا- دوسرے اور تیسرے مجموعے علی الترتیب "نوش و نیش" اور "چھوٹا خدا" کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئے- پہلے میں پندرہ مختصر افسانے ہیں' دوسرے میں تیرہ اور تیسرے میں دو طویل مختصر افسانے ہیں- ایک "چھوٹا خدا" اور دوسرا "بے روزگار" ڈراما کی شکل میں-

یورپ میں سچی کہانیوں کا بڑا رواج ہے- چنانچہ وہاں متعدد ماہنامے صرف سچی کہانیوں کے لیے وقف ہیں' اور بعض رسالے ایسے بھی ہیں' جن کے ہر نمبر میں دوسرے مضامین کے علاوہ عام دلچسپی کی بنا پر ایک سچی کہانی بھی ضرور شامل ہوتی ہے- یہ سچی کہانیاں معقول معاوضے دے کر حاصل کی جاتی ہیں- ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنے انگلستان کے دوران قیام میں اس قسم کی کہانیوں کا مطالعہ کیا اور انہیں بے حد دلچسپ اور سبق آموز پایا- چنانچہ انگلستان سے واپس آکر انہوں نے اردو میں اس قسم کی کہانیاں لکھنی شروع کیں' جو بہت مقبول ہوئیں-

"سچی کہانیوں" سے ان کا مطلب وہ سچے اور حقیقی واقعات ہیں' جو ہماری زندگی میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں' اور جن کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہو' اور ساتھ ساتھ سبق آموز اور عبرت خیز بھی ہو- موجودہ زمانے میں' جب کہ افسانوی ادب میں' جس میں رومان کا عنصر غالب ہونا چاہئے' حقیقت اور واقعیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے' اور یہ کہا جاتا ہے کہ "افسانہ نگار کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ افسانے کو حقیقت بنا دے" ان سچی کہانیوں کی بڑی قدر ہونی چاہیے- افسانوں کو آج کل جہاں زندگی سے زیادہ قریب لانے کی کوشش کی جا رہی ہے' وہاں یہ "سچی کہانیاں" عین زندگی ہیں- اس لحاظ سے ان کا رتبہ افسانے سے بڑھ کر ہے- یوں تو کوئی بھی ادب' خواہ وہ افسانہ ہو یا اور کوئی صنف' زندگی سے علیحدہ کوئی شے نہیں ہو سکتا' بلکہ سب میں زندگی کا عکس ہوتا ہے' اور حیات کا کوئی نہ کوئی پہلو اس میں اجاگر ہوتا ہے- اس لیے کہ یہ نفسیاتی اصول ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی تخیل کے پر لگا کر پرواز کرنا چاہے' اپنے تجربے اور مشاہدے سے باہر نہیں جا سکتا- تجربہ اور مشاہدہ میں وہ سب کچھ آ جاتا ہے' جس کو اس نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہو' کان سے سنا ہو یا کسی اور ذریعے سے اسے معلوم ہوا ہو- لیکن تخیل کے زور سے جو واقعہ تیار کیا جاتا ہے' اس میں اور اس واقعہ میں جو امر واقعہ میں واقع ہو' زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے- اس لیے بعض صورتوں میں سچے واقعات میں جو دلچسپی پائی جاتی ہے' وہ کسی کی دماغی اپج سے

تخلیق کردہ واقعہ میں نہیں پائی جاتی- یہی فرق عام انسانوں میں اور سچی کہانیوں میں ہے-

جہاں تک افسانے کے فن اور تیکنیک کا تعلق ہے' سچی کہانیاں اس سے بے نیاز ہیں- "سچی کہانیاں" جو سچے اور حقیقی واقعات کا دوسرا نام ہیں' وہ فنی قواعد و ضوابط کی پابند نہیں ہو سکتیں-(۱) سچی کہانیاں اسی لیے "سچی کہانیاں" ہیں کہ ان میں آرائش و زیبائش' تصنع و تکلف اور فنی داؤ پیچ نہیں ہیں- فن کی پابندی صرف اس جگہ ہونی چاہئے' جہاں فنکار اپنی شعوری کوشش اور تخیل کے زور سے کام لیتا ہو- تاہم سچی کہانیوں میں فن کے بعض اہم مطالبات پورے ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں- پلاٹ کا وجود (تعمیر نہیں اس لیے کہ تعمیر تخلیقی افسانوں کے لیے کہی جاتی ہے)' کردار کا فطری ارتقا' جستہ جستہ واقعات کی ترتیب' وحدت تاثر' ذرا رومانوی آغاز اور المیہ یا طربیہ انجام اور سب سے بڑھ کر کہانی کی دلچسپی' یہ سب کچھ ایک ایک کر کے سچی کہانیوں میں موجود ہیں-

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی جدت پسند طبیعت نے اردو میں سچی کہانیاں لکھ کر اپنے لیے ایک الگ شاہراہ قائم کی ہے' جس پر سوائے ان کے اور کوئی آج تک گامزن نہ ہو سکا- اس قسم کے افسانے لکھنے کے لیے جو اخلاقی جرات چاہیے' وہ شاید بہتوں میں نہیں ہے- اس لیے پریم پجاری اس میدان میں انفرادی حیثیت کے مالک ہیں-

شام بارکپوری(۲)

شام بارکپوری کھلنا' بنگلہ دیش کے رہنے والے ہیں- انہوں نے بہت سے طبع زاد اردو افسانے سپرد قلم کیے ہیں' جو برصغیر کے معیاری اردو پرچوں میں شائع ہوئے- وہ سب افسانے گذشتہ چند سالوں میں مجموعے کی شکل میں مندرجہ ذیل ناموں سے نکلے:

"پدما کی موجیں" ستمبر ۱۹۷۹ء

"میگھنا کی لہریں" ستمبر ۱۹۸۰ء

"جمنا کے دھارے" مئی ۱۹۸۴ء

انہوں نے "کرشنا چوڑا کے سایہ میں" کے نام سے اپنا ایک مایہ ناز ناول بھی پیش کیا- لیکن ان پر ہم اپنی بحث یہاں تک افسانہ نگار کی حیثیت سے محدود رکھیں گے-

شام بارکپوری کا اولین مجموعہ: "پدما کی موجیں" میں کل ۱۹ افسانے ہیں' جو بقول خالق: ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک کے عرصے میں لکھے گئے- ان افسانو میں: "پدما کے کنارے" بنگلہ دیش کے ایک غریب کسان کی نہایت المناک داستان حیات ہے' جسے افسانہ نگار نے نہایت خوبصورت اور موثر انداز میں پیش کیا ہے' بالخصوص ان کی جزئیات نگاری نے کہانی کو اور زیادہ جاذب توجہ بنا

دیا ہے۔ "سانپ اور انسان" ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، درندگی اور بربریت میں بعض اوقات سانپ سے بھی بدتر ہے۔ "منزل" بھی ایک عمدہ افسانہ ہے۔ افسانہ "روح" کو ان کا شاہکار کہا جائے تو غلو نہ ہوگا۔ اس میں انسانیت کے بہت سے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شام بارکپوری کے دوسرے مجموعے "میگھنا کی لہریں" میں بھی تقریباً اتنے ہی افسانے ہیں، جو ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ ان میں "شکار" ایک ایسا افسانہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ "گڑیا" ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ ایک بانجھ عورت کو گڑیا سے کیوں بے پناہ محبت تھی۔ اس کے پڑھنے سے افسانہ نگار کی فنکارانہ چابک دستی کی داد دینی پڑتی ہے۔ "زندگی کے گھاؤ" میں جیتی جاگتی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔

"جمنا کے دھارے" میں ۱۶ افسانے ہیں۔ ان میں "اجنبی جزیرے کا مسافر" میں ذلت و پستی میں محصور انسان کی المناک داستان بیان کی گئی ہے۔ اسے بھی اوروں کی طرح اس بھرے سنسار میں جینے کا حق ہے۔ ایک لحاظ سے یہ افسانے پوری دنیا کے تارک وطن انسانوں کی دردناک زندگی کے ترجمان ہیں۔ "آٹھ کروڑ کا زخم" پوری ایک قوم کی کہانی ہے، جس نے اپنے ہی پیدا کردہ مسائل میں گھر کر اپنی زندگی اجیرن کر لی۔ "بادبان"، "سانپ" اور "باغبان" علامتی طور پر ہم شبیہ معلوم ہوتے ہیں، جو کبھی ہمارے آس پاس تھے، مگر آج انہوں نے دنیا سے اپنا منہ موڑ لیا ہے۔ "بے زبانوں کی زبان" بنگلہ دیش کے کیمپوں میں محصور بہاریوں کی کہانی ہے۔ "بسیرا" سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہے۔ جب غاصب کسی جائیداد یا مکان کو ہتھیاتا ہے، تو اللہ کا قہر کیسے نازل ہوتا ہے۔ "مکان" میں اس کی مثال موجود ہے۔ "جل تھل جمنا"، "بھیگے ہاتھ" "اکٹوپس" اور "سناٹے کی چیخ" میں متحرک زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر آتا ہے۔ "توپ" خود کلامی کی ایسی مثال ہے، جس میں بنگلہ دیش کی پوری تاریخ نمایاں ہے۔ "آبلہ" میں برصغیر کے اس المیہ کا بیان ہے، جس میں تینوں ممالک منسلک رہ چکے ہیں۔ اس میں اس سچائی کی عکاسی کی گئی ہے کہ جو دوسروں کے لیے گڑھے کھودتا ہے، آخر وہ خود اس میں گرتا ہے۔

حواشی

۱- "سچی کہانیوں" کے مصنف نے بھی اپنے دیباچے میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ انہوں نے افسانہ نگاری کے فن کی پابندی اپنے اوپر عائد نہیں کی ہے۔ انہوں نے صرف ان واقعات کو بے کم و کاست اپنے الفاظ اور اپنے انداز میں بیان کر دیا ہے' جو انہوں نے اپنی آنکھ سے دیکھے' کان سے سنے اور شاید بعض صورتوں میں ان کے اپنے اوپر گزرے۔

۲- ماخوذ از مضمون: "بنگلہ دیش کی اردو افسانہ نگار" از مولف' مطبوعہ اردو انٹرنیشنل' ٹورنٹو' کینیڈا' جلد ۵' جنوری۔ اپریل' ۱۹۸۶ء' شمارہ ۱۔

تبصرہ

اردو افسانے کا رواج، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہوا اور پریم چند پہلے افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے ناول کے بعد اس نئی صنف ادب پر طبع آزمائی کی، اور چند سال کے اندر ہی اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔ افسانہ، جسے انگریزی میں "لائٹ لٹریچر" بھی کہتے ہیں، وقت اور ضرورت کی پیداوار ہے۔ انیسویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک دنیا میں جو بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے، ان سے انسانی زندگی کی بالکل کایا پلٹ ہو گئی۔ صدیوں پرانا جاگیردارانہ نظام درہم برہم ہونے لگا، اور زندگی کی قدریں یکایک بدل گئیں۔ گو کہ ماضی کی روایات سے اس کا رشتہ یکسر نہیں ٹوٹا، لیکن اس کی گرفت ضرور ڈھیلی ہو گئی۔ زندگی میں یہ تبدیلیاں پہلے مغرب میں پیش آئیں، اس کے بعد رفتہ رفتہ مشرق پر بھی چھا گئیں۔ اب کا انسان بہت مصروف رہنے لگا۔ تھکن سے چور چور وہ تھوڑی دیر کے لیے گھر آتا ہے، رات کا تھوڑا سا وقت گذار کر پھر وہ مشینی دنیا کی طرف بھاگتا ہے۔ زندگی کی ہماہمی میں حصہ لیے بغیر چارہ نہیں۔

ان حالات میں اسے ہر چیز اور ہر بات میں اختصار سے کام لینا پڑا۔ اب سب کے پاس صرف ایک ہی بات رہ گئی: "میرے پاس وقت نہیں۔" اس لیے ادب میں بھی کسی ایسی مختصر چیز کی تلاش ہوئی، جس کے لکھنے اور پڑھنے میں بھی کم وقت لگے، اور تھوڑی سی تفریح کا سامان بھی اس میں موجود ہو، تاکہ ذرا دیر کے لیے زندگی کی گوناگوں مصروفیات اور پریشانیوں سے فرار کی راہ ملے۔ مختصر افسانہ ان ہی حالات کی پیداوار ہے۔ اس میں ادیب کو بھی سہولت ہو گئی، اور ادب نواز کو بھی۔ ایک کو لکھنے میں وقت کم لگتا ہے، تو دوسرے کو پڑھنے میں۔ اس طرح مختصر افسانہ بڑے فائدے کی چیز ثابت ہوا۔

اردو افسانے کی عمر بہت کم ہے۔ کسی بھی صنف ادب کو ترقی کے تمام مراحل طے کرنے کے لیے یہ وقت بہت قلیل ہے۔ لیکن اردو افسانے نے گزشتہ برسوں میں جو ترقی کر لی، وہ توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ اس عرصے میں سادہ اور سپاٹ افسانے سے لے کر پیچیدہ سے پیچیدہ افسانے بھی لکھے گئے۔ فن کے لحاظ سے خام افسانے بھی وجود میں آئے اور نہایت پختہ اور کامل بھی۔

اس زمانے میں سینکڑوں افسانہ نگاروں نے ہزاروں افسانے لکھے اور نفس افسانہ اور اس کے فن کی داد دیتے رہے۔ لیکن اس میں پڑھنے والوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ تمام چیزوں سے بڑھ کر لوگ افسانہ پڑھنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ چونکہ اس میں عام زندگی کی عکاسی ہوتی ہے' اور ٹھوس مسائل کی بجائے عام دلچسپی کی باتیں ہوتی ہیں' اور سب سے بڑھ کر اس میں عشق و محبت کا عنصر شامل ہوتا ہے' اس لیے سب اسے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ آج کل جو بے شمار اردو کے رسائل اور اخبار نکلتے ہیں' ان کی زیب و زینت بھی افسانے سے ہے۔ کوئی رسالہ یا اخبار (بجز چند) اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا' جب تک کہ اس میں ایک دو افسانے شامل نہ ہوں۔ یہ رویہ عوام کے افسانے سے غیر معمولی دلچسپی کے پیش نظر اختیار کیا جاتا ہے۔ افسانے کے خریدار اور افسانے کے پڑھنے والے زیادہ تر عوام ہیں۔ اس لیے ان کی خواہشات کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں لیلیٰ مجنون کی داستان' جو اپنی ہی محبت کی کہانی سے ملتی جلتی ہے' اور اپنی ہی زندگی کے دکھ درد کے افسانے ہوتے ہیں' دیکھنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے' یہ چیز جتنی افسانے میں ہوتی ہے' اور کسی صنف ادب میں نہیں ہوتی۔

اردو افسانے میں اول اول تو اصلاحی اغراض و مقاصد زیادہ شامل ہوتے تھے' اور پریم چند اور ان کے ساتھیوں نے شروع شروع میں جو کچھ لکھا' خواہ وہ دیہات کی زندگی ہو یا شہر کی' خواہ معاشرہ کی عکاسی ہو یا کسی خاص طبقہ انسان کی' اس میں کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد ضرور پنہاں ہوتا تھا لیکن ۱۹۳۶ء میں جبکہ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا' اس چیز کی اہمیت ذرا کم ہو گئی۔ اب حقیقت اور واقعیت پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس دور میں یہ آواز اٹھائی گئی کہ حقیقت پسندی اور واقعیت نگاری کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی جس طرح ہے' افسانے میں اس کا ہوبہو نقشہ کھینچا جائے۔ اس میں کمی بیشی نہیں کرنی چاہئے اس حقیقت پسندی اور واقعیت نگاری کے پیش نظر بعض افسانہ نگار نے یہ کیا کہ زندگی کو مادرزاد ننگا کر کے دکھا دیا۔ اس سے افسانوی ادب میں عریانیت راہ پا گئی۔ یہ فن کا المیہ تھا' جو بدقسمتی سے ترقی پسندی کے صحیح نقطہ نظر کی غلط تعبیر سے واقع ہوا۔ اس قسم کے افسانے چھپا چھپا کے لکھے جاتے ہیں' چھپا چھپا کے بیچے جاتے ہیں' اور چھپا چھپا کے پڑھے جاتے ہیں' ان کے پڑھنے والے عموماً نوخیز لڑکے لڑکیاں ہیں۔ بڑی عمر کے سنجیدہ لوگ ان کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ قریب قریب اسی زمانے میں جب کہ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا' افسانوں کا ایک سلسلہ "سچی کہانیاں" کے نام سے بھی چلا' جو لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔ یہ سلسلہ بہرحال' ترقی پسندی کی بے راہ رویوں سے بدرجہا بہتر تھا۔

تاریخ ادبیاتِ اُردُو

حصّہ اوّل

اُردُو نثر

ڈاکٹر ابُوسعید نورُالدّین

مغربی پاکستان اُردُو اکیڈمی، لاہور